قائداعظم

زندگی کے دلچسپ اور سچے واقعات

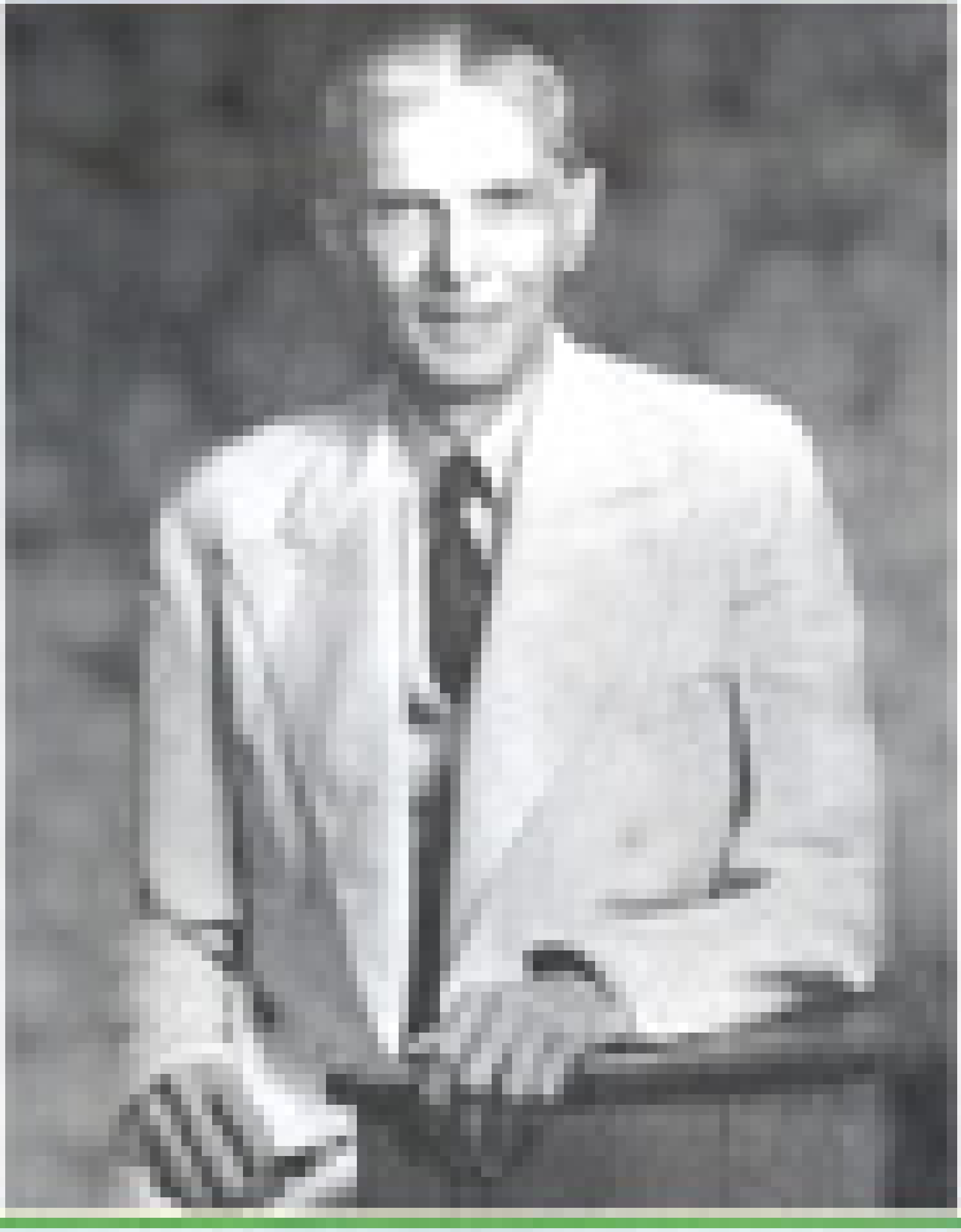

ضیاء شاہد

visit http://quraniscience.com/ to read scientific Facts in Quran

قائداعظمؒ

زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات

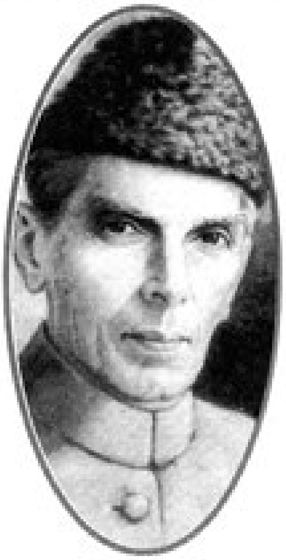

ضیا شاہد

قائد فاؤنڈیشن

لاہور — کراچی — اسلام آباد

حرف آغاز

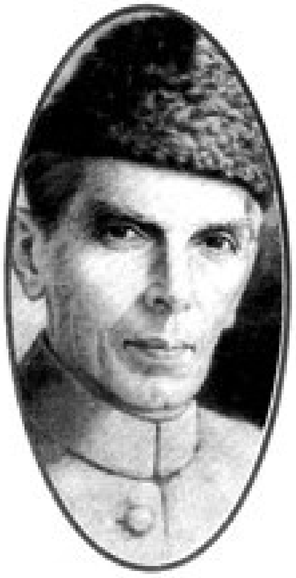

محترم قارئین!

زیر نظر کتاب "قائداعظم۔زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات" پیش خدمت ہے۔ چند سال پہلے میں نے پی ٹی وی ورلڈ کے پروگرام " کسان ٹائم " میں، جسے میری بیٹی ڈاکٹر نوشین عمران تیار کرواتی ہیں، قائداعظم کے سال کی مناسبت سے روزانہ 5 منٹ میں ایک واقعہ ریکارڈ کروانا شروع کیا۔ طریق کار کچھ یوں تھا کہ میں بہت سی کتابیں، رسالے اور اخباروں میں چھپے ہوئے مضمون کھنگالتا اور کچھ قسطیں کمپوز کروالیتا۔ پھر پروگرام ریکارڈ کرواتے وقت لکھا ہوا واقعہ سامنے رکھ لیتا اور بولتا چلا جاتا۔ سال بھر یہ سلسلہ جاری رہا اور آخر میں جب میں نے یہ سارے مسودے دیکھے تو احساس ہوا کہ خاصے دلچسپ واقعات جمع ہو گئے ہیں، مناسب ہو گا اگر انہیں کچھ کاٹ چھانٹ کے بعد کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے۔

میں برادرم سہیل ظفر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اسے ترتیب دینے میں مدد کی اور عبدالجبار صاحب اور یونس عزیز ملک صاحب کا بھی کہ انہوں نے کمپوزنگ سے طباعت تک کتاب کی تیاری کے باقی مراحل کی خاطر وقت نکالا۔ ہلکے پھلکے انداز میں قائداعظم کی زندگی کے بہت دلچسپ اور فکر انگیز پہلو آپ کے سامنے ہیں بانیٔ پاکستان کی سوچ اور عمل دونوں آج کے پاکستان کو صحیح معنوں میں مضبوط، مستحکم، جمہوری، مثالی اور خوشحال پاکستان بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ضیا شاہد

چیف ایگزیکٹو خبریں گروپ آف نیوز پیپرز

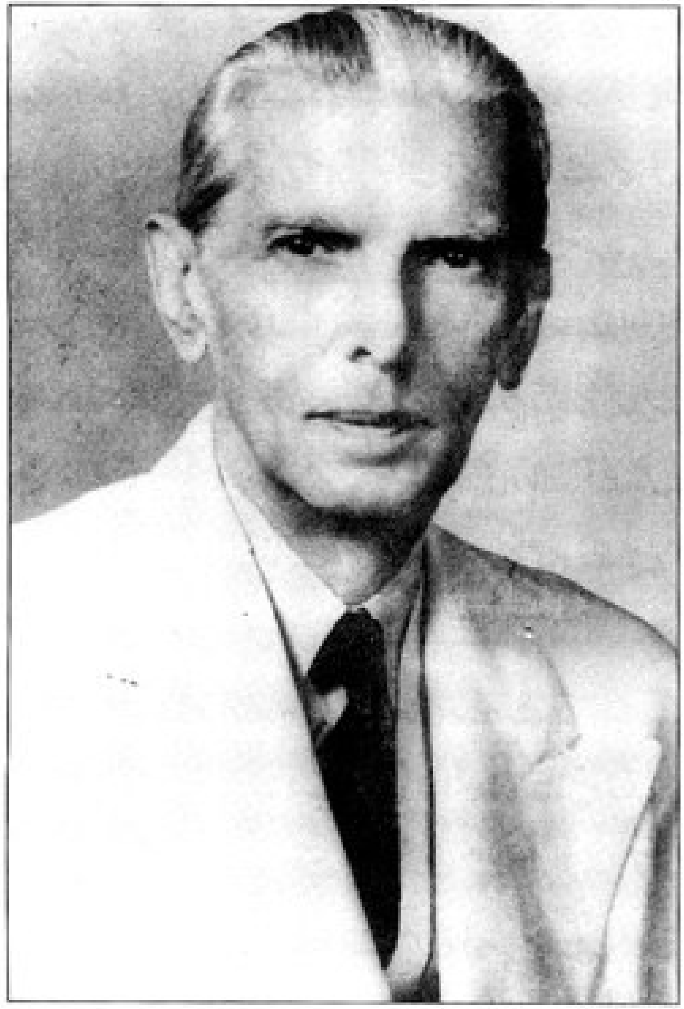
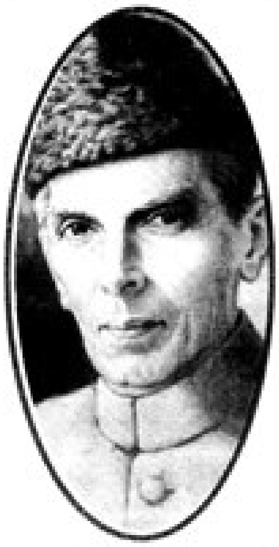

فہرست

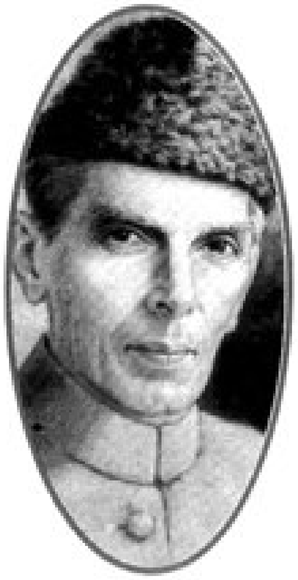

1- یادیں ان کی، باتیں ان کی 1
2- کچھ دلچسپ باتیں 5
3- تقریر نہیں کام 9
4- سچا اور کھرا انسان 13
5- پیشہ ورانہ دیانت 17
6- ناقابل خرید 21
7- پیدائش، عقیقہ اور خاندان 25
8- انوکھا دولہا، ذہن طالب علم 29
9- جمہوری ذہن کی درخشاں مثال 33
10- شادی کیسے ہوئی؟ 37
11- قائداعظم کا دورہ کشمیر-1 41
12- قائداعظم کا دورہ کشمیر-2 45
13- قائداعظم کا دورہ کشمیر-3 49
14- قائداعظم کا دورہ کشمیر-4 53
15- قائداعظم کا دورہ کشمیر-5 57
16- قائداعظم کا دورہ کشمیر-6 61
17- قائداعظم کا دورہ کشمیر-7 65
18- مسئلہ کشمیر اصل صورتحال 69
19- رتی جناح کی حاضر جوابی 73
20- رتی کی بیماری 77
21- محبت اور فرض 81
22- خوددار اور خوداعتماد جناح 85
23- بطور وکیل چند یادیں 89
24- اچھا وکیل اور اچھا انسان 93
25- آزادی کا پیغام 97
26- ظاہرداری سے نفرت 101
27- آزادی کیلئے تڑپ 105
28- مفتی اعظم فلسطین کا خط 109
29- اقلیتوں سے رواداری 113
30- قائد اور خواتین 117
31- ایک دلچسپ ملاقات 121
32- 23 مارچ کی یادیں 125
33- قرارداد پاکستان کا دن 129
34- قائداعظم اور طلبہ 133

35- قائد عالمی دانشوروں کی نظر میں 137
36- دیگر اقوام کا قائد پر اعتماد 141
37- پہلی کامیابی 145
38- انصاف پسندی 149
39- آزادی اظہار کے چیمپئن 153
40- اصولوں کی چٹان 157
41- کسی کا حق نہ چھینو 161
42- پاکستان آپ کے ہاتھ میں ہے 165
43- ایک لیڈر' ایک انسان 167
44- میرٹ' میرٹ اور میرٹ 171
45- کوئی اسے خرید نہ سکا 175
46- ایک خط ڈاکٹر کے نام 179
47- کھلاڑی جو فاؤل نہیں کھیلتا تھا 183
48- محنتی نوجوان' خوددار وکیل 187
49- مایوسی اور انگلستان کو واپسی 191
50- قومی خیالات کا ترجمان 195
51- قائد کے ذاتی خطوط 199
52- خطاب یا اعزاز نہیں چاہیے 203
53- کارکنوں سے محبت 207
54- نوجوانوں کے ہیرو 211

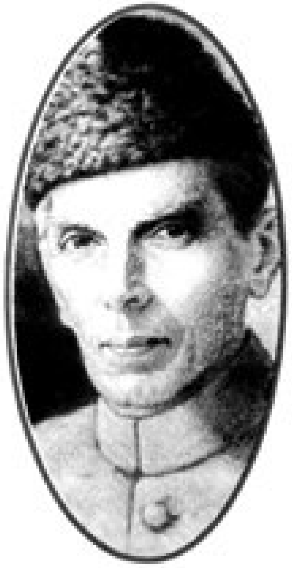

55- بے لوث اور بے خوف 215
56- ایک خدا' ایک دین' ایک رسولؐ 219
57- ہندو الگ' مسلم الگ 223
58- اپنا کام کریں اور بس 227
59- کے ایچ خورشید کی یادداشتیں 231
60- فرقہ پرستی کے خلاف 235
61- پاکستان مذہبی رواداری کی ضرورت 239
62- مسلم لیگ کے اندر جمہوریت 243
63- گاندھی اور نہرو سے سینئر 247
64- بیماری اور تھکاوٹ کے باوجود 251
65- انگریز تو پاکستان کا مخالف تھا 255
66- دو الگ قومیں 259
67- بڑا آدمی........ عظیم شخصیت 263
68- قائد کی ذاتی باتیں 267
69- عوام کا جرنیل 271
70- مصطفیٰ کمال اور لینن سے عظیم 275
71- آئین پرست نہیں باغی 279
72- دہلی کا آخری دیدار 285
73- پاکستان کی طرف پہلا سفر 289
74- کام چوروں سے نفرت 293

75- اسمبلی میں پہلی تقریر 297
76- ایک کام ختم ہوا 301
77- بناوٹ سے نفرت 303
78- مشرقی پاکستان کی فکر 307
79- ایک آزاد قوم کا سربراہ 311
80- عزم وہمت کی چٹان 315
81- وقت کی پابندی 319
82- ذکر پرچم کی تیاری کا 323
83- بیماری کے باوجود 327
84- گاڑی میں بیماری کا حملہ 331
85- جسم وجاں کی بازی 335
86- خوشامد سے نفرت اور انسان دوستی 339
87- ترقی میں عورتوں کا کردار 343
88- شام زندگی 347
89- ایک عالی ظرف 351
90- رشوت سے نفرت 355
91- نوجوانوں کی امید 359
92- ماتحت عملے کی یادیں 363
93- معاشی نظام پر تقریر 367
94- ڈاکٹر سے سوال وجواب 371
95- کفایت شعاری کی نصیحت 375
96- بیماری کی تشخیص 379
97- سٹریچر سے نفرت 383
98- آخری الفاظ۔۔ کشمیر کشمیر 387
99- اور ایمبولینس خراب ہوگئی 391
100- پہلی ملاقات اور قائد کا دکھ 395
101- اندر کا دکھ 399
102- اعتماد کا شہنشاہ 403
103- بے خوف انسان 407
104- ایک بڑا آدمی 411
105- اور عینک گر پڑی 415
106- آخری فائل پر دستخط 419
107- قائد ملت کا خراج تحسین 423
108- قائد کا خواب 427
109- قائد کی زندگی کا مختصر نقشہ 431
110- عوامی زندگی کا آغاز 435
111- کچھ اور واقعات 439
112- دولت گئی، کچھ بھی نہ گیا 443
113- مسلم لیگ کا آخری اجلاس 447
114- آزادی کے بعد پہلا پیغام 451

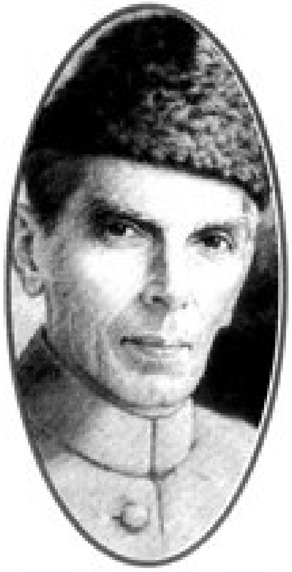

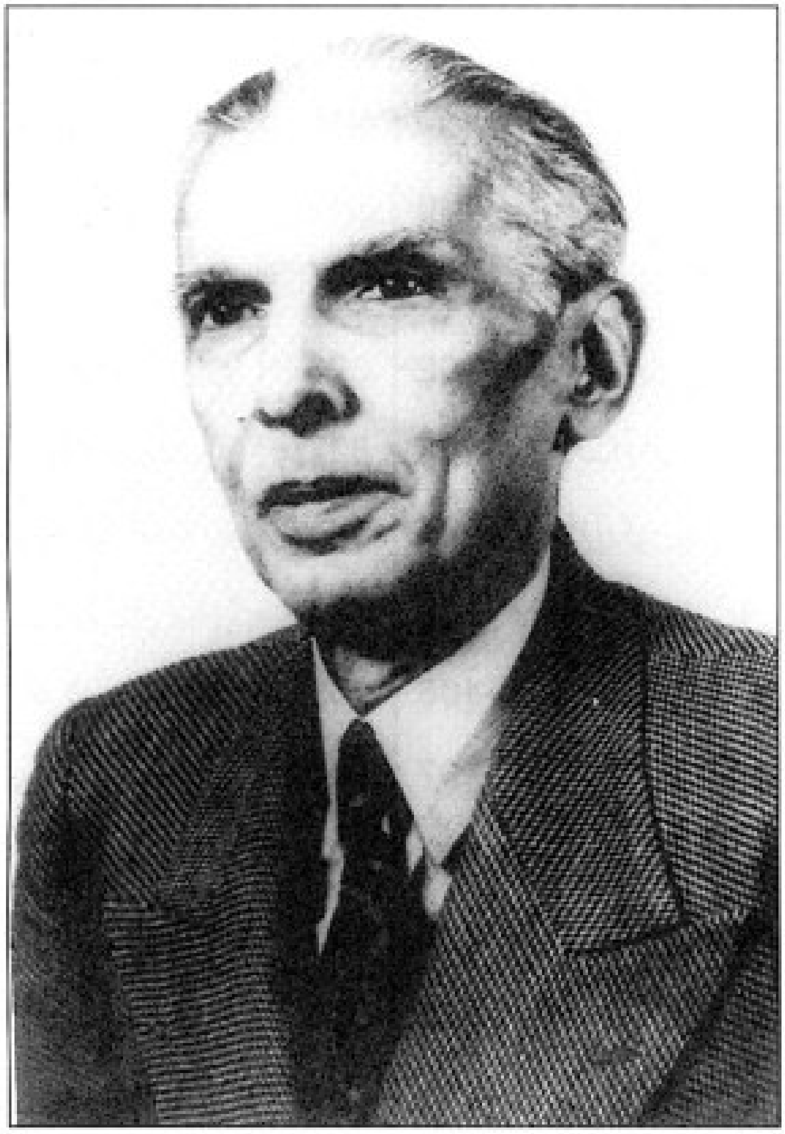
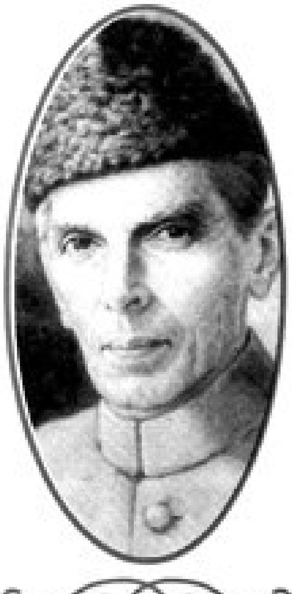

visit http://urdulibrary.paigham.net/ for all type of books

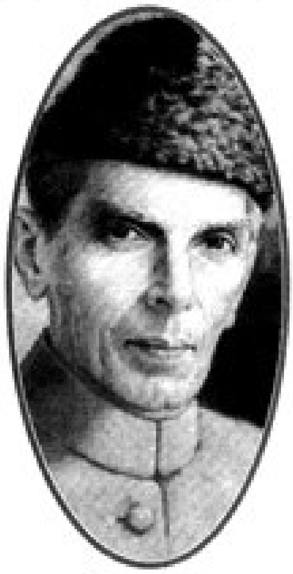

یادیں ان کی' باتیں ان کی

قائداعظم کی یادیں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہی یادوں کو شمار کرنے کے لیے نوابزادہ محمود علی خاں کی کتاب "عظیم قائد" میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کے مصنف جوانی میں قائد سے ملے اور ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ تحریکِ پاکستان میں بطور ورکر حصہ لینے والے محمود علی خاں نے جذباتی انداز میں اپنے محبوب لیڈر کے بارے میں ذاتی معلومات جمع کی ہیں جو اس قابل ہیں کہ نئی نسل کے سامنے لائی جائیں کیونکہ جس شخصیت سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے' اس کے بارے میں ایسی ذاتی معلومات ہمیشہ شوق سے سنی اور بیان کی جاتی ہیں۔ محمود علی خاں لکھتے ہیں:

"قائداعظم کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات حسب ذیل ہیں۔

تاریخ پیدائش: 25 دسمبر 1876ء بروز پیر' بمطابق 8 ذوالحجہ 1293ھ۔

مقام پیدائش: وزیر مینشن نیو نہم روڈ کھارادر' کراچی۔

نام: خاندانی روایات کے مطابق ان کے ماموں جناب قاسم موسیٰ نے محمد علی رکھا' والد

کے نام کی رعایت سے محمد علی جناح بھائی ہو گیا۔ بیرسٹری کی سند لینے سے پہلے لندن میں قائداعظم نے بھائی کا لفظ حذف کرا دیا اور صرف محمد علی جناح رہنے دیا۔ ویسے جناح کے لغوی معنی قوت بازو کے ہیں۔

قائد کی والدہ دراز قد اور خوبصورت خاتون تھیں' یہ درست نہیں کہ ان کا نام مٹھی بائی تھا کیونکہ ان کا اصل نام شیریں بائی تھا اور انہیں پیار میں مٹھی بائی کہتے تھے۔ ان کے جد امجد ایرانی امراء میں سے تھے جو آغا خان اول کے ساتھ ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے تھے۔

قائد کے بچپن کے دوستوں میں سے صرف نانجی جعفر کا نام ریکارڈ پر ہے۔

قائداعظم کا حلیہ کچھ یوں تھا' قد 5 فٹ ساڑھے 11 انچ' رنگ گورا' آنکھیں گہری بھوری' دائیں گال پر تل۔

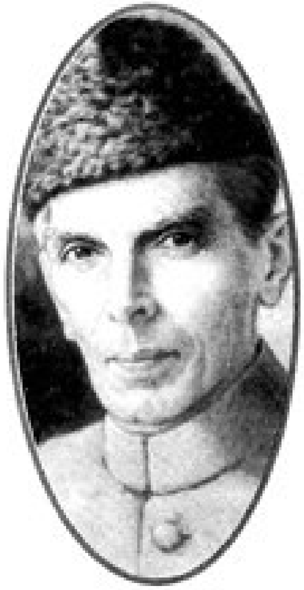

جناب محمود علی خاں نے قائد کی پسند و ناپسند کا چارٹ بھی دیا ہے' جو حسب ذیل ہے۔

سگریٹ کریون اے' پسند تھا۔

کھیل میں کرکٹ' بلیئرڈ اور شطرنج کے شوقین تھے۔

پھولوں میں گلاب اور کارنیشن پسند تھے۔

پسندیدہ درخت صنوبر تھا۔

پسندیدہ ڈرامہ نگار و شاعر شیکسپیئر اور شیلے تھے۔

لباس میں قائد بہت جامہ زیب شخصیت کے مالک تھے۔ ہر لباس ان پر جچتا تھا۔ زیادہ تر انگریزی لباس استعمال کیا۔

1937ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں پہلی مرتبہ چوڑی دار پاجامہ' شیروانی اور قراقلی ٹوپی پہنی۔ قیام پاکستان کے وقت سے عام طور پر مغربی لباس کم کر دیا اور قومی لباس شیروانی' شلوار اور جناح کیپ استعمال کی۔ قائد کے پسندیدہ ترین مشاغل میں سے

اخبارات کا مطالعہ سر فہرست ہے۔ وہ ساری دنیا سے اخبارات منگواتے' ان میں سے اپنی دلچسپی کی چیزیں تراشتے اور پھر ان کٹنگز پر ضروری نوٹ لکھتے اور ان کو فائلوں میں چپکاتے' بعض اوقات گھنٹوں وہ اس کام میں گزار دیتے۔ اس طرح وہ دنیا بھر کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔

منشی عبدالرحمن کی کتاب "کردار قائداعظم" کا ایک ورق بھی ملاحظہ فرمائیں۔ قائد کی زندگی کا نقشہ انہوں نے اس طرح کھینچا ہے۔

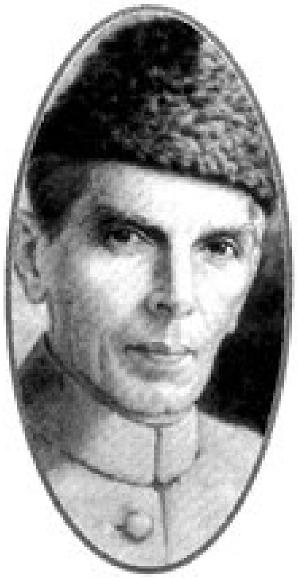

قائداعظم محمد علی جناح نے 6ماہ...... ریذیڈنسی مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیئے۔

ایک سال...... مختلف بیرونی سفروں میں گزارا۔

دوسال...... میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

تین سال...... کم و بیش بیروزگاری کا شکار رہے کہ پریکٹس کا ابتدائی دور تھا۔

گیارہ سال...... ازدواجی زندگی نصیب ہوئی۔

بارہ سال...... انگلستان میں قیام رہا۔

سولہ سال...... کانگریس سے وابستہ رہے۔

اکتیس سال...... مسلم لیگ کی قیادت کی۔

ایک سال 27یوم...... گورنر جنرل پاکستان رہے۔

71سال 8ماہ اور 16دن زندہ رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

☆......☆......☆

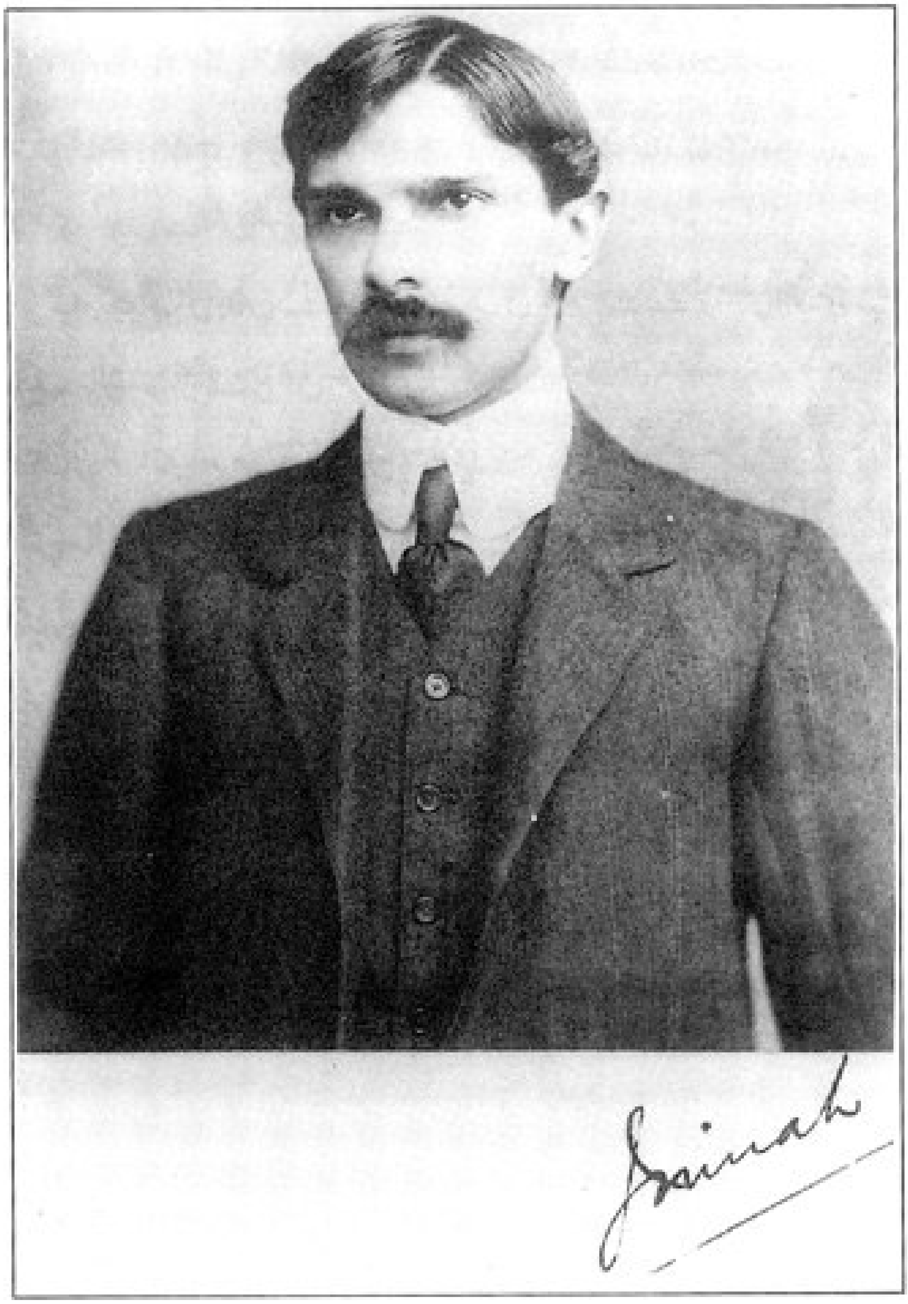

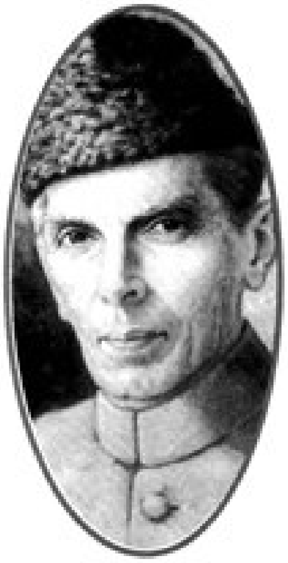

visit http://urdulibrary.paigham.net/ for all type of books

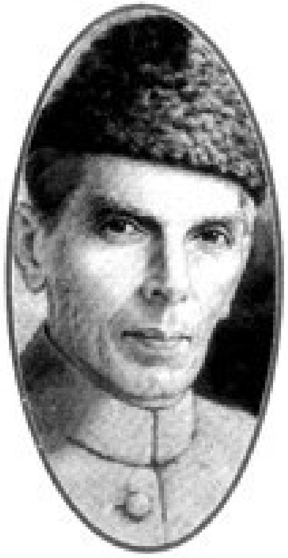

کچھ دلچسپ باتیں

قائداعظم کی ذاتی زندگی کے دلچسپ واقعات ہم اس لئے جمع کر رہے ہیں کہ ہم میں سے جو نہیں جانتے' ان تک بھی یہ معلومات پہنچ سکیں کہ جناب محمد علی جناح کس طرح قائداعظم بنے اور ان کے کردار کی وہ کونسی خوبیاں تھیں' جن کے باعث انہوں نے پاکستان کا قیام ممکن کر دکھایا جو انگریز اور ہندو دونوں کی مخالفت کے باعث ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

جناب ممتاز حسن مرحوم سٹیٹ بینک آف پاکستان کے سربراہ تھے' وہ قائداعظم سے اپنی ملاقاتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سیاسی حلقوں کے حوالے سے اکثر سننے میں آیا ہے کہ جناب محمد علی جناح کی طبیعت آمریت کی طرف مائل تھی اور وہ دوسروں کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے' یہ سراسر ہندو کا پراپیگنڈا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کی شخصیت پر اس سے بڑا بہتان تراشا نہیں جاسکتا' کیونکہ قائد تو سرتاپا جمہوریت تھے اور مخالف کی بات سننا اور اس پر غور کرنا جمہوریت کا خاصہ ہے۔"

”مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر میں نے ان کی رائے سے شدید طور پر اختلاف کیا۔ یہ ایک مالی معاملہ تھا اور میرا خیال تھا کہ میں سچے دل سے جو بات کہہ رہا ہوں‘ وہی فائدہ مند ہے۔ میں بحث کرتا چلا گیا‘ قائد نے بھی مجھ سے بحث کی اور جب میں نے آخر میں مؤدبانہ عرض کیا کہ میں ان کے نقطہ نظر کا حامی نہیں ہو سکتا تو ان کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو اختلاف رائے کا حق حاصل ہے۔“

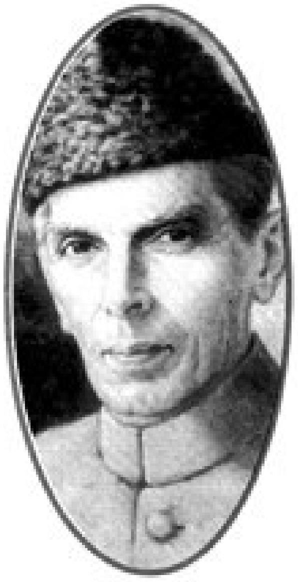

ممتاز حسن نے قائد کے حوالے سے بعض دلچسپ واقعات بھی درج کیے ہیں‘ وہ لکھتے ہیں: ”قائداعظم کی طبیعت ظرافت کے عنصر سے خالی نہیں تھی۔ 1948ء میں جب لندن سے واپس آتے ہوئے ان کا جہاز لیبیا کے ہوائی اڈے الادم پر اترا تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے مزاحیہ انداز میں مجھ سے کہا کہ مجھے لیبیا کا سیاح کہلانے کا حق ہے‘ کیونکہ میں نے کچھ وقت اس کی سرزمین پر گزارا ہے۔“ اسی طرح ایک بار قائد مختلف ملکوں کے کسٹم کے محکموں کے متعلق تذکرہ کر رہے تھے کہ انہیں اپنا ایک پرانا واقعہ یاد آگیا‘ کہنے لگے: ”ایک مرتبہ میں ایک فرانسیسی کسٹم آفیسر کے سامنے اپنے اسباب کی تفصیل پیش کر رہا تھا‘ اس میں سگریٹوں کے کچھ پیکٹ تھے۔ کسٹم آفیسر نے کہا کہ ان پر آپ کو کسٹم ڈیوٹی دینا ہوگی۔ میں نے کہا کہ یہ سگریٹ میرے پینے کے ہیں اور اس پر کسٹم نہیں بنتا مگر وہ نہ مانا‘ اس پر میں نے دیکھتے ہی دیکھتے سگریٹ کے ڈبے اس کے ہاتھ سے لے کر جنگلے کے باہر پھینک دیے اور کہا کہ قانونی طور پر اب میرے پاس نہ تو سگریٹ ہیں اور نہ مجھ سے کوئی کسٹم ڈیوٹی وصول کی جاسکتی ہے‘ اگر آپ کو شوق ہے تو یہ پیکٹ خود اٹھا لائیں اور سگریٹ خود پی لیں۔ کسٹم آفیسر حیران رہ گیا‘ کیونکہ جس چیز پر وہ کسٹم ڈیوٹی وصول کرنا چاہتا تھا‘ وہ میرے پاس تھی ہی نہیں۔“

ممتاز حسن لکھتے ہیں: ”اکثر اوقات قائداعظم کی شخصیت محمد علی جناح کی ذاتی زندگی پر چھائی رہتی تھی۔ اس ایک ہی شخص میں موجود دو شخصیتوں کا احساس جس قدر مجھے 1948ء کی

آخری ملاقات کے دوران میں ہوا'اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ قائد نے مجھے ایک سرکاری کام کیلئے بلایا' جب تک سرکاری کاغذات ان کے سامنے رہے' انہوں نے مجھ سے محض اسی معاملے پر گفتگو کی۔ میری تجویز پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ایک سوال کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا' غرضیکہ سوالات کی ایک بوچھاڑ کر دی۔ آخر جب پورے طور پر مطمئن ہوگئے تو کاغذات پر دستخط فرمائے۔"

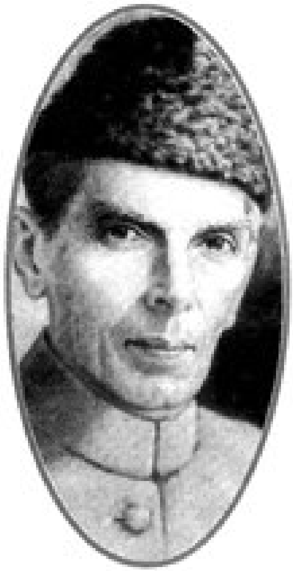

پھر قائد کے چہرے پر فی الفور تبسم نمودار ہوا اور انہوں نے اس ملاقات میں پہلی بار میرا مزاج پوچھا۔ پھر ہنس کر باتیں کیں اور بڑی شفقت سے رخصت کیا' مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ایک ہی ملاقات میں قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کو بھی دیکھا اور ان سے بہت ہی مختلف ایک اور انسان یعنی مسٹر محمد علی جناح کو بھی' جو اپنے جونیئرز اور پرانے مداحوں سے اس قدر محبت سے پیش آتا تھا۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی ذاتی زندگی ان کی سیاسی زندگی میں چھپ گئی تھی اور محمد علی جناح مشکل ہی سے قائداعظم کے اندر سے باہر آتے تھے۔ شدید مصروفیت' صحت کی خرابی' کام کا دباؤ اور ایک بہت بڑی ذمہ داری کہ انہیں جلد سے جلد اپنا مشن یعنی مسلمانوں کیلئے الگ وطن حاصل کرنا ہے' انہیں سیر و تفریح' ہنسی مذاق یا زندگی کے لطیف پہلوؤں میں دلچسپی نہیں لینے دیتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قائداعظم نے ایک بڑے مقصد کیلئے اپنی ہر خوشی قربان کر دی تھی۔

☆......☆......☆

قائداعظم اپنے خاندانی لباس میں، انہوں نے دسمبر 1896ء میں یہ تصویر
اپنے والد ماجد کو پیش کی۔

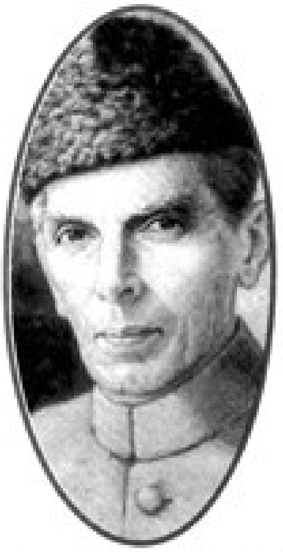

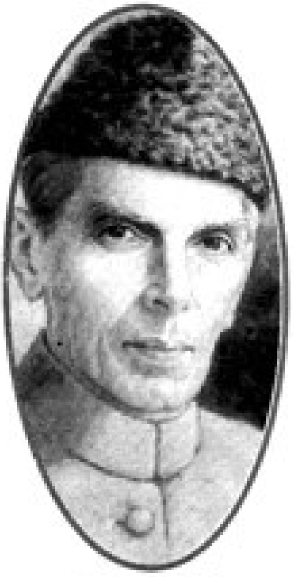

تقریر نہیں کام

قائداعظم کی شخصیت کے بارے میں دلچسپ اور سبق آموز واقعات ہم آپ کی خدمت میں بے شمار کتابوں اور اخبارات و رسائل کے مستند مواد سے چن کر پیش کر رہے ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ جناب ممتاز حسن نے لکھا ہے جو قائد کے اپنے اصولوں پر ایمان کی حد تک یقین کے بارے میں ہے۔ ”قائد جو دیانت اور روحانی پاکیزگی اپنے ساتھ لائے تھے وہ صدیوں میں پیدا نہیں ہوتی۔ تقسیم سے پہلے مختلف فرقوں اور گروہوں کی شرپسندی اور فساد کی خبریں آنے لگیں تو کچھ لوگوں نے جاکر عرض کی کہ مسلمانوں کو بھی ان کے مخالفین کی طرح ہتھیاروں اور گولہ بارود سے مسلح رہنا چاہئے اور اس سلسلے میں قائداعظم کو اقدام کرنا چاہئے‘ لہٰذا مسلمان اسلحے کے لیے چندہ جمع کریں۔

قائد یہ سن کر برہم ہوئے اور کہنے لگے: ”کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل پر دستخط کروں‘ مخالفوں کو مجبور کروں کہ لڑائی فساد سے باز رہیں اور دوسری طرف تمہارے لیے ہتھیاروں کا بندوبست کروں تاکہ جنگ وجدل کی جاسکے۔ میں ہرگز

کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے۔"

ایک اور واقعہ بھی جناب ممتاز حسن کی روایت ہے اور آج کے حالات پر بطور خاص صادق آتا ہے کیونکہ سیاسی جماعتیں اکثر عوام کو متوجہ کرنے کے لیے بہترین تقریر بازوں کو تلاش کرتی ہیں، جو عام آدمی کو جذباتی انداز میں متاثر کر سکے۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں: "پیرزادہ محمد ذکاءاللہ مرحوم نے جو تقسیم سے پہلے شملے کے ایک سرگرم مسلم لیگی کارکن تھے، مجھ سے کہا کہ جب قائداعظم نے 1937ء میں مسلم لیگ کی تحریک شروع کی تو ان کے ساتھ کم ہی لوگ تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ کچھ ایسے آدمیوں کو مسلم لیگ میں لانا چاہئے جو عوام کے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرنے کے عادی ہوں۔ ایک عرصے کی کوشش کے بعد میں نے ایک مشہور غیر مسلم لیگی مسلمان کو مسلم لیگ میں شامل ہونے پر راضی کر لیا، جو بلا کا مقرر تھا اور جلسوں میں حاضرین کو مسحور کر لیتا تھا۔ اس کی شرط یہ تھی کہ مسلم لیگ ان کے گزارے کے لیے سو روپے ماہوار انہیں دیا کرے، کیونکہ کانگریس انہیں یہ وظیفہ دے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اس قدر کم رقم مانگنے میں بڑے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ خوشی خوشی قائداعظم کے پاس پہنچا اور کہا کہ دیکھئے قسمت نے یاوری کی ہے اور ایک مشہور معروف کانگریسی کارکن جو ایک زبردست مقرر بھی ہے، مسلم لیگ میں آنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ ہم اس کے لیے فقط سو روپے ماہانہ کا بندوبست کر دیں۔ اب آپ اجازت دیں تو معاملہ فوراً طے ہو جائے، اگر ضروری ہوا تو ہم لوگ اس رقم کا بوجھ مسلم لیگ کے مرکزی فنڈ پر بھی نہیں ڈالیں گے اور مقامی طور پر خود ہی انتظام کر لیں گے۔

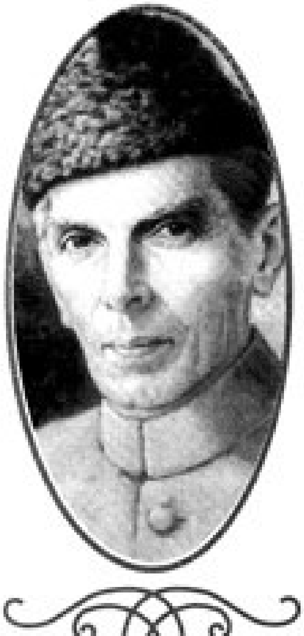

پیرزادہ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ قائداعظم میری بات سن کر ذرا بھی خوش نہ ہوئے اور بولے مجھے افسوس ہے کہ میں اس تجویز سے متفق نہیں۔ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام

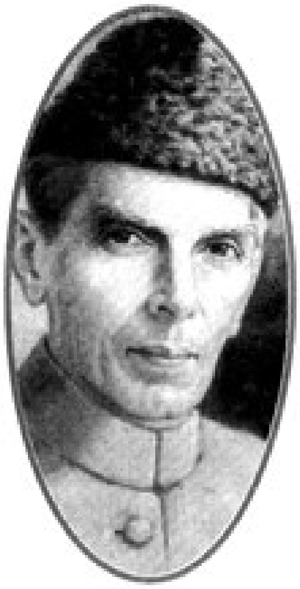

ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً جائز نہیں۔ اگر آپ کے دوست سمجھتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں آکر کام کرنا چاہئے تو اس کیلئے شرطیں ٹھہرانا بہر حال مناسب نہیں، دوسرے ہم ایک غریب قوم ہیں۔ آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپیہ مانگتے ہیں، اگر ہم ان کی شرط منظور کرلیں تو بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار ہندو یا انگریز انہیں سو روپے سے زیادہ رقم دے کر دوبارہ واپس نہیں لے جائیں گے۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ آکر ہم میں شامل ہو جائیں۔ ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے، جو روکھی سوکھی میسر ہے اس میں وہ بھی ہمارے حصے دار ہوں گے، لیکن اگر وہ پیشگی کوئی شرط عائد کرنا چاہتے ہیں اور اپنی تقریر کرنے کی صلاحیت کو بیچنا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ جہاں ہیں وہیں رہیں یا کوئی اور گاہک تلاش کریں، ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔"

ممتاز حسن کی یادداشتوں کے بعد ایک واقعہ کتاب "نقوش قائداعظم" سے پیش ہے، جو قائداعظم نے خود سنایا۔ انہوں نے کہا: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک بڑے سیٹھ کے ہاں مہمان تھا۔ صبح کو رخصت کے وقت میں نے بوڑھے ملازم کو کچھ نقدی دینا چاہی تو بوڑھے نے واپس کردی۔ میں نے اس خیال سے کہ بڑے آدمی کا ملازم ہے شاید اس رقم کو اپنی پوزیشن سے کم سمجھتا ہو، رقم کو دگنا کر دیا، لیکن اس نے پھر واپس کر دی۔ انکار کی وجہ پوچھی تو بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے رقت انگیز لہجے میں کہا:

"قائداعظم صاحب! آپ مجھے روپے دے کر خوش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ میرا بال بال آپ کے کام پر خوش ہے، جو آپ قوم کے لیے کر رہے ہیں، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری باقی عمر آپ کو بخش دے تاکہ جو کام آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اسے پورا کرسکیں۔ میں تو خود اپنی جمع پونجی میں سے کچھ چندہ مسلم لیگ کو دے چکا ہوں۔" قائد کہتے ہیں یہ سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ ہمیں تو ایسے ہی کارکن درکار تھے جو پاکستان کے لیے قربانی دے سکیں۔ ☆

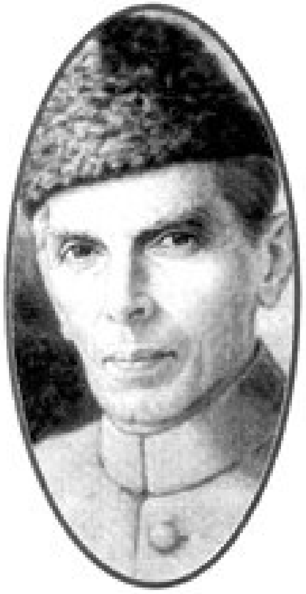

visit http://urdulibrary.paigham.net/ for all type of books

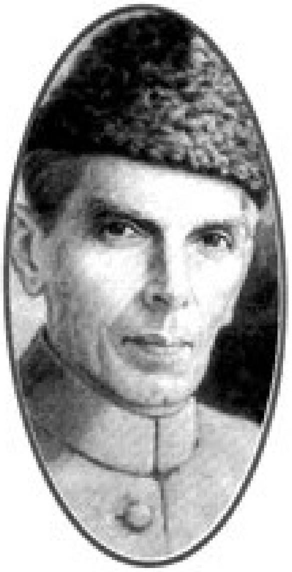

سچا اور کھرا انسان

مرزا شمس الحسن آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "صرف مسٹر جناح" میں قائد کے بارے میں بعض انتہائی دلچسپ اور ذاتی معلومات لکھی ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

قائد کے گھر کا عملہ کچھ اس طرح تھا: 2 بٹلر، 2 خدمت گار، 1 آیا، 2 باورچی، 3 سے 4 حمال، 2 ڈرائیور، 2 چوکیدار، 3 سے 4 مالی۔ ان کا کہنا ہے کہ 1944ء میں 10، اورنگزیب روڈ دہلی کے ملازمین کی تنخواہیں 140 روپے ماہوار تھیں اور بمبئی کے "جناح بنگلہ" کی 187 روپے ماہوار۔ 1946ء میں دہلی رہائش گاہ کی تنخواہیں 180 روپے ماہوار ہو گئیں اور بمبئی رہائش گاہ کی 304 روپے ماہوار۔

وہ لکھتے ہیں کہ قائد ڈسپلن کے بہت پابند تھے مگر ان میں تمام تر انسانی ہمدردیاں بھی موجود تھیں۔ ایک گھریلو ملازم روشن خان کا باپ انتقال کر گیا۔ اس نے چھٹی کیلئے درخواست دی۔ قائد اس وقت دورے پر تھے، انہیں روشن خان کا 18 مارچ 1944ء کا خط 27 مارچ

1944ء کولاہور میں موصول ہوا۔انہوں نے اس کا فوراً جواب دیا:

"ڈیئر سر'

آپ کا خط ملا۔ آپ کے والد کے انتقال کی پر ملال خبر پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہم 10 اپریل کے لگ بھگ بمبئی پہنچیں گے۔اگر آپ کو اس سے پہلے جانا پڑے تو امید ہے کہ آپ میری وہاں آمد سے پہلے کوئی قابل اعتماد متبادل چھوڑ جائیں گے۔ آپ میرا یہ خط چائے والا کو دکھادیں۔وہ آپ کو مارچ کی تنخواہ ادا کر دیں گے۔افسوس کہ مجھے آپ کا خط تاخیر سے ملا' کیونکہ میں 26 سے دورے پر تھا'اس لئے میں آپ کو قبل ازیں جواب نہ دے سکا۔"

آپ کا وفا کیش

ایم اے جناح

واضح رہے کہ انداز تخاطب میں وہ ملازم کو بھی ہمیشہ سر لکھواتے تھے۔

مرزا شمس الحسن لکھتے ہیں کہ ایسی ہی ایک صورتحال میں ایک اور ملازم عبدالستار تھا جو قائد کی ملازمت چھوڑ کر تحصیل ہری پور میں اپنے آبائی گاؤں چلا گیا کیونکہ اس کا باپ بیمار تھا' کچھ دنوں بعد اس کا باپ انتقال کر گیا۔ عبدالستار نے قائد کو لکھا کہ آیا آپ مجھے دوبارہ ملازم رکھ لیں گے۔ یہ خط ملازم کی اپنی تحریر میں کتاب میں درج ہے جو ٹوٹی پھوٹی اُردو میں لکھا گیا ہے۔

قائد نے عبدالستار کو 20 نومبر 1946ء کو جواب دیا:"آپ کا خط ملا۔ آپ کے والد کی وفات کا سن کر افسوس ہوا۔ آپ کو دوبارہ ملازم رکھتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی۔ آپ 15 دسمبر کو' جبکہ میں بمبئی میں ہوں گا' ملازمت شروع کر سکتے ہیں۔"

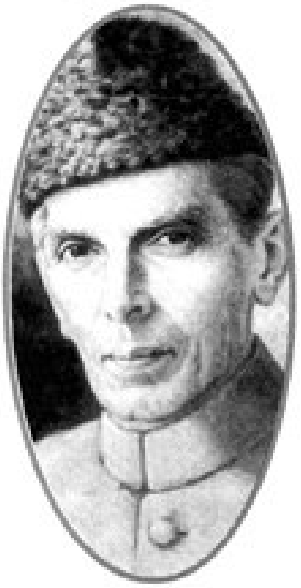

آپ کا وفا کیش

ایم اے جناح

ہمارے قائد ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ جب ان کے ایک ڈرائیور کا دوسرے

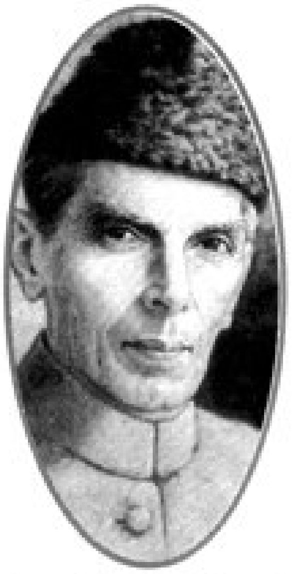

ملازموں کے ساتھ سلوک اچھا نہ رہا اور وہ اکثر ان سے جھگڑا کرتا تو قائد نے اپریل 1943ء میں اس ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔ اس کے اصرار پر قائد نے اسے چال چلن کی جو سند دی' وہ ان کے مزاج کی نشاندہی کرتی ہے' جس میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا: "مسمی محمد عالم موٹر کار ڈرائیور کی حیثیت میں ایک سال سے زائد عرصہ میری ملازمت میں رہا۔ میں نے اسے دیانتدار اور بہت اچھا ڈرائیور پایا۔ اگرچہ اس میں شائستگی کا نام و نشان تک نہیں۔ اسے نوکری سے فارغ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسرے ملازموں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکا۔ حال ہی میں اس نے میرے خدمت گار کے ساتھ زبردست جھگڑا کیا۔ اس لئے میں اسے فارغ کرنے پر مجبور ہوں۔"

قائد ہر قسم کی اخلاقی برائی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ 11 نومبر 1944ء کو ایک باورچی مبارک بیگ کیلئے انہوں نے جو سرٹیفکیٹ جاری کیا' وہ ان کی اس سوچ کی ایک عمدہ مثال ہے: "مسمی مبارک بیگ بحیثیت باورچی میری ملازمت میں تقریباً نو ماہ رہا۔ یہ ایک اچھا باورچی ہے۔ ایک اچھا ملازم ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے ملازمت سے نکال رہا ہوں۔ اس کی شراب نوشی کے عیب نے اسے اس قدر ناقابل اعتماد کر دیا ہے کہ میرے پاس اسے برطرف کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔"

جب یہ خطوط لکھے جا رہے تھے تو قائد کے بعض ملازمین نے درخواست کی کہ اب جبکہ آپ ان لوگوں کو فارغ کر رہے ہیں' ایسے سخت الفاظ نہ لکھیں تاکہ ان لوگوں کو کسی دوسری جگہ نوکری آسانی سے مل جائے مگر قائد نہ مانے۔ انہوں نے کہا: "ان دونوں میں جو اچھائی ہے وہ میں نے لکھ دی ہے۔ جو برائی ہے وہ بھی لکھوں گا' تاکہ کوئی دھوکہ نہ کھائے۔ کسی کو فائدہ ہو یا نقصان' میں جھوٹ نہیں لکھ سکتا' نہ جھوٹا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں۔"

☆......☆......☆

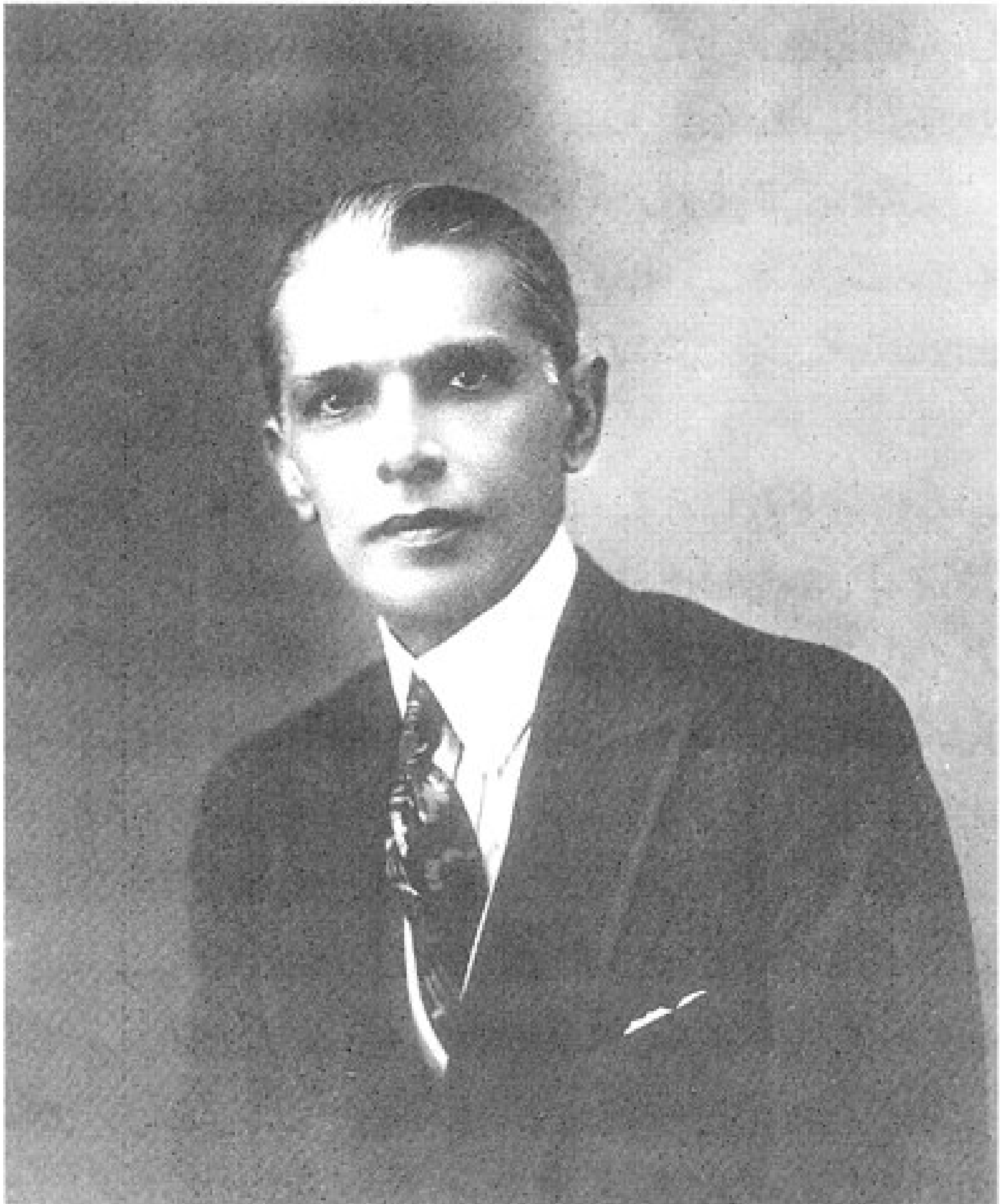

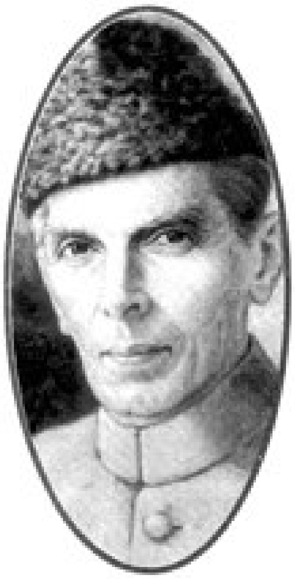

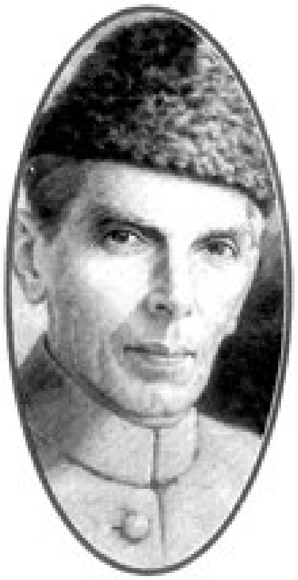

پیشہ ورانہ دیانت

تاریخ انسانی سے ثابت ہوتا ہے کہ عظیم لوگوں کو قدرت کی طرف سے کچھ ایسی خوبیاں دی جاتی ہیں، جنہیں یہ لوگ اپنی محنت اور جذبے سے مزید چمکاتے ہیں اور ان خوبیوں کی بنا پر تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ان کا نام محفوظ ہو جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح میں بھی بہت سی خوبیاں تھیں، جن میں سے ایک ان کی دیانتداری تھی۔ یہ دیانتداری ذاتی سطح پر بھی تھی اور پیشہ ورانہ بھی۔

تحریک پاکستان کے حوالے سے قائد کے دو پرائیویٹ سیکرٹری بہت مشہور ہوئے۔ پہلے مطلوب الحسن سید تھے اور دوسرے کے ایچ خورشید۔ مطلوب الحسن سید نے ایک کتاب ”ہمارے قائداعظم“ لکھی ہے جو بطور پرائیویٹ سیکرٹری قائد کے بارے میں ان کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”وکیل کی حیثیت سے محمد علی جناح بہت دیانتدار تھے۔ انہوں نے اپنی فیس 15 سو روپے روزانہ سے کبھی زیادہ نہیں لی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ لاہور کے مشہور وکیل اور سیاسی لیڈر دیوان چمن لال نے لکھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص محمد علی جناح کے پاس آیا

اور کہاکہ میرے مقدمے کے کاغذات پڑھ کراس پر رائے دے دیں۔

کاغذات بہت تھے اور اس قسم کے معاملات میں اس دور کے وکیل فی گھنٹہ فیس لیا کرتے تھے۔ حساب لگایا گیا تو کافی رقم بنتی تھی' لیکن مؤکل نے زیادہ سے زیادہ 10 ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ محمد علی جناح نے کاغذات پڑھنے سے انکار کردیا۔ اس پر اس شخص نے کہاکہ آپ کاغذات پڑھنا شروع کریں اور جب رقم ختم ہو جائے تو جہاں تک پڑھا ہو اس پر رائے دیں۔ اس پر محمد علی جناح راضی ہوگئے۔ کاغذات پڑھنے میں جو وقت صرف ہوا اس کا معاوضہ صرف ساڑھے 3 ہزار روپے بنا۔ لہٰذا قائد نے قانونی رائے دے دی اور باقی رقم اس شخص کو واپس کردی' حالانکہ وہ شخص تیار تھا کہ میرا کام ہوگیا' آپ بطور فیس 10 ہزار روپے رکھ لیں' مگر قائد نے کہا میری محنت کا معاوضہ اتنا ہی بنتا ہے' اس لیے میں زیادہ رقم نہیں لے سکتا۔

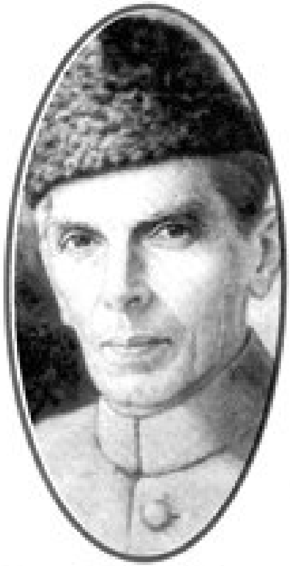

مطلوب الحسن سید ہی نے ایک اور واقعہ بھی درج کیا ہے کہ ایک بار حیدر آباد دکن میں قائد کو ایک مقدمے کی پیروی کیلئے جانا تھا' مگر کسی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ ایک اور نامور وکیل وہاں موجود تھے' اس وکیل نے عدالت سے التوا کی درخواست کی' مگر وہ قبول نہ ہوئی اور وکیل صاحب کو مقدمے کا آغاز کرنا پڑا۔ دوسرے دن قائد اعظم وہاں پہنچے تو وکیل صاحب نے ان سے درخواست کی کہ جناب اب کارروائی آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں' مگر قائد نے انکار کردیا کیونکہ ان کی نظر میں یہ وکالت کے پیشے کے آداب کے خلاف تھا۔ انہوں نے کہاکہ مشورہ دینے کیلئے تو میں تیار ہوں' مگر جرح نہیں کروں گا۔ وہ آپ ہی کریں گے کیونکہ اب یہ آپ کا حق ہے اور آپ نے کیس کی پیروی شروع کردی ہے۔ یہ کہہ کر قائد نے فیس بھی واپس کردی۔

مطلوب الحسن سید ایک اور واقعہ بھی بیان کرتے ہیں۔ "قائد اعظم کی دیانتداری اور اصول پسندی کی سب تعریف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے دشمن بھی۔ ایک مرتبہ مسٹر

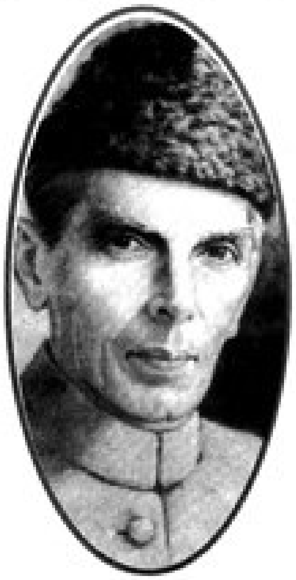

ٹیلنس نے، جو مرہٹی زبان کے اخبار "کیسری" کے ایڈیٹر تھے، کہا کہ مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ تعجب ہے کہ مسلمانوں میں سے محمد علی جناح نام کے اس شخص کی قیمت کوئی نہیں لگا سکتا کیونکہ یہ بک نہیں سکتا۔ بالعموم لوگ کسی نہ کسی قیمت پر بالآخر بک جاتے ہیں، مگر جناح ناقابل تسخیر ہیں۔ مطلوب کہتے ہیں کہ جب میں نے مسٹر ٹیلنس سے کہا کہ یہ بات تو فخر کرنے کی ہے کہ ہندوستان میں نہ بکنے والے لوگ موجود ہیں تو وہ بولے "ہمارے درمیان ایسے لوگ کہاں ہیں۔ پورے ہندوستان میں جناح تو صرف ایک ہے" پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا: "میں ناز ہی نہیں کرتا، میں تو محمد علی جناح کی پرستش کرتا ہوں۔ کاش ہم ہندوؤں میں کوئی آدھا جناح بھی پیدا ہو جائے تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں۔"

مطلوب الحسن سید کا کہنا ہے کہ جب میں نے دوسرے روز یہ واقعہ قائداعظم کو سنایا تو انہوں نے صرف اتنا کہا: "میں مسٹر ٹیلنس کا ممنون ہوں" اور بات کاٹ دی۔ دراصل قائد اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے اور جونہی ان کے منہ پر تعریف کی جاتی وہ گفتگو کا رخ تبدیل کر دیتے تھے۔

قائداعظم واقعی عظیم تھے اور رہیں گے۔

☆......☆......☆

قائداعظمؒ، محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی خاں کے ہمراہ

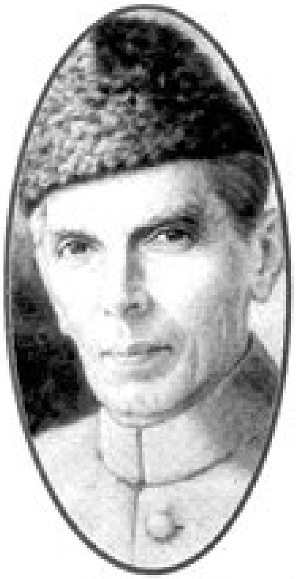

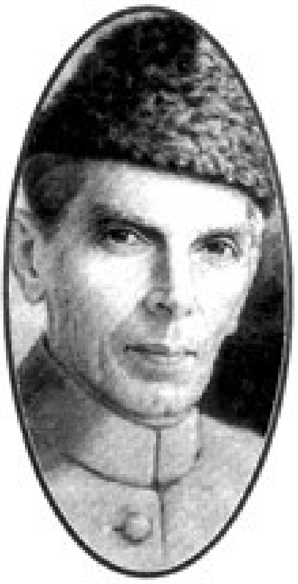

ناقابل خرید

جدید ترکی کے معمار مصطفیٰ کمال پاشا کی سوانح حیات "گرے وولف" قائداعظم کو ان دنوں بہت پسند آئی تھی، جب وہ ہندوستان سے مایوس ہو کر دوبارہ انگلستان جاکر آباد ہو گئے تھے۔ "گرے وولف" کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر قائد کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوتی ہو گی کہ وہ جلاوطنی کی اس پُرسکون زندگی کو ترک کر کے پھر ہندوستانی سیاست کے ہنگاموں میں شریک ہو جائیں اور اپنے عظیم سیاسی مقصد کی تکمیل کیلئے سرگرم عمل ہوں۔ یہ داستان بھی دلچسپ اور اثرانگیز ہے:

جولائی 1933ء کی ایک شام کو نوابزادہ لیاقت علی خان اور ان کی بیگم رعنا لیاقت ہندوستان سے انگلستان آکر ویسٹ ہیتھ ہاؤس پہنچے اور انہوں نے قائد سے استدعا کی کہ وہ وطن لوٹ چلیں۔ لیاقت علی خان جو آگے چل کر قائد ملت کہلائے، اور قائداعظم کے دست راست ثابت ہوئے، 1896ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم بنے۔

ہیکٹر بولائتھو لکھتے ہیں: ''مسٹر جناح اور لیاقت کی دوستی اور ہیمپ اسٹیڈ میں ان کی تاریخی ملاقات کا قصہ میں نے بیگم لیاقت علی خان کی زبانی سنا ہے۔ بیگم صاحبہ نے اسے یوں بیان کیا:

''میرے شوہر اور قائداعظم محمد علی جناح ایک دوسرے کو 1928ء سے جانتے تھے۔ ان کی ملاقات اس سال کلکتہ میں ہوئی تھی، جہاں آل پارٹیز کانفرنس میں قائد کو یہ طعنہ دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ کسی عنوان سے مسلمانوں کی قیادت کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ لیاقت ان لوگوں میں سے تھے' جنہوں نے اس وقت بھی قائد کا ساتھ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے قائد کے مداح تھے۔''

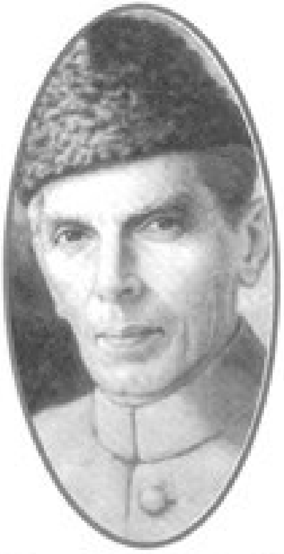

''ہماری شادی 1933ء کے شروع میں ہوئی اور ہنی مون منانے کیلئے ہم نے یورپ کا سفر کیا۔ لیاقت کو یقین تھا کہ مسٹر جناح اب بھی مسلم لیگ اور مسلمانوں کو بچاسکتے ہیں، مگر وہ سات سمندر پار انگلستان میں بیٹھے تھے اور ہندوستان میں لوگوں کا خیال تھا کہ جناح اپنی قوم سے مایوس ہوچکے ہیں اور اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔ لندن آکر ایک دعوت میں میری اور لیاقت کی ملاقات مسٹر جناح سے ہوئی۔ لیاقت نے ملتے ہی مسٹر جناح سے اصرار شروع کیا کہ وہ وطن لوٹ چلیں۔ مجھے وہ الفاظ بھی یاد ہیں جو لیاقت نے اس موقع پر استعمال کیے:

''قوم کو کسی ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو کسی قیمت پر خریدا نہ جاسکے''۔

یہ لفظ میرے شوہر کو بہت پسند تھا اور اس میں شک نہیں کہ مسٹر جناح واقعی Unpurchasable تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی قیمت پر انہیں خرید نہ سکتی تھی۔ مسٹر جناح' لیاقت کی باتیں سنتے رہے، اوّل اوّل ان کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے انگلستان میں اپنی زندگی اور ہیمپ اسٹیڈ میں اپنے سکون اور اطمینان کا ذکر کیا۔ لیکن لیاقت آسانی سے ٹلنے والے نہ تھے۔ انہوں نے بار بار اصرار کیا کہ ''آپ کو بہر صورت واپس آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو آپ

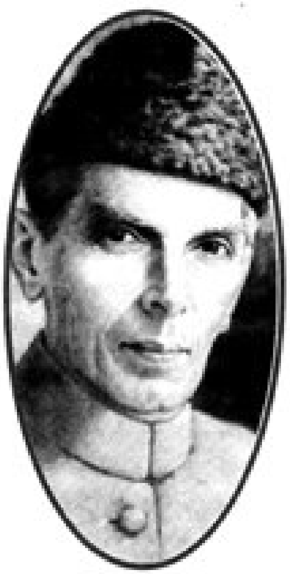

کی ضرورت ہے۔ آپ مسلم لیگ کو نئی زندگی عطا کر سکتے ہیں اور اس کو مرنے سے بچا سکتے ہیں"۔ مسٹر جناح سنتے رہے، پھر یکایک بولے: "اچھا، جمعہ کی شام آپ دونوں رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں"۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان کہتی ہیں: "جمعہ کو ہم دونوں موٹر میں سوار ہو کر ہیمپ اسٹیڈ جا پہنچے۔ وہ بڑی حسین شام تھی۔ مسٹر جناح کی عالی شان کوٹھی اور اس کے سیب کے درخت اب تک مجھے یاد ہیں۔ مس فاطمہ جناح اپنے بھائی کے آرام کا بہت خیال رکھتیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ مسٹر جناح اس اطمینان اور آرام و آسائش کی زندگی کو چھوڑ کر کبھی واپس ہندوستان نہ جائیں گے۔ کھانے کے بعد لیاقت نے پھر بہت زور دے کر مسٹر جناح سے کہا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے اور میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ واپس ہندوستان آجائیں۔"

بیگم رعنا لیاقت علی خان کا کہنا تھا کہ: میں خود عرصے سے جناح صاحب کی پرستار تھی، میں نے لیاقت کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "میں عورتوں کو آپ کیلئے کام کرنے پر آمادہ کروں گی۔ میں ان کو قومی تنظیم کی صفوں میں واپس لے آؤں گی۔" اس پر مسٹر جناح نے مسکرا کر کہا: "تم ابھی کم عمر ہو۔ تم ہندوستان کی عورتوں کو نہیں جانتیں، نہ دنیا کو جانتی ہو۔"

تاہم لیاقت کی بات مسٹر جناح نے غور سے سنی اور آخر کچھ پسیج کر بولے: "اچھا، تم واپس جا کر سیاسی صورتحال کا جائزہ لو اور ملک کے ہر حصے کے لوگوں کے جذبات و خیالات کا اندازہ لگاؤ۔ مجھے تمہاری سوجھ بوجھ پر بھروسہ ہے، اگر تم ملاقاتوں کے بعد بالآخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ مجھے واپس جانا چاہیئے تو لکھ بھیجنا، میں یہاں کی سکونت ترک کر کے وطن لوٹ آؤں گا"۔

رعنا لیاقت کہتی ہیں: "لیاقت بہت خوش خوش لندن سے واپس ہندوستان پہنچے۔ واپسی کے بعد کئی مہینے تک لیاقت کا ایک ایک دن دوروں اور سیاسی بات چیت اور پوچھ گچھ میں

صرف ہوا۔ وہ اپنے کام میں بڑے مستعد اور پکے تھے۔ انہوں نے قریباً سو اہم آدمیوں سے بات چیت کی اور سیاسی صورتحال کے متعلق مکمل معلومات حاصل کیں اور جب پورے غور و خوض کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا خیال درست ہے تو انہوں نے مسٹر جناح کو لکھا" کہ اب آپ آجائیں۔"

کتاب محمد علی جناح کے مصنف ہیکٹر بولا تھو لکھتے ہیں کہ جن دنوں مسٹر جناح لندن میں وکالت کرتے تھے، ان کے دفتر کے متصل ایک انگریز وکیل مسٹر ٹی ڈبلیو ریمزے کا دفتر تھا۔ انہوں نے جناح کی لندن سے واپسی کا حال یوں بیان کیا: "مجھے وہ دن یاد ہے جب جناح نے میرے دفتر آکر مجھے بتایا کہ وہ وطن واپس جا رہے ہیں۔ ان کے خوبصورت اور شاندار مہاگنی فرنیچر پر بہت سے وکیلوں کی نظر تھی اور وہ اسے خریدنا چاہتے تھے۔ فرنیچر میں مہاگنی کی چند بڑی خوبصورت میزیں بھی تھیں، ایک وکیل نے مسٹر جناح سے کہا وہ انہیں خریدنا چاہتا ہے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا: "مجھے لکڑی کے ان ٹکڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، تم یہ سب لے لو۔ میں ایک بہت بڑے مقصد کیلئے ہندوستان واپس جا رہا ہوں"۔

اس طرح قائد واپس ہندوستان آگئے اور پاکستان کیلئے تاریخی جدوجہد کا آغاز کیا۔

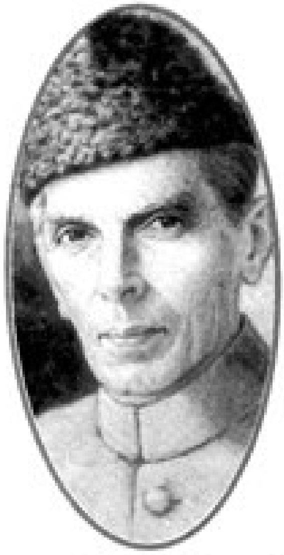

☆......☆......☆

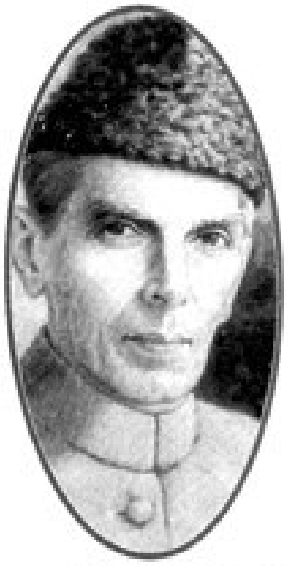

پیدائش' عقیقہ اور خاندان

قائداعظم کی شخصیت و کردار پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں' ان میں سے جی الانا کی کتاب "قائداعظم' ایک قوم کی سرگزشت" ایک اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

جی الانا مشہور شاعر' مفکر اور ادیب تھے اور تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے قائد کو بہت قریب سے دیکھا۔ الانا کی سوانح عمری میں قائد کی نجی اور عوامی زندگی کے ایسے بے شمار گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے' جن تک شاید کسی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ اس سوانح عمری کی تیاری میں جی الانا نے تقریباً 200 کتابوں کا مطالعہ کیا اور وہ ان تمام چھوٹے بڑے ملکی اور غیر ملکی افراد سے ذاتی طور پر ملے جنہیں قائداعظم کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔

یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جی الانا کون تھے۔ جی الانا نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز سندھ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کیا' پھر وہ آل پاکستان مسلم لیگ کے فنانس سیکرٹری بنے۔ وہ کراچی کے میئر اور مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی بنیاد رکھی اور کئی سال تک اس کے پہلے صدر

رہے۔ 1962ء میں انہیں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی کمیٹی برائے اقتصادی امور کا نائب صدر بھی مقرر کیا گیا۔

کتاب کے دیباچے میں جناب جی الانا نے لکھا ہے کہ جناح اور پاکستان دو ایسے الفاظ ہیں اور ان کا آپس میں اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا حیات قائداعظم در حقیقت قیام پاکستان کی داستان ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں قائد کی زندگی کے حوالے سے جی الانا کی کتاب سے بعض دلچسپ معلومات: وہ لکھتے ہیں۔

1947ء سے پہلے ہندوستان کے علاقے کاٹھیاواڑ میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جس کا نام گوندل تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی سے چھ سات برس پہلے قائداعظم کے والد اسی ریاست کے ایک گاؤں پنیلی میں پیدا ہوئے۔ جسے بعض کتابوں میں پونیل بھی لکھا گیا ہے۔ قائد کے دادا کا نام پونجا بھائی تھا۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود پونجا بھائی کھیتی باڑی کے بجائے چند کھڈیوں کے مالک تھے، جن پر کپڑا بنا جاتا تھا۔ پونجا بھائی کے تین بیٹے ولجی بھائی، نتھو بھائی، جناح بھائی اور ایک بیٹی من بائی تھی۔

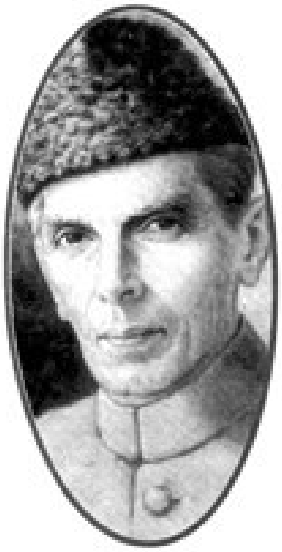

جناح بھائی اپنے خاندان کے پہلے شخص تھے جو گاؤں سے گوندل شہر میں تجارت کے لئے گئے اور چھوٹے سے کاروبار کا آغاز کیا۔ 1874ء کے لگ بھگ جناح بھائی کی شادی مٹھی بائی سے کر دی گئی جو خوجہ برادری کے ایک معزز خاندان کی بیٹی تھیں۔ اور جن کا اصل نام شیریں بائی تھا انہیں پیار سے مٹھی کہتے تھے۔

شادی کے بعد جناح بھائی نے زیادہ بڑے پیمانے پر کاروبار کی غرض سے فیصلہ کیا کہ وہ بمبئی یا کراچی منتقل ہو جائیں جو بندرگاہ ہونے کے باعث نسبتاً زیادہ کاروباری شہر شمار کئے جاتے تھے بالآخر قسمت جناح بھائی کو کراچی لے آئی جہاں انہوں نے نیو نہم روڈ کھارادر کی بلڈنگ میں ایک حصہ کرائے پر لیا۔

کراچی میں جو اِن دنوں پچاس ساٹھ ہزار کی آبادی کا ایک شہر تھا' ایک تجارتی فرم گراہمز شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی تھی' جس کے جنرل منیجر کا نام فریڈرک کرافٹ تھا جلد ہی جناح بھائی نے اپنی محنت اور ایمانداری کے باعث اس فرم سے تجارتی رابطے کر لئے اور شروع میں گوند قتیرہ اسی کمپنی کے ذریعے ملک سے باہر بھیجی۔

25 دسمبر 1876ء کو قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت وہ کمزور' دبلے پتلے جسم اور لمبے ہاتھوں والے بچے تھے۔ تاہم ڈاکٹروں کو دکھایا گیا تو انہوں نے کہا کہ کمزوری کے سوا بچے میں اور کوئی نقص نہیں اور جلد ہی وہ صحت مند ہو جائے گا۔ عام طور پر کاٹھیاواڑ کے لوگوں کے نام ہندوؤں سے ملتے جلتے ہوتے تھے۔ تاہم جناح بھائی پونجا بھائی اور ان کی اہلیہ مٹھی بائی نے اپنے بچے کا نام محمد علی رکھا۔

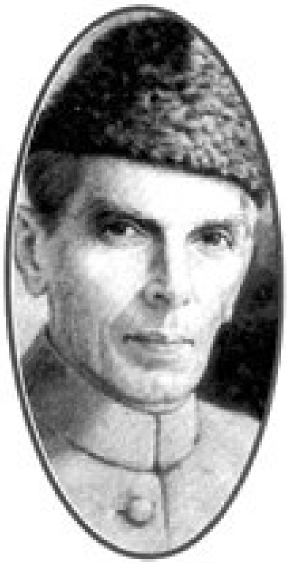

قائد کے علاوہ جناح بھائی کے چھ اور لڑکے لڑکیاں تھے' جن میں سے چار بیٹیاں تھیں یعنی رحمت' مریم' فاطمہ اور شیریں اور دو بیٹے تھے یعنی احمد علی اور بندے علی' قائد کی والدہ نے اصرار کیا کہ جناح بھائی پونجا بھائی بچے کے عقیقے کیلئے ان کے آبائی گاؤں پنیلی کے قریب ہی گنیوڈ گاؤں میں نامور بزرگ حسن پیر کی درگاہ پر چلیں۔ اس درگاہ پر والدین بچے کو عقیقے کیلئے لے جاتے اور بچے کے سر سے بال صاف کئے جاتے تو ماں خاص دعا مانگتی تھی اور حسن پیر کی درگاہ کو ماننے والوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے مزار پر جس بچے کا عقیقہ کیا جائے اور ماں جو دعا مانگے وہ قبول ہوتی ہے۔

دونوں میاں بیوی بچے کو لے کر بادبانی کشتی کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے اور کاٹھیاواڑ کی چھوٹی سی بندرگاہ ویراول پہنچ کر انہوں نے گنیوڈ جانے کیلئے بیل گاڑی کرائے پر لی۔ عقیقے کے بعد قائد کی والدہ نے ہاتھ پھیلا کر بچے کیلئے دعا مانگی اور وہ یقیناً قبول دعا کا لمحہ ہوگا کیونکہ یہ بچہ محمد علی آگے چل کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان کا بانی اور بابائے قوم بنا۔

☆......☆......☆

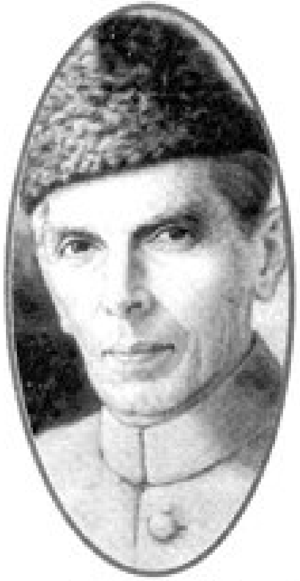

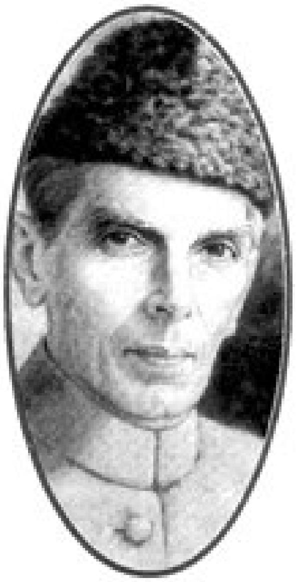

انوکھا دولہا ذہین طالب علم

قائد کی عمر 6 سال کی ہوئی تو انہیں گھر پر گجراتی کی تعلیم دینے کیلئے استاد کا بندوبست کیا گیا کیونکہ انگریزی سکول گھر سے دور تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کروایا گیا۔ سکول کے ریکارڈ کے مطابق یہ تاریخ 4 جولائی 1887ء ہے۔ رجسٹر میں ان کا پورا نام محمد علی جناح جائے پیدائش کراچی لکھا ہے 'عمر 14 سال درج ہے۔ سابقہ تعلیم سٹینڈرڈ چہارم گجراتی ہے 'فیس معاف ہے یا ادا کی جائے گی' کے خانے میں لکھا ہے کہ فیس ادا کی جائے گی۔ سکول رجسٹر کے ریکارڈ کے مطابق کچھ عرصہ بعد محمد علی بمبئی چلے گئے جہاں وہ ساڑھے پانچ ماہ رہے۔

9 فروری 1891ء کو محمد علی جناح پھر سکول چھوڑتے ہیں اور سکول چھوڑنے کی وجہ کچھ روانگی برائے شادی درج ہے۔ محمد علی جناح 16 برس کے تھے کہ والد نے انہیں تعلیم کی غرض سے لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

کراچی میں تجارتی فرم گراہمز شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی تھی۔ جس کے ساتھ قائد کے والد جناح بھائی پونجا بھائی کا بزنس چل رہا تھا۔

اس فرم کے جنرل منیجر فریڈرک کرافٹ کے مشورے ہی سے قائد کے والد نے لندن میں ان کی تعلیم کا فیصلہ کیا تاہم اس دور کی روایات کے مطابق قائد کی والدہ نے فیصلہ کیا کہ ولایت بھیجنے سے پہلے وہ اپنے بیٹے کی شادی کریں گی۔ اس مقصد کیلئے پنیلی ہی کے اسماعیلی خوجہ خاندان کی ایمی بائی سے قائد کی شادی طے کی گئی۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی نامکمل کتاب "میرا بھائی" میں اس شادی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح پھولوں سے سجی ہوئی بیل گاڑیوں کے ذریعے بارات دلہن کے گھر پہنچی تھی، کتنے پٹاخے چلائے گئے تھے اور دور دور تک کس قدر آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

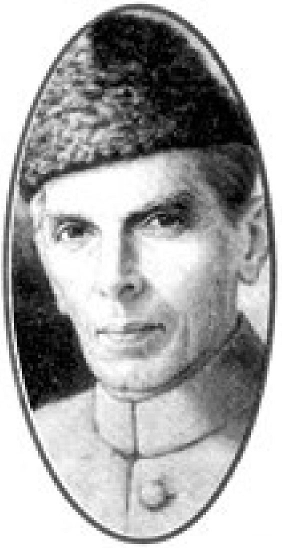

قائد کی عمر 16 سال اور دلہن کی 14 سال تھی۔ بارات کراچی واپس آئی تو جناح بھائی پونجا بھائی نے اپنے بیٹے محمد علی کو تعلیم کیلئے انگلستان بھیجنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

1892ء کے آغاز میں قائد کراچی سے یورپ روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میں بیرسٹر بننا چاہتا ہوں۔ سر ایلولین ریچ کی کتاب The immortal years میں قائد کا ایک جملہ درج ہے جو انہوں نے لندن میں ابتدائی ایام کے بارے میں کہا کہ: "میرے سامنے ایک اجنبی دیس اور نامانوس ماحول تھا۔ میں لندن میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ دھند اور سردی نے مجھے خاصا پریشان کیا مگر جلد ہی یہ وحشت ختم ہو گئی اور میں ہنسی خوشی رہنے لگا۔"

قائد پہلے ہوٹل میں ٹھہرے، بعد ازاں اخباروں میں اشتہارات کے ذریعے انہوں نے پے انگ گیسٹ کے طور پر ایک جگہ تلاش کی جو لندن کے علاقے کنگسٹن میں 35 رسل روڈ پر واقع تھی۔ بعد ازاں لندن کاؤنٹی کونسل نے اس عمارت پر ایک چھوٹی سے تختی بھی لگائی تھی۔ جس پر تحریر تھا۔ "بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اس مکان میں 1895ء" میں قیام کیا۔"

1893ء میں قائد نے قانون کی تعلیم دینے والے ادارے لنکنز ان میں داخلہ لیا۔ قیام پاکستان سے چند ماہ پہلے قائد نے کراچی بار ایسوسی ایشن کے سپاسنامے کے جواب میں وضاحت کی تھی کہ:

”میں نے قانون کی تعلیم کیلئے کسی دوسرے ادارے کی بجائے لندن کی درسگاہ لنکنز ان کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ اس کے دروازے پر دنیا کے عظیم قانون دانوں کی فہرست میں نبی کریم ﷺ کا نام بھی شامل تھا۔“

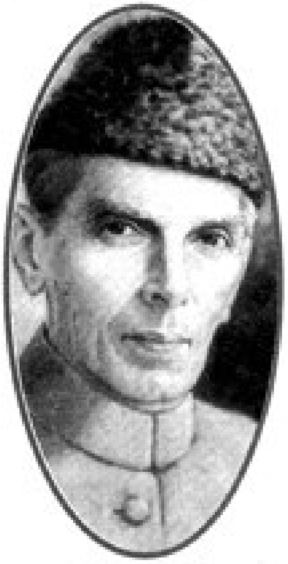

اس واقعہ سے قائد کی حضور پاک ﷺ کیلئے محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

2 سال کے بعد یکے بعد دیگرے قائد کی اہلیہ ایمی بائی اور والدہ مٹھی بائی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے والد جناح بھائی پونجا بھائی کو تجارت میں سخت نقصان ہوا اُس کے باوجود والد کی نصیحت کے مطابق قائد نے انتہائی صبر وضبط کے ساتھ ان پریشانیوں کا مقابلہ کیا اور انگلستان ہی میں رہے اور بے اندازہ محنت کی۔ وہ مطالعے کے علاوہ وہ لندن کے مشہور زمانہ ہائیڈ پارک میں جاتے اور اس جلسہ گاہ میں حکومت کے خلاف دھواں دھار تقاریر سنتے۔ قائد نے ہاؤس آف کامنز یعنی دارالعوام میں جا کر منتخب نمائندوں کی پارلیمانی تقاریر بھی سنیں۔ وہ پہلے ہندوستانی طالب علم تھے۔ جنہوں نے 18 سال کی عمر میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر لی۔ تاہم بیرسٹری کی ٹوپی اور گاؤن حاصل کرنے کیلئے انہیں قواعد کے مطابق کچھ عرصہ انگلستان میں رہنا تھا۔

☆......☆......☆

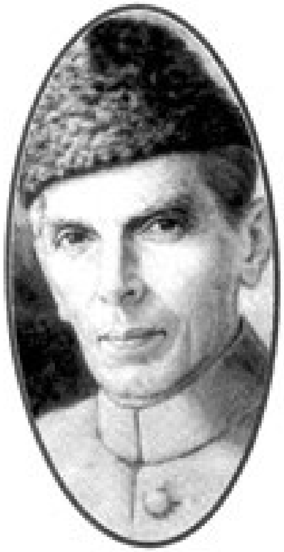

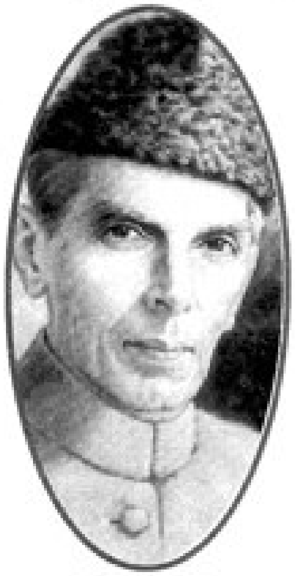

جمہوری ذہن کی درخشاں مثال

قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ قائد برطانوی ہند کی مرکزی قانون ساز اسمبلی کے الیکشن میں کیسے منتخب ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ بمبئی میں 1909ء کے بعد شہر کی ایک مسلم نشست پر دو بڑے خطاب یافتہ مسلمان لیڈروں نے الیکشن لڑنے کا اعلان کیا اور ایک دوسرے کے خلاف انتخابی مہم شروع کر دی۔ شہر کے سرکردہ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ دونوں کی باہمی لڑائی سے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچے گا، لہٰذا ان دو امیدواروں میں سے ایک کو بیٹھ جانا چاہیے۔

کوشش کے باوجود دونوں اس کیلئے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ کسی تیسرے آدمی کو یہ ذمہ داری سونپی جائے، جس کے بارے میں سب مسلمانوں کی رائے ہو کہ وہ مخلص ہے، دیانتدار ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی حفاظت کرے گا۔ سوچ بچار اور صلاح مشورے کے بعد سب کی آنکھیں محمد علی جناح پر پڑیں اور ان سے باقاعدہ درخواست کی گئی۔ یوں قائد بلامقابلہ منتخب ہوئے کیونکہ ان کے مقابلے میں کوئی امیدوار نہیں تھا، جبکہ ہندو سیٹ

پر مسٹر گوکھلے کو الیکشن لڑنا پڑا۔

بطور پارلیمانی لیڈر قائد کا کردار انتہائی بے داغ رہا اس دور میں وہ بیک وقت کانگریس کے ممبر بھی تھے اور مسلم لیگ کے بھی، انہیں انگریز کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کا پیغامبر سمجھا جاتا تھا اور سب لوگ ان کی تعریف کرتے تھے۔

لیکن رفتہ رفتہ قائد نے محسوس کیا کہ مسلمان اقلیت کیلئے مسائل کھڑے کئے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کے جائز حقوق کیلئے اب انہیں ایک طرف انگریزوں سے اور دوسری طرف ہندوؤں سے لڑنا ہوگا۔

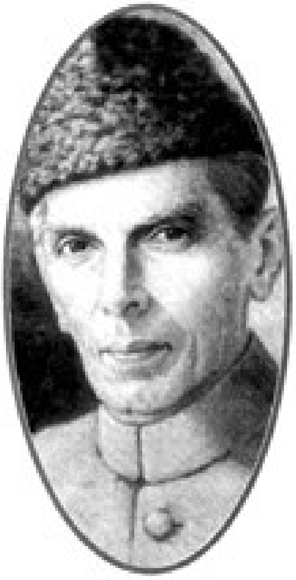

ہمارے قائد دل سے جمہوریت پر ایمان رکھتے تھے اور اپنی پارٹی کی منظوری کے بغیر کسی رائے کا اظہار نہ کرتے تھے۔ 26 اکتوبر 1928ء کو وہ انگلستان سے واپس آ رہے تھے کہ اخباری نمائندوں نے انہیں گھیر لیا اور برطانوی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ سائمن کمیشن کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ قائد نے کہا کہ مسلم لیگ کا لیڈر ہونے کے باوجود مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں اپنی پارٹی کا فیصلہ معلوم کرنے سے پہلے اپنی رائے دوں۔ میں پارٹی کی اعلیٰ ترین کمیٹی کا اجلاس بلاؤں گا اور ان سے رائے لینے کے بعد ہی کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔

سیاسی میدان کے علاوہ جاہلانہ رسوم اور غلط روایات کے خلاف قائد کی جدوجہد بھی بھرپور انداز میں جاری تھی اور اس سلسلے میں مسلمان عورتوں کے حقوق کیلئے ہی نہیں انگریز اور ہندو عورتوں کے حقوق کی بحالی کیلئے بھی قائد بڑی ہمت اور جرأت سے کام کرتے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں قیام انگلستان کے دوران قائد انگریز خواتین کے حقوق کیلئے بھی سرگرم عمل رہے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک خود جمہوریت کے دعویدار ملک انگلستان میں بھی خواتین کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا اور قائد لنکنز اِن میں قانون کے طالب علم تھے تو انگلستان میں خواتین کے حقوق کیلئے

Suffragette MOVEMENT شروع ہوئی۔ قائد نے خواتین کے حقوق کی حمایت میں مضامین لکھے اور شائع کرائے اور اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

اس جدوجہد کا اعتراف 16 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کی رحلت کے بعد ان کی یاد میں لندن کے کیکسٹن ہال میں ایک جلسے میں کیا گیا۔ جس کی رپورٹ برطانوی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اور تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ جلسے کی ایک خاتون مقررہ کا نام مس آگا تھا ہیری سن تھا، قائد کی یاد میں انہوں نے جو کچھ کہا اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

”ان دنوں جب انگلستان میں عوامی مخالفت کے خوف سے لوگوں کی اکثریت خواتین کے حقوق کی حمایت میں آواز تک اٹھانے کی جرأت نہیں کرتی تھی، مسٹر جناح ہماری دعوت پر ہمیشہ ہمارے جلسوں میں آئے اور ہر بار پُر زور دلائل کے ساتھ ہماری تحریک کی حمایت کی، حالانکہ اس وقت یہ تحریک مردوں میں سخت غیر مقبول تھی اور اس کے حق میں بولنا بڑے بڑے لوگوں کی نظر میں اپنے آپ کو نفرت کا نشانہ بنانے کے مترادف تھا۔“

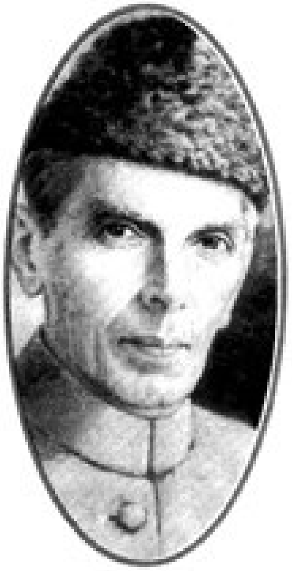

☆......☆......☆

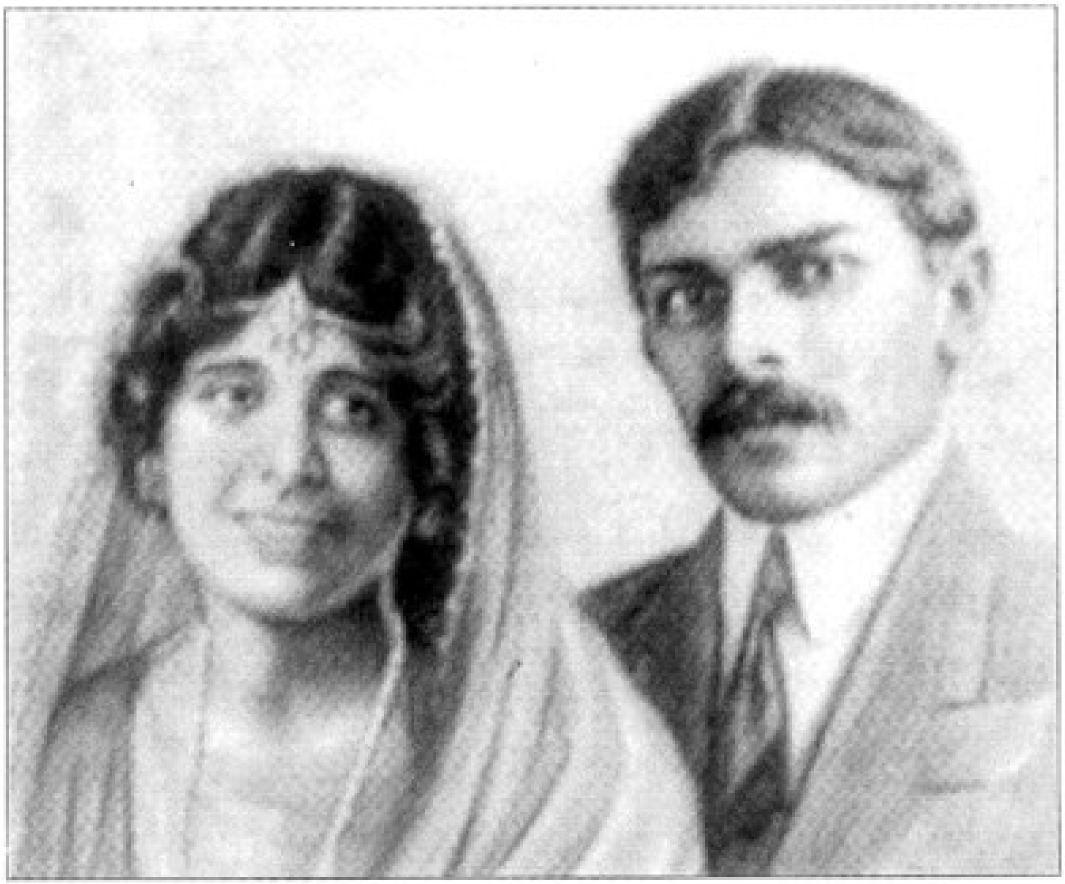

قائداعظم محمد علی جناح اپنی بیگم مریم جناح کے ساتھ

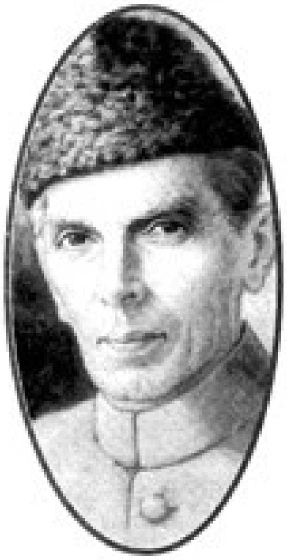

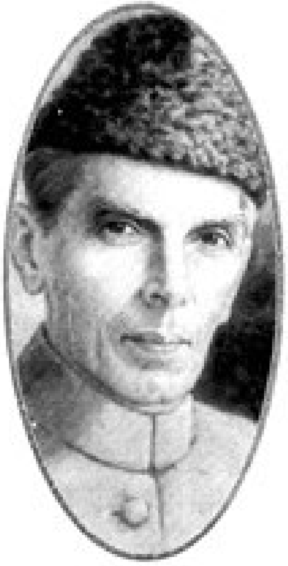

شادی کیسے ہوئی؟

قائداعظم محمد علی جناح کی شادی کا تذکرہ انتہائی دلچسپ ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی قائد کی انتہائی شرافت، دیانتداری اور تہذیب نفس کی ایک واضح دلیل ہے۔

1916ء میں قائد نے بمبئی کے علاقے مالا بار ہل میں ایک قلعہ نما بنگلہ خریدا جس کا نام ساؤتھ فورٹ تھا۔ بنگلے کی ضروری مرمت اور آرائش کے بعد قائد اس میں منتقل ہوگئے۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد قائد کو شام کے اوقات میں شطرنج اور بلیئرڈ کھیلنے کا شوق تھا لہٰذا انہوں نے اورینٹ کلب کی رکنیت حاصل کرلی جو اعلیٰ طبقے کا ایک کلب تھا اور جس میں اس دور کی روایت کے مطابق ہندو، پارسی، عیسائی سبھی مذاہب کے لوگ آتے تھے۔

یہیں قائد کی ملاقات پارسی برادری کی ایک امیر اور بااثر شخصیت سر ڈنشا پیٹٹ سے ہوئی۔ معروف مصنف جی الانہ قائد پر اپنی کتاب "سٹوری آف اے نیشن" میں لکھتے ہیں کہ سر ڈنشا اور ان کی بیگم سے قائد کے تعلقات کافی بڑھ گئے اور قائد اکثر ان کے ہاں کھانے پر جانے لگے، جہاں پہلی بار ان کی ملاقات سر ڈنشا کی بیٹی رتن پیٹٹ سے ہوئی جسے پیار میں سب رتی کہتے تھے۔ ذہانت، فطانت

اور حسن وخوبصورتی کے اعتبار سے رتی اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ انگریزی ادب بالخصوص شاعری پر عبور رکھتی تھیں اور شیلے، کیٹس، بائرن، براؤننگ اور انگریزی ادب کی دوسری معروف شخصیات کی تحریریں انہیں ازبر تھیں۔ معروف ادیب اور مذہبی سکالر خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ رتی ہندوستان کی تمام خواتین میں سے خوبصورت اور پرکشش سمجھی جاتی تھیں۔ انہیں سماجی کاموں میں بھی دلچسپی تھی اور وہ عورتوں کے حقوق کیلئے جدوجہد کرنا بھی بہت ضروری سمجھتی تھیں۔

ایک بار گرمیوں کے موسم میں صحت افزاء پہاڑی مقام پر پکنک کیلئے جاتے ہوئے سر ڈنشا اپنے اہل خانہ کے علاوہ قائد کو بھی لے گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے ایک مضمون ''بیگم رتی کا قبول اسلام'' کے نام سے لکھا جس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک خنک شام جب کھانے کے بعد خوش گپیوں کے دوران رتی نے قائداعظم سے پوچھا مسٹر جناح آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی جس پر قائد نے ازراہ مذاق جواب دیا کہ ابھی تک مجھے اپنے معیار کی کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ اسی روز باتوں ہی باتوں میں رتی نے خواہش ظاہر کی کہ معلومات کیلئے میں بھی اسلام کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہتی ہوں۔

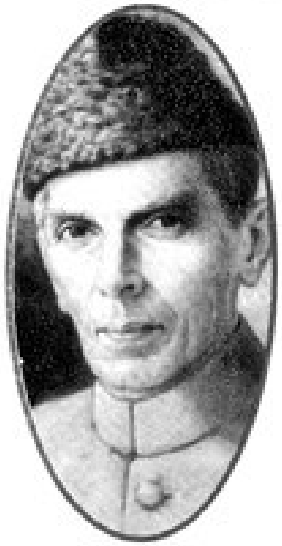

چند ہفتے بعد قائد بمبئی واپس پہنچے تو انہوں نے بمبئی کرانیکل کے مسلمان ایڈیٹر سید عبداللہ بخاری کے مشورے سے اسلام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کچھ کتابیں جو انگریزی اور گجراتی زبان میں تھیں، رتی کو بھجوادیں۔

چند ماہ بعد جب مس رتی نے اپنے والد سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ محمد علی جناح سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو اس پارسی خاندان میں ایک بھونچال آگیا۔ سر ڈنشا کا خیال تھا کہ پارسی لڑکی ایک مسلمان مرد سے شادی نہیں کرسکتی اور یوں بھی مس رتی کی عمر 17 برس سے کم تھی اور قانون کی نگاہ میں بالغ لڑکی جو اپنی مرضی سے شادی کرسکتی ہے اس کی عمر 18 برس سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

سر ڈنشا پیٹٹ اپنی بیٹی کو جانتے تھے جو قائد کو پسند کرتی تھیں اور جن کا رجحان اب دین

اسلام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سر ڈنشا کے پاس قانون کا سہارا حاصل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ انہوں نے کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے باقاعدہ ایک حکم امتناعی حاصل کیا۔ اس حکم میں رتی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ سن بلوغت کو پہنچنے تک والدین کی اجازت کے بغیر شادی کرنے سے باز رہے۔ مسٹر ڈنشا اور لیڈی پیٹٹ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ایک سال تک مس رتی کی یہ خواہش ختم ہو جائے گی۔ دوسری طرف محمد علی نے بھی قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے کورٹ کی ہدایت پر عمل کیا۔

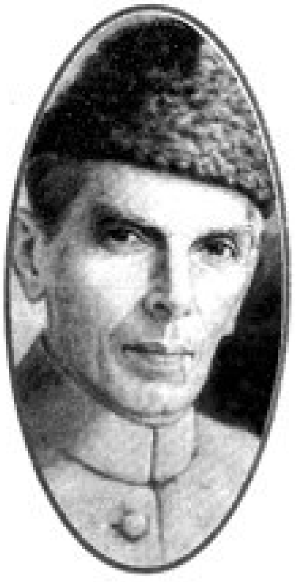

البتہ مس رتی نے 1918ء میں اپنی زندگی کی اٹھارہ بہاریں مکمل کرلیں تو ان پر قانون کی پابندی ختم ہوگئی۔ قائداعظم نے مس رتی کے قبول اسلام کا بندوبست کیا اور 18اپریل 1918ء کو پارسی برادری کی اس نڈر اور بہادر لڑکی نے بمبئی کی جامع مسجد میں مولانا نذیر احمد کے سامنے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے اگلے روز 19اپریل کو قائداعظم کے ایک دوست شریف دیوجی نے ایک قاضی کا انتظام کیا اور قاضی صاحب نے قائداعظم کی رہائش گاہ واقع ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر آکر اسلامی رسم ورواج کے مطابق ان دونوں کی شادی کروادی۔ راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر محمد علی جناح کے ولی اور مولانا حسن نجفی نے رتی پیٹٹ کے ولی کے طور پر نکاح نامہ پر دستخط کیے۔ عمر سبحانی رسم نکاح کے گواہ تھے۔

رتن بائی کا حق مہر ایک ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا اور قائداعظم نے اس کے علاوہ سوالاکھ روپیہ بطور تحفہ اپنی دلہن کی نذر کیا۔ اس موقع پر مس رتی پیٹٹ کا اسلامی نام مریم جناح بھی تجویز کیا گیا۔

رتی جناح کی شادی کے سلسلے میں قومی اخبارات نے بھی خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسٹیٹس مین اور ٹائمز آف انڈیا نے عین شادی کے روز یعنی 19 اپریل ہی کو اس شادی کی خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں شائع کی۔

”سر ڈنشا پیٹٹ کی اکلوتی بیٹی مس رتن بائی نے کل اسلام قبول کرلیا۔ آج آنریبل ایم اے جناح سے ان کی شادی ہو رہی ہے۔“

☆......☆......☆

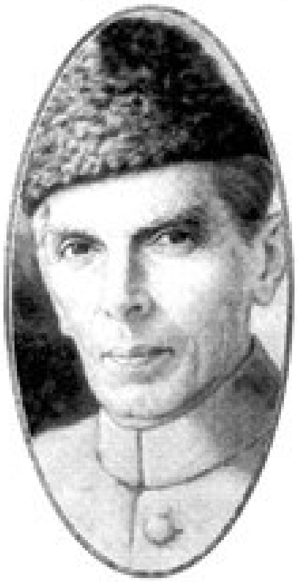

قائداعظمؒ کشمیر کے صحت افزا مقام چشمہ پر قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

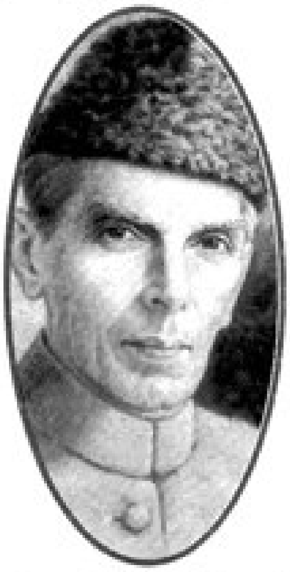

قائداعظم کا دورۂ کشمیر-1

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید بانئ پاکستان کے دورۂ کشمیر پر ایک خصوصی انٹرویو دیا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ قائداعظم اور مسئلہ کشمیر پر اظہار خیال ہے۔ آیئے اس کی تفصیل دیکھیں' جناب خورشید لکھتے ہیں:

" قائداعظم کے دورۂ کشمیر کے انتہائی اہم تاریخ ساز ایام کی یادیں آپ کے سامنے لانے سے پہلے میں بعض امور کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں تاکہ معاملات سمجھنے میں آسانی رہے۔ جموں وکشمیر کے بارے میں عام تاثر کہ یہ چھوٹی سی ایک وادی ہے بالکل غلط ہے' پوری آبادی کا رقبہ 84 ہزار مربع میل سے زیادہ ہے' 72 بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ وہ علاقہ جو وادئ کشمیر کے نام سے مشہور ہے اس کی لمبائی 80 سے 100 میل اور چوڑائی 30 سے 50 میل تک ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کشمیر کے 4 صوبے جموں' کشمیر' لداخ اور گلگت تھے جہاں گورنر مقرر ہوتے تھے۔ صوبہ کشمیر کے 3 اضلاع بارہ مولا' اسلام آباد اور پہاڑ مظفر آباد تھے۔ یہ تینوں اضلاع بھی وادی نہیں کہلاتے' وادی جغرافیائی حصے کا نام ہے جو کشمیر کا مرکزی اور خوبصورت

میدان ہے، جس میں باغات، جھیلیں اور زاریں ہیں۔ آب و ہوا خوشگوار ہے، رقبہ زیادہ سے زیادہ 4 ہزار مربع میل ہے۔ جہاں بھی کشمیر کا لفظ استعمال ہو گا اس سے وادی نہیں بلکہ ریاست جموں وکشمیر مراد لی جائے کہ یہی اس کا سرکاری نام ہے۔

قائداعظم ایک سے زیادہ مرتبہ کشمیر گئے۔ مئی 44ء میں ان کا دورۂ کشمیر آخری ثابت ہوا، جو انہوں نے کئی وجوہ کی بنا پر کیا۔

اولاً...... برصغیر کی سیاست میں برق رفتاری آ گئی تھی اور قائداعظم کچھ دیر آرام فرمانا چاہتے تھے۔

ثانیاً...... جموں وکشمیر کی 2 بڑی سیاسی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس نے انہیں دورے کی دعوت دی۔

قائداعظم کی خواہش تھی کہ کشمیری مسلمانوں کو متحد کیا جائے۔ اس وقت جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ عبداللہ تھے اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس تھے۔

قائداعظم متحدہ ہندوستان کے پہلے اور واحد لیڈر تھے جنہیں ریاست جموں وکشمیر کی دونوں سیاسی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس نے کشمیر کے دورے کیلئے بلایا تھا۔ یہی نہیں کشمیر حکومت کے وزیراعظم سر بینی گال نرسنگ راؤ نے بھی سرکاری سطح پر قائداعظم کو دعوت نامہ بھیجا۔ اس وقت مہاراجہ کشمیر سے باہر تھے۔

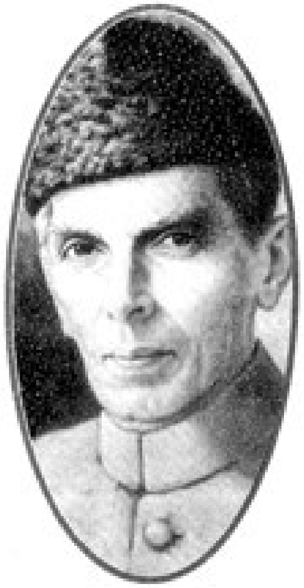

ثالثاً...... پاکستان کا جو تصور قائداعظم کے ذہن میں تھا یا تحریک پاکستان جسے پاکستان سمجھتی تھی، اس میں کشمیر ایک جزو لازم تھا۔ چونکہ یہ ایک الگ ریاست ہے اس لئے ریاستوں کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی طے کرنا ضروری تھا۔ میرے خیال میں قائداعظم کے دورۂ کشمیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

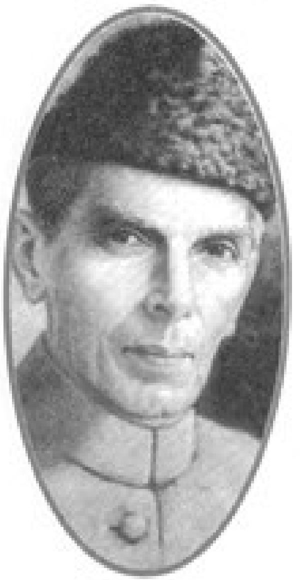

اپریل 1944ء کے آخر میں قائداعظم نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیالکوٹ اجلاس میں خضر حیات کو مسلم لیگ سے نکال دینے کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد قائداعظم لاہور واپس تشریف لائے۔ وہاں سے محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ سیالکوٹ سے سوچیت گڑھ کے راستے 8 مئی کو ریاست کی حدود میں داخل ہوئے تو سوچیت گڑھ سے جموں تک اور بعد میں جموں سے سرینگر تک عوام کا استقبال اتنا والہانہ تھا کہ ریاست کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی حالانکہ کانگریسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو' خان عبدالغفار خان' عبدالصمد اچکزئی اور پنجاب کے کانگریسی لیڈر اکثر گرمیاں گزارنے وہاں جاتے رہے لیکن ان کیلئے عوام نے دیدہ و دل اس قدر عقیدت و محبت سے کبھی فرش راہ نہ کئے جس قدر قائداعظم کیلئے ان کے جذبات ابل رہے تھے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ریاست جموں و کشمیر کا تھوڑا سا سیاسی پس منظر بھی بتاتا چلوں تاکہ حالات کا تجزیہ کرنے میں آسانی رہے کہ قائداعظم دورۂ کشمیر میں اتنے پرامید اور مطمئن کیوں دکھائی دیتے تھے۔

پہلی بات یہ تھی کہ دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ قریب نظر آرہا تھا اور یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ اتحادی طاقتیں جنگ جیت جائیں گی' نہ صرف یہ کہ حکومت برطانیہ کے اعلانات موجود تھے بلکہ قائداعظم کو اس کا یقین تھا کہ جنگ کے بعد حکومت برطانیہ کو ہندوستان خالی کرنا پڑے گا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر راج گوپال اچاریہ نے 43ء میں پاکستان کی سکیم کو اصولی طور پر تسلیم کرکے کانگریس پارٹی کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ قائداعظم کیلئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ ان کی مخالف پارٹی کے چوٹی کے ایک لیڈر نے اصولی طور پر ان کا مؤقف مان لیا تھا۔

علاوہ ازیں قرارداد لاہور کو پاس ہوئے صرف 4 سال ہوئے تھے۔ اس دوران تحریک پاکستان کو جو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ بھی ہر لحاظ سے اطمینان بخش تھی۔"

جناب کے ایچ خورشید مزید لکھتے ہیں: "میں انہی وجوہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ 44ء میں قائداعظم کا کشمیر آنا اور وہاں کی دونوں سیاسی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے استقبال بذات خود اس بات کی دلیل تھے کہ لوگ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ برصغیر کی سیاست میں قائداعظم کا کردار اہم ترین اور فیصلہ کن ہوگا۔ چنانچہ سوچیت گڑھ سے جموں تک اور جموں میں قیام کے بعد بانہال سے سرینگر تک قائداعظم کا جو شاندار استقبال کیا گیا وہ میرے خیال میں کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا' انہی دنوں میں یا اس کے کچھ عرصہ بعد ایک غیر ملکی مبصر نے لکھا تھا کہ اگرچہ گاندھی اور نہرو بیرونی دنیا میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں' لیکن حقیقت میں ہندوستان کے سیاسی سٹیج پر مقبول اور زوردار شخصیت صرف قائداعظم کی ہے۔"

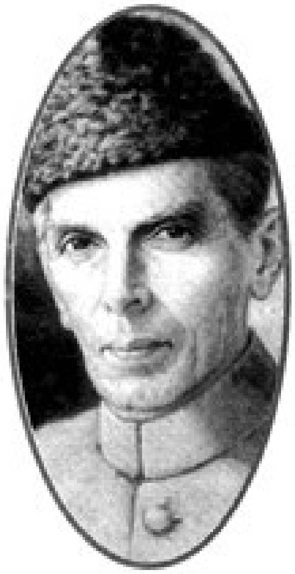

☆......☆......☆

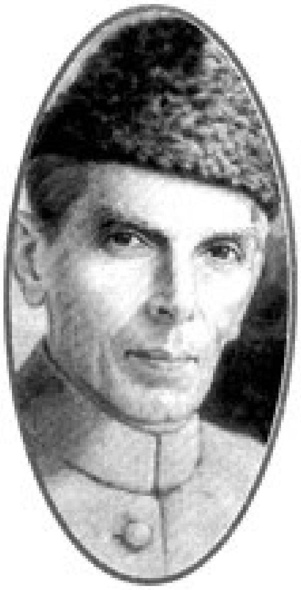

قائداعظم کا دورۂ کشمیر......2

قائداعظم کے دورۂ کشمیر کے سلسلے میں جناب کے ایچ خورشید مزید لکھتے ہیں:

قائداعظم لاہور سے سید مراتب علی کے مہمان کی حیثیت سے ان کی قرمزی رنگ کی شیورلیٹ میں روانہ ہوئے تھے۔ سید مراتب علی اور ان کے صاحبزادوں کو مسلم لیگ سے والہانہ عشق تھا۔ ان کا صاحبزادہ سید بابر علی ان دنوں طالب علم تھا اور مسلم لیگ کا شیدائی بھی۔
اس کار میں قائداعظم کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح، ان کا ذاتی ملازم گل محمد زریں گل بھی تھا جو موضع کرپلیاں امب دربند ضلع ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ ان کا قائم مقام پرائیویٹ سیکرٹری جیکوٹم ایگزیلوئرلوبو، ذاتی خدمتگار اور بیرا فلپ وغیرہ بس کے ذریعے سرینگر پہنچے۔ یہ دونوں اصحاب گوا کے عیسائی تھے۔

سرینگر میں استقبال کیلئے حکومت نے شرارتا بھی اور تصادم کو ٹالنے کی خاطر بھی نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کیلئے الگ الگ جگہیں مخصوص کیں۔ نیشنل کانفرنس کی کوشش تھی کہ اسے استقبال کرنے کا موقع پہلے ملے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس سے بیزاری کے

باعث شیخ عبداللہ کی اپیل پر عوام بڑی تعداد میں جمع نہیں ہو سکتے تھے' اس لئے انہوں نے حکومت سے مل ملا کر پرتاب پارک استقبال کرنے کیلئے مخصوص کرا لیا' ظاہر ہے لوگ قائداعظم کے شوق دیدار میں پہلے استقبالی مقام کو ترجیح دیتے' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مسلم کانفرنس کو وہاں سے ڈیڑھ دو میل دور ڈھل گیٹ کے مقام پر جگہ دی گئی جہاں کھلا میدان بھی نہ تھا' یہ سب کچھ یہ تاثر دینے کیلئے کیا گیا تھا کہ مسلم کانفرنس کے حامی کم تعداد میں ہیں۔

قائداعظم کی سواری اللہ اکبر اور زندہ باد کے پرجوش نعروں میں جابجا بنی ہوئی محرابوں میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پرتاب پارک میں نیشنل کانفرنس کی طرف سے شیخ عبداللہ نے سپاسنامہ پڑھا۔ قائداعظم نے اپنی مختصر سی تقریر میں ایک تاریخی بات کہی جس پر نیشنلسٹ لیڈر بہت بھنائے۔

انہوں نے فرمایا: "آپ نے استقبال میری ذات کا نہیں بلکہ اس لئے کیا ہے کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہوں۔"

جناب کے ایچ خورشید لکھتے ہیں: "نہر کے کنارے کشمیر مسلم سٹوڈنٹس یونین نے بھی استقبال کیا' میں اس کا جنرل سیکرٹری تھا۔ مسلم کانفرنس کے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین میر واعظ محمد فاروق کے والد مولوی محمد امین مرحوم اور جموں سے کشمیر اسمبلی کے ممبر شیخ محمد امین تھے۔ مسلم کانفرنس کے نمایاں لیڈر چودھری غلام عباس' میر واعظ محمد یوسف شاہ صاحب اور اے آر ساغر تھے۔ قائداعظم نے یہاں بھی مختصر سی تقریر فرمائی اور کشمیری مسلمانوں کو یہی پیغام دیا۔

"ہمارا خدا ایک' رسولؐ ایک' کتاب ایک اور دین ایک ہے' تو ہماری تنظیم اور قائد بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔"

شروع میں قائداعظم کا قیام سرینگر شہر سے تقریباً چھ میل دور مغل شہنشاہ شاہجہاں

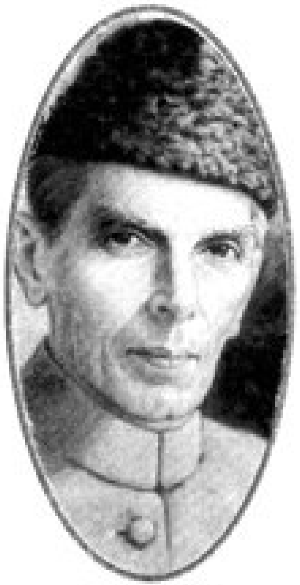

کے تعمیر کردہ باغ "نشاط باغ" اور چشمہ شاہی کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک خوش نما بنگلے "کوشک" میں تھا۔ یہ کوٹھی سید مراتب علی کی تھی۔ ان دنوں کشمیر میں موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے' شہر سے دور ہونے کے باعث قائداعظم کو چند روز قدرے آرام کے میسر آگئے۔ پھر بھی سیاسی کارکنوں' رہنماؤں اور اخبار نویسوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

میں یہاں بعض حلقوں کے اس پراپیگنڈے کی سختی سے تردید کرتا ہوں کہ شیخ عبداللہ قائداعظم کے نزدیک آنا چاہتے تھے لیکن بعض لوگوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس سلسلے میں میرے نکتہ چیں یہ بھی کہہ جاتے ہیں' چونکہ خورشید قائداعظم کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا' اس لئے شیخ عبداللہ اور قائداعظم کے درمیان ملاقات میں رکاوٹ بنا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ "کوشک" میں قائداعظم اور شیخ عبداللہ کے درمیان نصف درجن سے زائد ملاقاتیں ہوئیں بلکہ کچھ عرصہ ان کے درمیان خط و کتابت بھی رہی تھی۔ "کوشک" میں ان ملاقاتوں کے دوران قائداعظم کی گاڑی بھی خراب ہوئی اور شیخ عبداللہ وہ گاڑی سرینگر کے رجب موٹر مکینک کی ورکشاپ میں لے گئے اور محمد رجب سے اس کی مرمت کرائی۔ رہا یہ الزام کہ میں ان ملاقاتوں میں حائل رہا تو "کوشک" میں قائداعظم کے قیام کے دوران میں ابھی ان کا پرائیویٹ سیکرٹری نہیں ہوا تھا بلکہ یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں تھی کہ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا۔ اس دوران "کوشک" میں' میں صرف دو تین مرتبہ جاسکا۔ جو لوگ قائداعظم کو جانتے ہیں یہ بات ان کی سمجھ میں اچھی طرح آسکتی ہے کہ انہوں نے کبھی ذاتی وجوہ پر یا ذاتی پسند و ناپسند پر فیصلے نہیں کیے۔

☆......☆......☆

قائداعظم ”کشمیر میں چھٹیاں مناتے ہوئے“ تصویر میں ان کی بیٹی دینا‘
نوابزادہ لیاقت علی خاں اوران کی بیگم بھی نظر آرہی ہیں

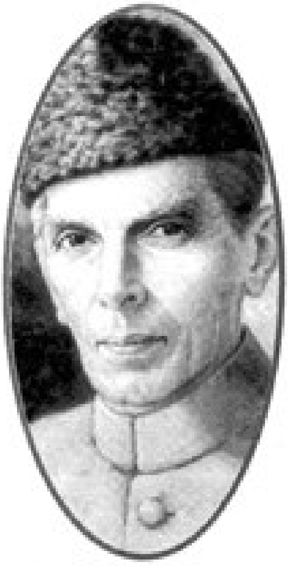

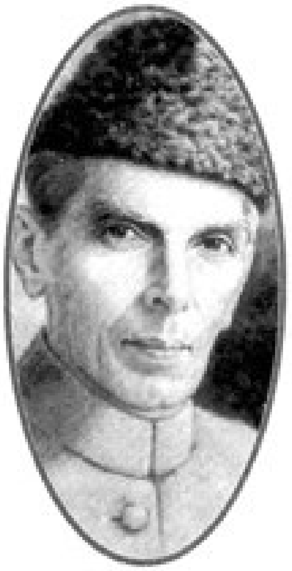

قائداعظم کا دورۂ کشمیر......3

بانی پاکستان کے دورۂ کشمیر کی یادیں...... جناب کے ایچ خورشید...... لکھتے ہیں:

17 جون 1944ء کو سرینگر کی جامع مسجد سے متصل مسلم پارک میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو بے نقاب کر دیا۔

قائداعظم نے فرمایا: ”شیخ عبداللہ چاہتے تھے یہ تاثر دیا جائے کہ جس طرح ہندو کانگریس مسلمانوں کو برصغیر میں نیشنلزم کے نام پر دھوکہ دے رہی ہے اور اس طرح سے ہندو اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، میں بھی کشمیر میں نیشنلزم کے نام پر ہندو اقلیت کو دھوکہ دے کر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔“

اس پر قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو جو جواب دیا تھا وہ بھی جلسے میں دہراتے ہوئے فرمایا:

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہندوستان میں ایک اصول پر عمل کروں اور کشمیر میں کوئی دوسرا اصول اختیار کروں اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہندو لیڈر جو برصغیر کے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں کیا وہ تمہیں دھوکہ نہیں دے رہے۔“

یہ تو تقریر کی بات تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ملاقات میں قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو یہاں تک کہہ دیا تھا: "عبداللہ تم میرے بچوں کے برابر ہو' تم ہندوؤں کو نہیں جانتے' میرا ساری عمران سے واسطہ رہا ہے۔ میں ان کی ذہنیت' ان کے مقاصد' ان کے تعصبات اور ان کے تصورات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ عبداللہ تم دھوکہ کھاؤ گے' باز آجاؤ اور مسلم کانفرنس کا ساتھ دو۔"

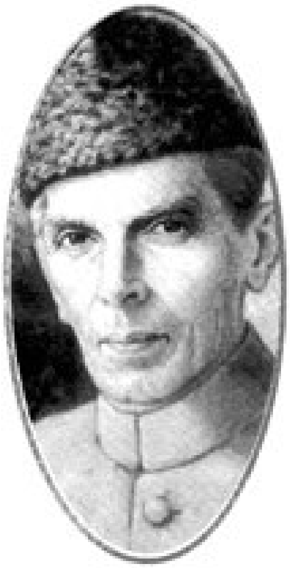

یہ اجلاس اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ مسلم کانفرنس کا یہ واحد اجلاس تھا' جس سے قائداعظم نے خطاب فرمایا۔ دوسرے اس سے بڑا اجتماع کسی سیاسی جماعت کے سالانہ اجلاس میں بھی اس سے قبل نہیں ہوا تھا' جس میں سرینگر کے باہر سے بھی مندوبین اور مشتاقان دید آئے تھے۔ پونچھ' میرپور' مظفرآباد' گلگت' جموں' لداخ اور صوبہ کشمیر سے بھی لوگ آئے۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ایک لاکھ افراد اس میں شریک ہوئے۔ کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار کسی جلسے میں عورتیں بھی شریک ہوئیں۔ ان کی تعداد ہزار دو ہزار کے درمیان تھی اور ان کیلئے پردے کا انتظام تھا۔ یہ بھی اطلاع تھی کہ سرینگر کے تمام سرکاری ملازم مسلم پارک کے اردگرد پرائیویٹ مکانوں میں قائداعظم کی تقریر سن رہے تھے۔ اس کا تاثر اتنا گہرا ہوا کہ بہت سارے ڈھل مل یقین اور غیر جانبدار قسم کے مسلمان پاکستان کے حامی بن گئے۔ یہاں تک کہ نیشنل کانفرنس میں بھی پاکستان کا حامی گروپ پیدا ہو گیا۔

شیخ عبداللہ جس نے قائداعظم کو ہندوستان کے مسلمانوں کا لیڈر کہہ کر استقبال کیا تھا اور کشمیر کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ بھی کیا تھا' قائداعظم کے اس اظہار حقیقت پر وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نظروں میں بے نقاب ہو گیا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پایا تو وہ چیخ اٹھا۔ اس نے کہا "یہ جو باہر سے لوگ آتے ہیں' انہیں کشمیر کی سیاست میں دخل اندازی کا کیا حق ہے۔ مسٹر جناح کو چاہئے کہ وہ کشمیر چھوڑ کر چلے جائیں۔"

شیخ عبداللہ بھول گئے کہ قائداعظم کو دورۂ کشمیر کی دعوت انہوں نے بھی دی تھی۔

اس کے نو سال بعد صاحب فراست قائداعظم کے الفاظ حقیقت ثابت ہوئے۔ جب شیخ عبداللہ کے سیاسی باپ پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں لات مار کر وزارت عظمیٰ کی گدی سے جیل میں پھینک دیا۔ کشمیر کی مخصوص پوزیشن اور شیخ صاحب سے کیے گئے تمام وعدے ختم کردیئے۔ بھارتی آئین کی خاص دفعہ 370 کے تحت کشمیر بھارت کے پبلک سروس کمیشن سپریم کورٹ اور آئین ساز اسمبلی سے باہر تھا۔ اس کا پرچم' ترانہ' زبان اور ریڈیو بھی بھارت سے الگ تھا۔ نہرو نے اس دفعہ میں ترمیم کردی۔ اور یہاں سے بھارت کا یہ راگ شروع ہوا کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے۔

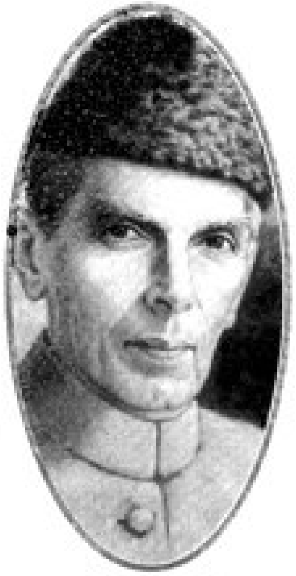

"کوشک" میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد قائداعظم سرینگر میں عجائب گھر کے قریب لال منڈی گھاٹ پر کوئین الزبتھ نامی ہاؤس بوٹ میں منتقل ہوگئے۔ اس ہاؤس بوٹ کے ساتھ ایک ڈونگا شکارا تھا۔ ڈونگا ہاؤس بوٹ سے ہلکی اور چھوٹی کشتی ہوتی ہے' اس میں عام طور پر کچن بھی ہوتا ہے جو ملازموں اور باورچیوں کے کام آتا ہے جبکہ ہاؤس بوٹ میں رہائشی کمرے اور خواب گاہیں ہوتی ہیں۔ شکارا ہلکی پھلکی کشتی کا نام ہے جسے ایک آدمی بھی چپو سے چلا سکتا ہے۔ یہ عموماً شام کو ہواخوری اور دریا یا جھیل کی سیر کیلئے ہوتی ہے' جبکہ ہاؤس بوٹ کو کھینچنے کیلئے چھ سے بارہ ہانجی چاہئیں۔ کوئین الزبتھ سرینگر کے پہلے پل امیراکدل کے قریب واقع تھی اس لئے یہاں آکر قائداعظم کی مصروفیات بڑھ گئیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ لوگ آنے جانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

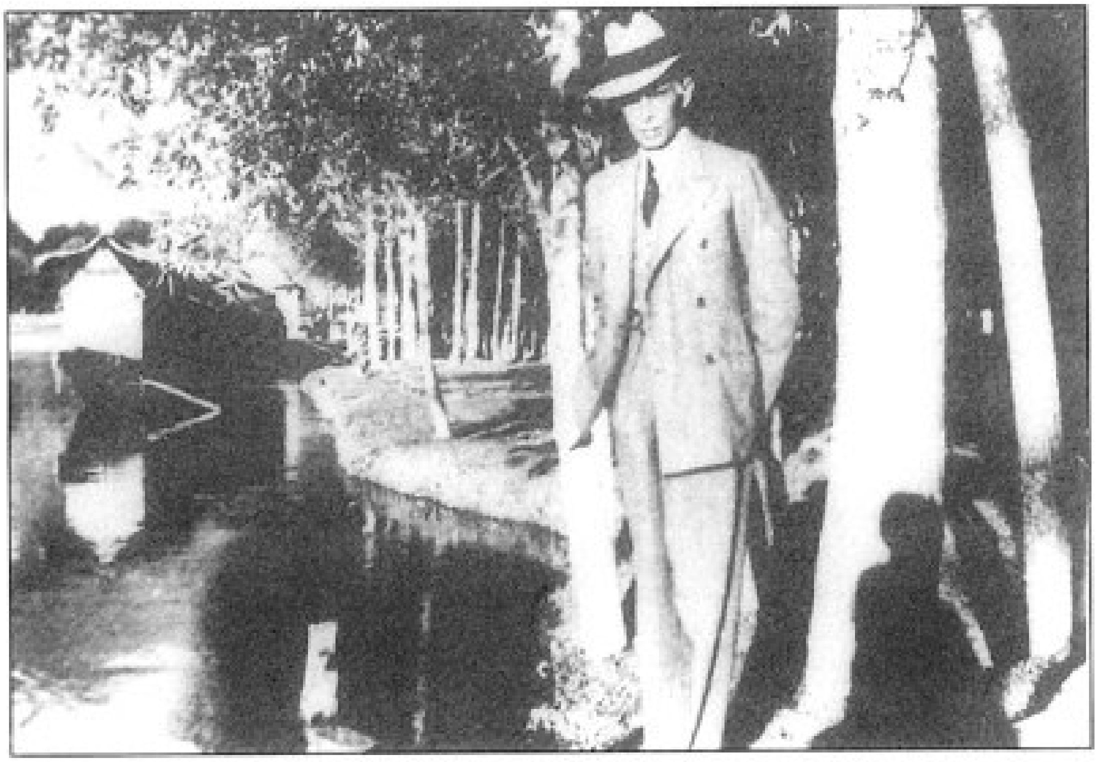

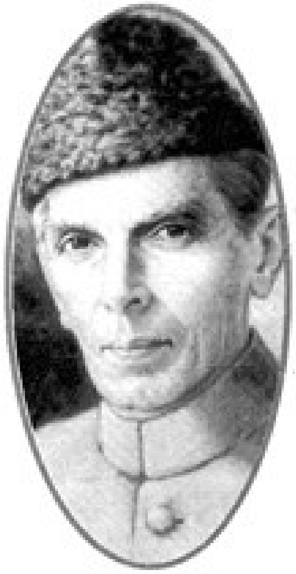

قائداعظم ” جھیل کے ایک خوشنما منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، تصویر میں کشتی بھی نظر آرہی ہیں

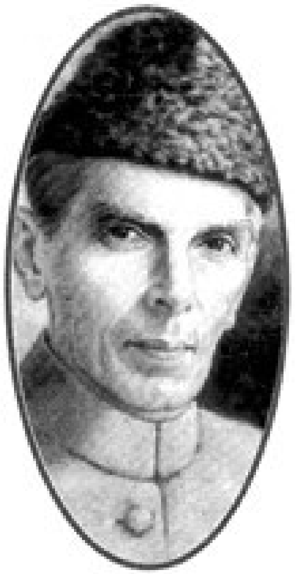

قائداعظم کا دورۂ کشمیر 4

تذکرہ ہے قائداعظم کے دورۂ کشمیر کا۔ راوی ہیں جناب کے ایچ خورشید۔ کہتے ہیں:

تحریک پاکستان کے پُرجوش اور مخلص کارکن محمد اسماعیل ساغر میرے دوست تھے۔ وہ مسلمانوں کی نیوز ایجنسی اورینٹ پریس آف انڈیا کی سرینگر میں نمائندگی کرتے تھے۔ کام رضاکارانہ ہی تھا۔ قائداعظم کے کوئین الزبتھ میں منتقل ہونے کے بعد ساغر صاحب مصر ہوئے کہ میں ان کی جگہ اورینٹ پریس کیلئے کام کروں کیونکہ قائداعظم اکثر انگریزی میں بیان دیتے تھے اور ساغر صاحب کو اس کا زیادہ محاورہ نہیں تھا۔

"کوشک" چونکہ ہمارے گھر سے دور تھی' اس لئے وہاں میں دو تین مرتبہ ہی جا سکا تھا' لیکن ہاؤس بوٹ میں روزانہ قائد سے ملاقات ہونے لگی۔ دریا کے دوسرے کنارے میری رہائش محلہ آبی گزر میں تھی' کشتی کے ذریعے دریا پار کرنے میں صرف دو پیسے خرچ ہوتے تھے۔

میری بدقسمتی کہ حالاتِ حاضرہ پر ہرچند کوشش کے باوجود قائداعظم سے کوئی بیان یا تبصرہ حاصل نہ کر سکا۔ البتہ ان کی اتنی مہربانی تھی کہ میں جب بھی پہنچتا شفقت سے پیش آتے'

تھوڑی دیر کے لئے مقامی حالات اور خبروں پر تبصرہ فرماتے۔ ایک روز میں نے موقع پا کر ان کا بیان لینے پر اصرار کیا تو فرمایا: "جب بھی ایسا موقع آیا میں سب سے پہلے آپ ہی کو بیان دوں گا۔"

اس زمانے میں کانگریس کے بیشتر لیڈر ابھی جیل میں ہی تھے، لیکن گاندھی رہا ہو چکے تھے۔ قائداعظم اکثر دریافت فرماتے "گاندھی کیا کر رہے ہیں" ایک روز میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے پاس باہر سے تازہ ترین خبریں آنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور گاندھی کی مصروفیات کے بارے میں ہماری معلومات صرف اخبارات تک محدود ہیں۔ اس زمانے میں سرینگر سے ایک دو روزنامے ہی نکلتے تھے۔ ان میں ممتاز اخبار پنڈت پریم ناتھ بزاز کا "ہمدرد" تھا۔ بزاز صاحب کا تعلق روس نواز کامریڈ ایم این رائے سے تھا، مگر یہ تمام اخبار آل انڈیا ریڈیو کی خبریں نقل کیا کرتے تھے۔ لاہور اور دہلی کے اخبار دو ایک روز تاخیر سے پہنچتے تھے۔ ان میں لاہر ٹریبون، ملاپ، زمیندار، انقلاب اور احسان شامل تھے۔ ڈان اور سٹیٹس مین دہلی سے آتے، اس لئے قائداعظم بھی خبروں کے معاملات میں تشنہ ہی رہتے۔

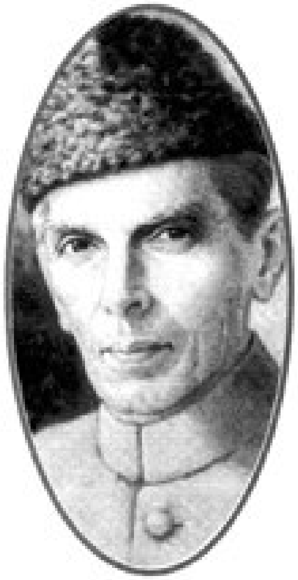

افسوسناک بات یہ ہوئی کہ قائداعظم نے مجھے جو پہلا اخباری بیان دیا وہ نواب بہادر یار جنگ کی وفات کے متعلق تھا۔ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے صرف انگریزی اور ہندوستانی بلیٹن جاری ہوتے تھے۔ 27 جون کی صبح آٹھ بجے میں نے ہندوستانی بلیٹن سے نواب صاحب کے انتقال کی خبر سنی تو قائداعظم سے تعزیتی بیان لینے کے لئے جلدی میں تیار ہو کر کوئین الزبتھ پہنچا۔ بیرے نے بتایا کہ قائداعظم ناشتہ کر رہے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم میں انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد قائداعظم تشریف لائے۔ حسب معمول ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پوچھا: "سناؤ بھئی، آج کیا خبر ہے؟"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے ریڈیو نہیں سنا۔ میں نے عرض کیا آج میں بہت بری خبر لایا ہوں، جیسا کہ آج صبح آل انڈیا ریڈیو نے اعلان کیا ہے۔ "کل رات حیدر آباد دکن میں

نواب بہادر یار جنگ کا انتقال ہو گیا۔"

یہ سنتے ہی قائداعظم کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی' جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ اس دوران سگریٹ کا کش بھی نہیں لگا سکے' بیس پچیس سیکنڈ بعد انہوں نے سکوت توڑا' لیکن بات بڑی غیر متوقع کی' وہ بولے "مجھے اس کا یقین نہیں۔" میں خاموش رہا۔ اتنا عرض کیا کہ یہ آل انڈیا ریڈیو کی خبر ہے جو غلط نہیں ہو سکتی۔ اس پر انہوں نے فرمایا: "خود میرے بارے میں آل انڈیا ریڈیو سے ایسی خبر نشر ہو چکی ہے اور سندھ اسمبلی نے میرے متعلق تعزیتی قرارداد بھی پیش کر دی تھی۔" اس پر میں لاجواب ہو گیا۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ جناح تشریف لائیں' میں نے انہیں بھی خبر سنائی تو انہوں نے ایک وکیل کی طرح پوچھنا شروع کر دیا' وہ کہاں تھے؟ کیوں گئے تھے؟ کیا وقت تھا؟ کس نے اطلاع دی؟ کیا بیماری تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آل انڈیا ریڈیو کی خبر صرف دو تین جملوں پر مشتمل تھی' جس میں اتنا کہا گیا تھا: "آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ کل شام حیدر آباد دکن میں انتقال کر گئے۔ وہ کل شام ہی ایک استقبالیے سے واپس آ رہے تھے کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔"

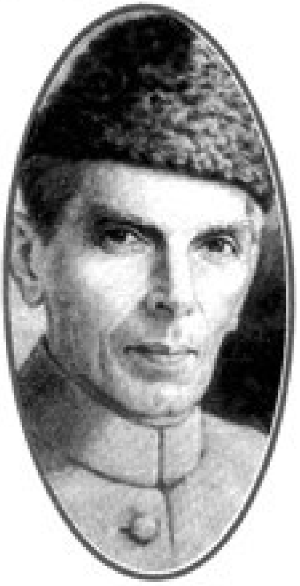

آل انڈیا ریڈیو نے اس کے علاوہ اور کوئی تفصیل نہ دی تھی۔ اس لئے میں محترمہ کو مزید کچھ بتانے سے قاصر تھا نتیجہ یہ ہوا کہ قائداعظم نے خبر کی تصدیق نہ ہونے تک تعزیتی بیان دینے سے انکار کر دیا۔

☆......☆......☆

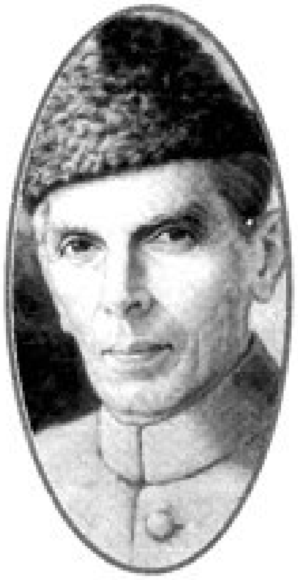

قائداعظمؒ دورہ کشمیر کے دوران جھیل کنارے

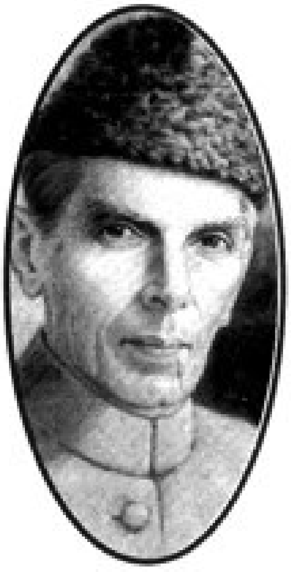

قائداعظم کا دورۂ کشمیر......5

جناب کے ایچ خورشید قائداعظم کے دورۂ کشمیر کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ کی وفات کی خبر ملنے کے روز امیر اکدل بازار میں میری ملاقات چودھری غلام عباس اور اے آر ساغر سے ہوئی۔ انہیں بھی نواب صاحب کی وفات کا علم نہیں تھا' بلکہ وہ تو جموں کیلئے پابہ رکاب تھے۔ میں نے چودھری صاحب کو بتایا کہ میں اس خبر پر تعزیتی یا تردیدی بیان لینے دوبارہ قائداعظم کے پاس جارہا ہوں۔ چودھری صاحب' ساغر صاحب اور میں ہم تینوں قائداعظم کے پاس ہاؤس بوٹ پہنچے تو ان کے پاس چار پانچ تار آچکے تھے۔ تار بھیجنے والوں میں آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل مسٹر محمود الحسن صدیقی' ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا اور نواب بہادر یار جنگ کی بیگم بھی تھیں۔ خبر کی تصدیق ہو جانے پر قائداعظم آزردہ دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کیا تھی؟ وہ تو بہادر یار جنگ کی ذات ہی تھی' پھر انہوں نے اپنے سیکرٹری مسٹر لوبو کو بلا کر اسے اپنا تعزیتی بیان لکھوایا۔ ان کا سیکرٹری بیان ٹائپ کرنے اندر گیا تو وہ حسب

معمول مختلف موضوعات پر تبصرہ فرمانے لگے۔ انہوں نے چودھری غلام عباس کو مشورہ دیا کہ وہ کشمیری زبان سیکھیں۔ چودھری صاحب جموں کے مکین تھے۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد جو وادیٔ کشمیر میں رہتی تھی' ان کی مادری زبان کشمیری تھی۔ قائداعظم کے اس مشورے پر چودھری صاحب کہنے لگے: "میں بوڑھا ہو چکا ہوں' اس عمر میں کیسے زبان سیکھوں گا۔"

چودھری صاحب کی عمر اس وقت 40 برس تھی۔ جواب میں قائداعظم نے اپنی مثال دی جب وہ تقریباً 56 برس کی عمر میں ایک ضمنی انتخاب کے سلسلے میں بنگال گئے جہاں سر عزیزالحق امیدوار تھے۔ قائداعظم فرما رہے تھے: "جب میں وہاں پہنچا تو مجھے وہاں کے لیڈروں نے مشورہ دیا کہ آپ تو انگریزی میں تقریر کریں گے اور یہاں کے لوگ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتے' لہٰذا آپ اردو میں تقریر کریں۔ میں نے اسی وقت اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں تقریر کر کے اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا' وہ دن اور آج کا دن میں نے اردو بہتر ہی کی ہے' آپ تو نوجوان ہیں۔ آپ کو کشمیری زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔ آپ ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں جو 6 ماہ جموں میں اور 6 ماہ کشمیر میں بیٹھتی ہے۔ آپ تو آسانی سے کشمیری سیکھ سکتے ہیں۔"

چودھری صاحب چلے گئے اور میں بیان کی ٹائپ شدہ کاپی لینے کیلئے رکا رہا۔ اس موقع پر قائداعظم نے میری فیملی اور اس کے مالی حالات دریافت کرنے کے بعد فرمایا: "آپ میرے ساتھ بمبئی کیوں نہیں چلے جاتے۔" میں نے عرض کیا: "میں سوچوں گا۔" ارشاد ہوا: "آپ سوچیں اور جتنی دیر میں سرینگر میں ہوں آپ عارضی طور پر آجایا کریں۔"

جنگ عظیم کی وجہ سے کمبلوں کی بڑی مانگ تھی' میرے ایک دوست نے مجھے یونہی مشورہ دیا تھا کہ ہم بھی مل کر کمبلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے اگلے روز میں نے قائداعظم سے عرض کیا: "میں کمبلوں کے کاروبار کے متعلق بھی سوچ رہا ہوں۔" وہ بہت خوش ہوئے: "ہاں' ہاں مسلمان کو کاروبار میں بھی آنا چاہیے۔"

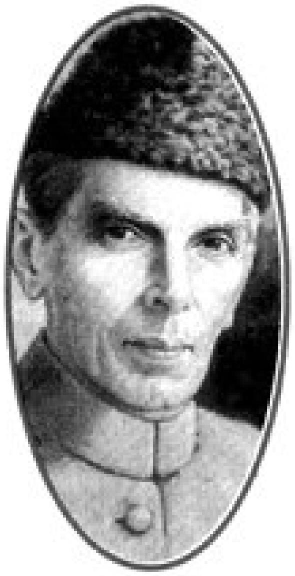

انہوں نے میری خواہش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور 5 منٹ تک اسی موضوع پر ہدایات دیتے رہے' پھر فرمایا: ''جب یہ کاروبار شروع کرو گے' مجھے بھی کمبل بھیجنا' میں آپ کا کارخانہ بھی دیکھوں گا۔'' میں نے عرض کیا: ''ہمارا کارخانہ تو کوئی نہیں' یہ تو ابھی ایک سوچ ہے' جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا ہے۔''

میں نے امتحان دے رکھا تھا لہٰذا چھٹیوں کے باعث میں قائداعظم کے ہاں عارضی طور پر کام کرنے کیلئے راضی ہو گیا۔

یکم جولائی کو قائداعظم ریاستی وزیراعظم کی دعوت پر سرکاری مہمان کے طور پر 15 روز کیلئے سرکاری گیسٹ ہاؤس نمبر 4 میں منتقل ہو گئے جو سرینگر میں اس نہر کے کنارے واقع ہے جو جھیل ڈل کو دریا سے ملاتی ہے۔ قائداعظم نے کہا میں یکم جولائی سے ان کے دفتر میں روزانہ تین گھنٹے عارضی طور پر کام کروں تاکہ اردو خط و کتابت اور اخبارات کے سلسلے میں ان کی معاونت ہو سکے۔

قائداعظم پہلے 5 منٹ کشمیر' ہندوستان اور گاندھی کے متعلق گفتگو فرماتے' پھر مجھے اردو کے خطوط دیتے جو میں انہیں پڑھ کر سناتا' بعض خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کو کہتے' میں وہ خط ترجمہ کر کے ان کے سیکرٹری کو دے دیتا۔ سب سے پہلا خط جو میں نے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا وہ گاندھی کا تھا۔

اس زمانے میں جنگ کی وجہ سے پٹرول کی راشننگ تھی' میں پرمٹ بنوانے بھی جاتا' یا پھر باہر کے وہ کام انجام دیتا جو ان کے ملازم عدم واقفیت کی بنا پر نہیں کر سکتے تھے۔

☆......☆......☆

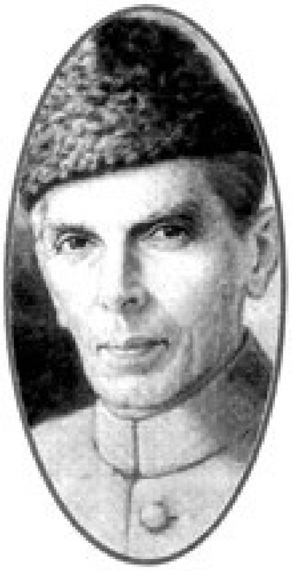

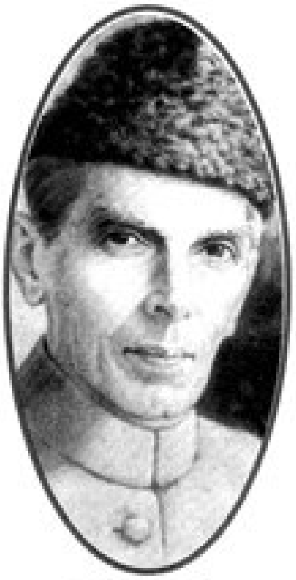

قائداعظم کا دورۂ کشمیر......6

جیسا کہ ہم قائداعظم کے دورۂ کشمیر کا تذکرہ کر رہے تھے‘ جناب کے ایچ خورشید لکھتے ہیں:

قائداعظم کا معمول تھا کہ اخبارات کا مطالعہ اتنی تفصیل سے فرماتے کہ اشتہارات تک پڑھ جاتے‘ برطانوی حکومت کے اعلانات و بیانات‘ برطانوی دارالعوام کے بحث مباحثے‘ کانگریسی لیڈروں کے بیانات اور دیگر ہندوستانی لیڈروں کی سرگرمیاں ان کے زیر نظر ہوتیں۔ وہ ہر اہم خبر پر اپنے قلم سے نشان لگا دیتے اور بعد میں ہم لوگ اسے کاٹ کر کاغذ پر چپکا دیتے۔

مہمانوں اور وفود سے قائد صبح کے وقت ملتے تھے۔ دوپہر کے وقت آرام فرماتے‘ شام کو سیر کیلئے ضرور تشریف لے جاتے۔ دریا کے کنارے بند پر کار چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے قائداعظم پیدل ہی سیر کرتے‘ بعض اوقات شکارے پر سیر کو جاتے۔ پکنک منانے کیلئے گلمرگ بھی تشریف لے گئے۔ وہاں گھوڑے کی سواری بھی کی۔ جب کوئی چیز خریدنا ہوتی تو مسلمان کی دکان سے خریدتے جس سے اس دکاندار کی خوب شہرت ہوتی۔ وہیں سے قائد نے چاندی کے چمچے‘ چھریاں اور کانٹے بھی بنوائے۔

قائداعظم کے اس دورۂ کشمیر سے وہاں تحریک آزادی کو جو زبردست تقویت پہنچی، اس کی تفصیلات میں جانے سے قبل ان کے دورے سے پہلے کے حالات پر مختصراً روشنی ڈالتا جاؤں تاکہ ان کے دورے کے تاثرات صحیح طور پر پرکھنے میں آسانی رہے۔

کشمیری مسلمانوں نے 1932ء میں مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس میں شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس اور دیگر بڑے لیڈر شامل تھے۔ کانگریسی لیڈر برصغیر کے مسلمانوں کے ارادے بھانپ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے کشمیر پر مختلف انداز میں یلغار شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ہر سال موسم گرما میں کانگریسی لیڈروں کے علاوہ نام نہاد سوشلسٹ، نام نہاد کمیونسٹ اور کانگریس کے کرائے کے ٹٹو مختلف لبادوں میں کشمیر آتے۔ ان لوگوں نے شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ 38ء میں ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 39ء میں مسلم کانفرنس ختم کر دی گئی۔ صرف میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ صاحب اس سے الگ رہے۔ علاوہ ازیں تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک گروپ نے بھی یہ فیصلہ قبول نہ کیا۔ 40ء میں جب قرارداد لاہور منظور ہوئی تو اس وقت ریاست جموں و کشمیر میں مسلم کانفرنس کا وجود نہیں تھا۔ البتہ انفرادی طور پر بعض لوگ نجی محفلوں میں پاکستان کی حمایت میں گفتگو کرتے تھے۔

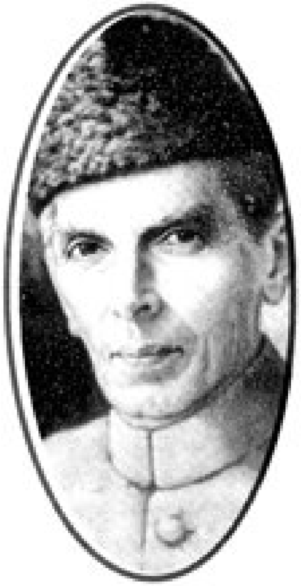

کشمیر میں جس تنظیم نے سب سے پہلے پاکستان کی آواز بلند کی، وہ جموں و کشمیر سٹوڈنٹس یونین تھی۔ 40، 41ء کے زمانے میں کچھ علی گڑھ پلٹ نوجوانوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی، لیکن چند ہی ماہ بعد وہ سب کے سب سرکاری ملازمت میں لے لئے گئے۔ اس دوران مسلم سٹوڈنٹس یونین ہی تھی جو سری نگر میں اجتماعات اور پبلسٹی کے ذریعے پاکستان اور قائداعظم کی حمایت میں شیخ محمد عبداللہ کے غنڈوں کا مقابلہ کرتی رہی۔

مسلم سٹوڈنٹس یونین 40ء میں بنی۔ میں اس کا بانی سیکرٹری تھا' پہلے صدر مسٹر احمد اللہ رعنا' دوسرے خواجہ علی محمد پاکستانی ہوئے۔ ورکنگ کمیٹی میں احمد بشیر جو اس وقت جناح ہی تخلص رکھتے تھے' خواجہ حبیب اللہ گکرو' میر عبدالعزیز (ایڈیٹر انصاف)' خواجہ غلام حسن سنگین' خواجہ غلام نبی بٹ' سردار محمد اکرم ایڈووکیٹ (مظفر آباد) وغیرہ شامل تھے۔

اس دوران رائے عامہ کے دباؤ میں آکر 42ء میں چند ساتھیوں کی معیت میں چودھری غلام عباس نے مسلم کانفرنس کی ازسرنو تنظیم کی۔ بعد میں میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ صاحب بھی اس میں شامل ہوگئے جس سے وادیٔ کشمیر میں مسلم کانفرنس کو تقویت پہنچی' کیونکہ ریاست کے تمام مسلمان میر واعظ کا دلی احترام کرتے تھے اور کشمیر کیلئے ان کی ملی' سیاسی اور تعلیمی خدمات انمٹ ہیں۔ 1931ء میں کشمیر میں عوامی تحریک چلی تو میر واعظ نے شیخ عبداللہ کو جو اس وقت سکول ماسٹر تھے' عوام سے روشناس کرایا تھا۔

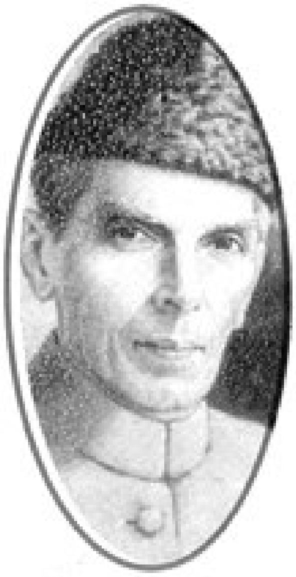

☆......☆......☆

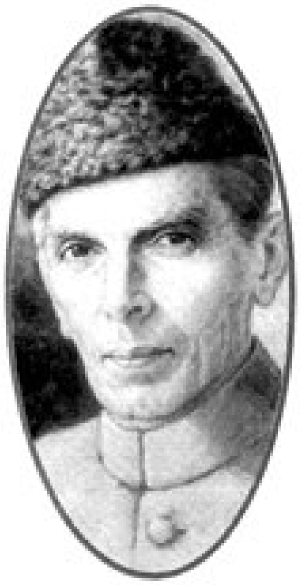

قائداعظمؒ محترمہ فاطمہ جناح، بیگم لیاقت علی خاں اور لیاقت علی خاں گھڑسواری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

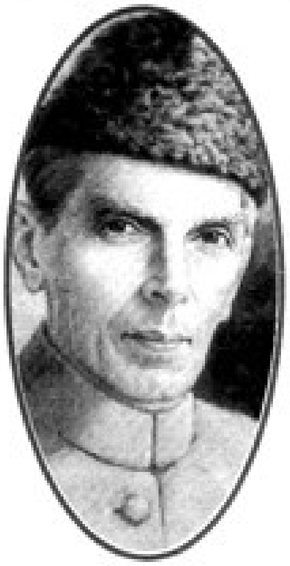

قائداعظم کا دورۂ کشمیر......7

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید مزید لکھتے ہیں:

"قائداعظم نے ریاستی اخبار نویسوں' طلبہ اور سیاسی اصحاب سے جو ملاقاتیں کیں ان کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ یہاں تک کہ کشمیری برہمنوں میں ایک طبقہ جس کی لیڈرشپ پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ہاتھ میں تھی' پاکستان کا حامی بن گیا اور اس نے علی الاعلان مطالبۂ پاکستان کی حمایت شروع کر دی۔ یہ گروپ مختصر لیکن مؤثر تھا۔ سوشلسٹ مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کے باعث تعلیم یافتہ طبقہ پر اس کی گرفت تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کے تمام بڑے بڑے لیڈر' جو مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے' جن میں شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس بھی شامل تھے' پنڈت پریم ناتھ بزاز سے بہت متاثر تھے۔ سیاسی اختلافات کے باوجود نجی طور پر یہ دونوں اصحاب پنڈت بزاز سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ پنڈت صاحب دوسرے ہندو لیڈروں کی نسبت آزاد خیال' روشن دماغ اور جمہوری افتاد طبع کے انسان تھے اور کشمیری عوام میں اجتماعی سیاسی بیداری پیدا کرنے میں پنڈت صاحب کا کردار نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

قائداعظم کے وہاں قیام اور ملاقاتوں کا یہ اثر ہوا کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز رفتہ رفتہ اس قدر پاکستان کے حامی بن گئے اور شیخ عبداللہ سے ان کے اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ ایک دفعہ شیخ عبداللہ نے پنڈت بزاز پر قاتلانہ حملہ کرادیا۔ پاکستان وجود میں آنے پر جب بزاز صاحب کو گرفتار کیا گیا تو پولیس کی گاڑی میں سوار ہونے سے قبل انہوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔“

یہ عنصر جو قائداعظم کے دورہ کشمیر کے نتیجے میں پاکستان کا حامی بن چکا تھا کانگریس اور ہندوستانی حکومت نے اسے دبانے‘ خریدنے اور لالچ دینے کی ہزار کوششیں کیں‘ لیکن بے سود۔ پاکستان کو بدنام کرنے کیلئے کانگریس کے پاس بڑا حربہ یہ تھا کہ اسے فرقہ پرستانہ ‘متعصب‘ رجعت پسندانہ اور مذہبی جنونیوں کا مطالبہ کہا جاتا‘ حالانکہ مسلمانوں کا مطالبہ آزادانہ رائے شماری کروانے کا تھا اور آج بھی ہے اور اس رائے شماری میں ہر غیر مسلم باشندے کو بھی اپنا نظریاتی پرچار کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس کیلئے اس مطالبہ کو فرقہ وارانہ کہنا حماقت تھی۔

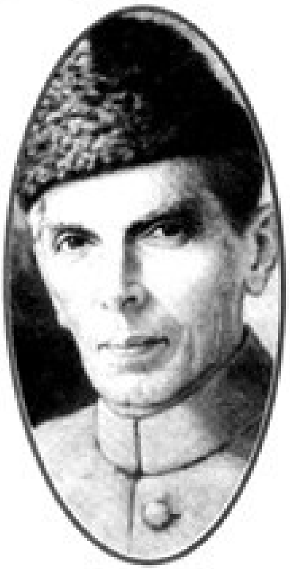

قائداعظم کے اس دورے کے دوران نوابزادہ لیاقت علی خان‘ قاضی محمد عیسیٰ‘ محمد ہاشم گذور اور مسلم لیگ کے کچھ دوسرے مرکزی رہنما چند دنوں کیلئے کشمیر آئے۔ ان لیڈروں کی آمد بھی کشمیر میں پاکستان کے حامیوں کی اخلاقی قوت بڑھانے کا باعث بنی اور مختلف پرائیویٹ اجتماعات اور استقبالیوں میں لوگ قائداعظم کے نظریات وافکار سے مستفید ہوتے رہے۔

سرینگر کے ایک مشہور تاجر خواجہ غلام احمد جیولر نے قائداعظم کے اعزاز میں شہر کے مشہور امر سنگھ کلب کے لان میں عصرانہ دیا‘ جس میں کشمیر کی تمام سیاسی وغیر سیاسی‘ مسلم اور غیر مسلم ممتاز شخصیتیں اور نیشنل کانفرنس کے تمام لیڈر‘ ہندو تنظیموں کے رہنما اور ہندو اخبار نویس بھی موجود تھے۔ جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا کہ مہمان خصوصی کا تعارف مدعوئین سے کرایا جاتا‘ چائے پینے کے بعد قائداعظم مہمانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے گئے اور ان سے مصافحہ کیا۔

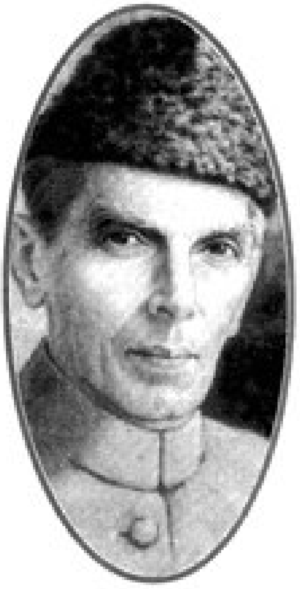

سناتن دھرم سبھا کے لیڈر پنڈت جیالال کلم (جو بعد میں کشمیر ہائیکورٹ کے جج ہوئے) اور پنڈت شیونرائن فوطے دار کے ساتھ جب قائداعظم متعارف ہو رہے تھے تو پنڈت شیونرائن نے اپنی طرف سے قائداعظم پر چوٹ کرنے کی کوشش کی ''اگرچہ میں کشمیر میں اقلیتوں کا لیڈر ہوں مگر کشمیر کا جناح نہیں ہوں۔'' قائداعظم نے مسکراتے ہوئے برجستہ کہا: ''پھر تم تو بدقسمت ہوئے' میں آپ کے مقدر کی بہتری کیلئے دعاگو ہوں۔'' فوطے دار کا یہ فقرہ دراصل کوئی نئی بات نہیں تھی' بلکہ یہ کانگریسی پراپیگنڈا اور ہندو پریس کی ذہنیت کی عکاسی تھی' جس نے قائداعظم کو بدنام کرنے کا ہر حربہ استعمال کیا کہ یہ شخص اقلیت کا لیڈر ہونے کے باوجود وطن کے دو ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ قائداعظم نے مسلم قومیت کا تصور تازہ کیا تھا۔ درحقیقت ہندو کانگریسی لیڈروں کا انداز فکر سطحی تھا۔ اگرچہ پنڈت جواہر لال نہرو تاریخ کے بہت بڑے عالم اور تاریخ دان مانے جاتے تھے لیکن ہندوانہ تعصب میں وہ بھی حقیقت سے آنکھیں پھیر چکے تھے۔

☆......☆......☆

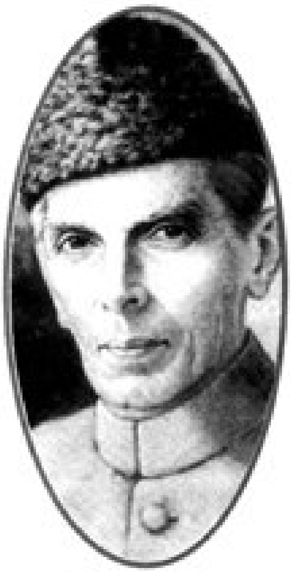

تقسیم ہند (اقتدار کی منتقلی) کے آخری اجلاس میں دائیں سے بائیں سردار عبدالرب نشتر،
لیاقت علی خان، قائداعظم، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ بیٹھے ہیں -
(بائیں جانب) پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی اور بلدیو سنگھ بیٹھے ہیں۔

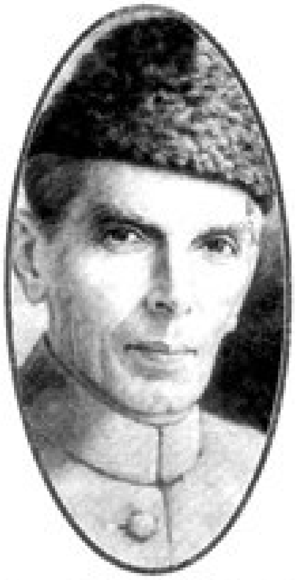

مسئلہ کشمیر اصل صورتحال

"بانیٔ پاکستان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے۔ایچ خورشید مرحوم کہتے ہیں ""اس زمانے میں کوئی بھی شخص یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ کشمیر کا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہو جائے گا۔ دراصل کشمیر کے معاملے کو باقی ریاستوں کے معاملات سے الگ نہیں رکھا جاسکتا تھا' اس لیے یہاں حیدرآباد' جونا گڑھ اور کپورتھلہ وغیرہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ جو منصوبہ تیار کیا تھا' نیز اس کے اندازِ طریق کار سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ قطعاً قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس امر کی پوری کوشش کی کہ پاکستان وجود میں نہ آئے' اگر ایسا ہو جائے تو یہ انتظام ہونا چاہئے کہ پاکستان پیدائش کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ ریاستوں کے مسئلے میں جو پیچیدگی آئی' وہ برطانوی حکام کی بدنیتی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کشمیر واحد ریاست تھی' جس کے مہاراجہ سے ملنے پاکستان بننے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہ نفس نفیس کشمیر گئے' حالانکہ وہ حیدرآباد کے سلسلے میں بھی ایسا کرسکتے تھے۔ وہ حیدرآباد جس نے دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ

کا اتنا ساتھ دیا تھا کہ سرکار برطانیہ نے حیدر آباد کو "رفیق خاص" کے خطاب سے نوازا لیکن ماؤنٹ بیٹن کا صرف کشمیر کو منتخب کرنا اور مہاراجہ ہری سنگھ کو دھمکی دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کیلئے پیچیدگیاں پیدا کی جائیں۔

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حد بندی کمیشن کے ایوارڈ میں ریڈ کلف کے بنائے ہوئے نقشے میں ترمیم کی تاکہ بھارت کو گورداسپور کے ذریعے جموں تک خشکی کا راستہ مل جائے۔ اس سلسلے میں بڑی بحث ہوتی رہی ہے کہ ہمیں چاہئے تھا کہ کشمیر کے بدلے حیدر آباد دینے کی آفر کر دیتے۔

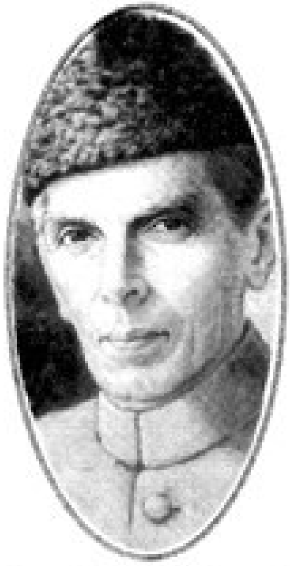

اعتراض کرنے والے یہ بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ انگریز آزادی کے بعد اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح برصغیر میں اس کا عمل دخل باقی رہے اور بھارت دولت مشترکہ کا حصہ بنا رہے۔ اس بنا پر انگریز نے ریاستوں کے بارے میں اپنے معاہدات، تاریخی دستاویزات اور میثاق بنیاد بنا لیے۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبے اور ملحقہ علاقہ جات، جیسا کہ قرار داد لاہور میں موجود ہے، پاکستان میں شامل ہوں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ صوبہ سرحد ریفرنڈم کے ذریعے، صوبہ بلوچستان شاہی جرگے کی قرارداد کے ذریعے صوبہ سندھ اسمبلی کی قرارداد اور ضلع سلہٹ رائے شماری کے ذریعے پاکستان میں شامل ہوئے۔ بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریتی اضلاع شامل کرنے کیلئے ایک خاص ترکیب استعمال کی گئی۔ پہلے مرحلے میں ان صوبوں کی تقسیم کا فیصلہ ہوا۔ دوسرے مرحلے میں مسلم اکثریتی اضلاع پاکستان میں شامل ہوئے گویا کہ ہر علاقے کا طریق کار مخصوص حالات پر مبنی تھا۔ ریاستوں کی پوزیشن اس سے بھی زیادہ پیچیدہ تھی، اس لیے اس ضمن میں حکومت برطانیہ کے کیے گئے فیصلے کو ہی قبول کرنا پڑا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان ہند، نظام حیدر آباد، نواب بھوپال اور دیگر مسلم والیان ریاست کے ساتھ ایک گہرا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے کیونکہ ریاستی حکمرانوں نے برصغیر میں

مسلمانوں کی مذہبی‘ تہذیبی‘ اور لسانی خدمات میں ایک خاص کردار ادا کیا۔

برطانوی حکومت نے یہ اعلان کرنے کے بعد کہ ریاستیں اگر چاہیں تو خود مختار رہ سکتی ہیں‘ حیدر آباد کی خود مختاری نہ صرف تسلیم کرلی بلکہ دہلی‘ کراچی‘ لندن اور نیویارک میں حیدر آباد حکومت نے اپنے سفارتی نمائندے جو ایجنٹ جنرل کہلاتے تھے‘ مقرر کیے۔

کانگریس کو اب یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر حیدر آباد خود مختار رہا تو اس سے بھارت کی دوسری ریاستوں کو بھی شہ ملے گی۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر کانگریسی حکومت اس سازش میں مصروف ہوگئی کہ حیدر آباد کو کس طرح ہڑپ کیا جائے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے قائداعظم ان کی سکیم سمجھتے تھے اور ان کی بھی اس وقت حکمت عملی یہی تھی کہ جب تک کشمیر کا تصفیہ نہ ہو جائے‘ حیدر آباد آزاد ہی رہے تاکہ پاکستان مذاکرات کی بہترین پوزیشن میں ہو۔

یہ ساری بات جاننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہے کہ جو لوگ سرے سے پاکستان کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے ان سے یہ سودے بازی کیسے ہو سکتی تھی کہ کشمیر کے عوض حیدر آباد بھارت کو دے دیا جائے کیونکہ وہ تو دونوں کو بھارت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ نظام نے گوا کے راستے جو سمندری راستہ مانگا‘ بھارت نے اس کی یہ خواہش بھی ناکام بنادی‘ اس طرح کشمیر اور حیدر آباد دونوں کو قابو میں لانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔"

☆......☆......☆

رتی جناح

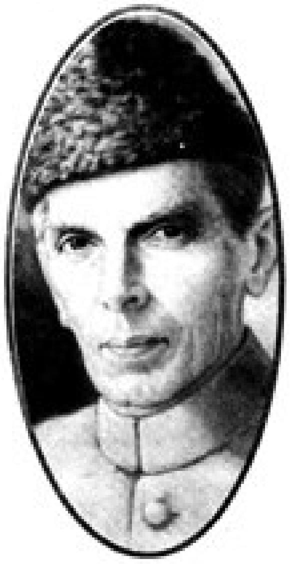

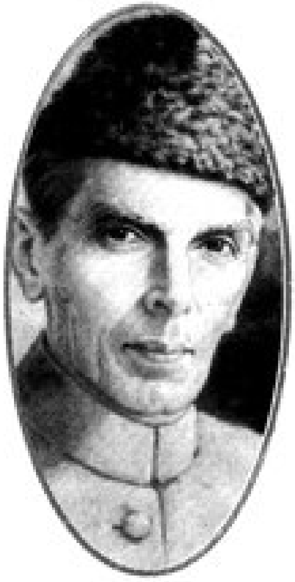

رتی جناح کی حاضر جوابی

قائداعظم محمد علی جناح کی ذاتی زندگی کے حوالے سے ایک اور دلچسپ واقعہ جو ان کی مسز رتی جناح کی شوہر پرستی' وطن دوستی اور انگریز سے نفرت کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک بار وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے قائداعظم کو مختلف ترغیبات دیں مثلاً انہیں ہائیکورٹ کا جج بننے' وائسرائے کی کابینہ میں شریک ہونے اور آخر میں برطانوی حکومت کی طرف سے سر کا خطاب قبول کرنے کی پیشکش کی' لیکن قائداعظم نے ان سب کو ٹھکرادیا۔ایک تقریب کے موقع پر لارڈ ریڈنگ کی مسز جناح سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مسز جناح سے دریافت کیا:

''کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ مسٹر جناح سر کا خطاب قبول کرلیں اور لوگ آپ کو تعظیماً لیڈی جناح کہہ کر مخاطب کریں؟''

مسز رتی جناح نے بے ساختہ جواب دیا:

''اگر مسٹر جناح نے سر کا خطاب قبول کرلیا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ایک آزاد شہری کیلئے سر کا خطاب قبول کرنا درست نہیں اور میں نے آزاد شہری

سے شادی کی ہے، غلام سے نہیں۔"

چند برسوں تک قائداعظم اور مسز رتی جناح گاندھی جی کے خاصے قریب رہے۔ اس کا ثبوت گاندھی جی کے پرائیویٹ سیکرٹری مہادیو ڈیسائی کے روزنامچے سے بھی ملتا ہے۔ 1919ء میں قائد اپنی بیگم کے ہمراہ لندن میں قیام پذیر تھے۔ 28 جون 1919ء کو گاندھی جی نے قائداعظم کو ایک خط لکھا:

"براہ کرم بیگم جناح سے کہہ دیجئے کہ وہ واپس آ کر سوت کاتنے کی جماعت میں شرکت کریں اور مزید یہ کہ جناح صاحب کو تمام غیر ملکی سامان بشمول برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ پر راضی کریں۔"

بیگم رتی جناح نے گاندھی کے خیالات سے واضح اختلافات کرتے ہوئے صاف صاف جواب دیا:

"میرے خیال میں تمام غیر ملکی سامان یا برطانوی سامان کا بائیکاٹ نہ تو سیاسی طور پر دانش مندانہ فعل ہو گا اور نہ ہی قابل عمل ہو گا۔ اسی طرح سوت کاتنے والی پارٹی میں میری شمولیت بھی مناسب نہیں۔"

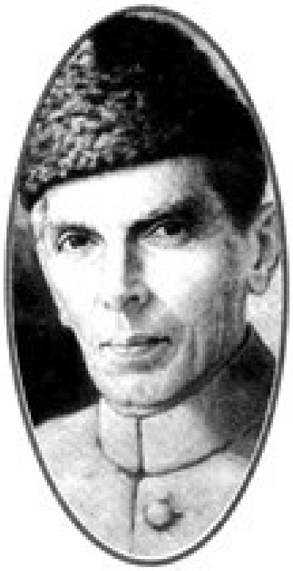

"قائداعظم اور خواتین" معروف کتاب ہے جس کی مصنفہ منور ثمینہ سید لکھتی ہیں کہ رتی جناح کی دلیری کے سلسلے میں 10 دسمبر 1918ء کا واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس روز بمبئی کے شیرف نے ٹاؤن ہال میں لارڈ ولنگڈن کی اپنے عہدے سے سبکدوشی پر ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر شہریوں کی جانب سے سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ اس مقصد کیلئے ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ قائداعظم اور ان کے سینکڑوں ساتھی وقت سے کافی پہلے ہال میں پہنچ گئے اور انہوں نے تمام اہم مقامات اور نشستوں پر قبضہ کر لیا اور جب تک زبردست افراتفری کے بعد جلسہ منتشر نہ ہو گیا وہاں موجود رہے۔ اس تمام ہنگامے کے دوران رتی جناح

نہایت ہمت اور دلیری کے ساتھ ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں پر کھڑی رہیں' جہاں ہزاروں دیگر لوگ جمع تھے۔ اس ہنگامے میں پولیس نے بھی حصہ لیا۔ قائداعظم اور رتی جناح دونوں کو افراتفری کے دوران چوٹیں آئیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ جلسہ درہم برہم ہو گیا اور لارڈ ولنگڈن کو سپاسنامہ پیش کرنے کی کارروائی عمل میں نہ آ سکی اور کامیابی قائداعظم کے حصے میں آئی' بعد میں بمبئ کے شہریوں نے اس فتح کا جشن منانے کیلئے ایک روپیہ فنڈ کا آغاز کیا' اس طرح جمع ہونے والی رقم سے کانگریس ہاؤس کے احاطہ میں ایک یادگار ہال تعمیر کیا گیا اور اس کا نام قائد کی اس کامیابی کی یاد میں عوامی جناح میموریل ہال رکھا گیا۔"

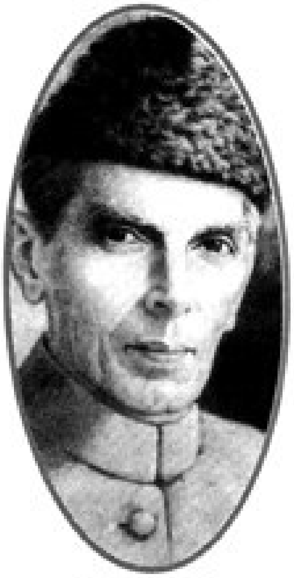

1925ء کے قریب مسز رتی جناح کانجی دوارکاداس کے زیر اثر روحانی مظاہروں کی طرف مائل ہوئیں' اس شوق میں انہوں نے خوابوں کے ذریعے پیغامات' روحوں کے ذریعے مواصلات' غیب دانی اور تھیاسوفی کے موضوعات پر لکھی گئی بے شمار کتابیں پڑھیں۔ رتی جناح نے قائداعظم کو بھی روحانی تجربات کے بارے میں تحریر کردہ ان کتب کو پڑھنے کی ترغیب دی۔ 12 اپریل 1925ء کو انہوں نے کانجی دوارکاداس کے نام تحریر کردہ ایک مکتوب میں لکھا:

”میں دھیرے دھیرے پورے خلوص کے ساتھ ”جے“ کی توجہ اس طرف مبذول کروا رہی ہوں، کبھی ضد اور کبھی خوشامد کے ذریعے میں نے ان کو ”سپرٹ مین آف ایرین“ پڑھنے پر مجبور کردیا ہے۔ یاد رہے کہ رتی جناح قائداعظم کو جے کے نام سے پکارتی تھیں لیکن قائداعظم حاضرات اور مقناطیسیت وغیرہ پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے اور رتی جناح پر اس کے اعتقادات کی وجہ سے ہنسا کرتے تھے۔ وہ کہتے عمل کریں کیونکہ عمل ہی سے زندگی بنتی اور قومیں ابھرتی ہیں۔ آخر کار جب رتی جناح نے ان مشاغل کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی تو قائد نے نہایت اطمینان کا اظہار کیا۔

قائداعظم اور رتی جناح کی اکلوتی بیٹی دینا 15 اگست 1919ء کو انگلستان میں پیدا ہوئی۔

☆......☆......☆

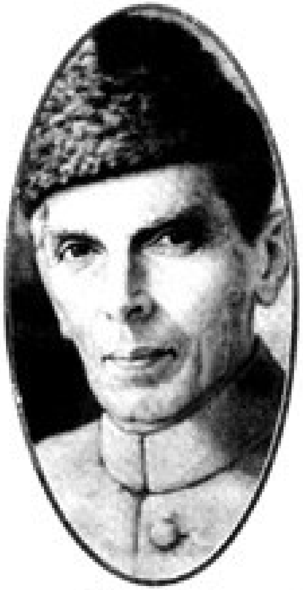

قائداعظم کی اہلیہ مریم (رتی) جناح۔

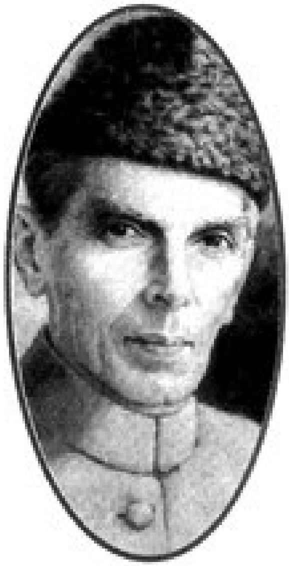

رتی کی بیماری

ہم قائد کی ذاتی زندگی اور ان کی بیگم رتی جناح کے حوالے سے دلچسپ یادوں کو سمیٹ رہے تھے۔ 1919ء میں غالباً انہی اختلافات اور مصروفیات نے ان دونوں کی زندگی میں علیحدگی کا بیج بویا۔ قائداعظم کے سامنے مسلمانوں کے مسائل اور بعدازاں پاکستان کیلئے جدوجہد کی شکل میں ایک واضح مشن تھا، جس کیلئے وہ دن رات کام کر رہے تھے اور ہر قیمت پر اسے کامیاب وکامران دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس رتی جناح ایک نوعمر اور زندگی سے بھرپور خاتون تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ سیر و تفریح اور سماجی تقریبات میں شامل ہو کر زندگی کا لطف دوبالا کرنے کی خواہشمند تھیں۔ قائداعظم جنگ آزادی لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے جبکہ رتی جناح ان کی توجہ شاعری، آرٹ، جوتش اور روحانی تجربات کی طرف مبذول کرانے کی متمنی تھیں، اس کے ساتھ بدقسمتی سے رتی جناح کی صحت بھی بگڑنے لگی تھی اور وہ بے خوابی اور بے چینی کی مسلسل شکایت کرتی تھیں۔

بہرحال جنوری 1928ء میں قائد اور رتی جناح میں عارضی طور پر علیحدگی ہو گئی،

دونوں الگ الگ رہتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کی مزاج پرسی کرتے اور خیریت وغیرہ دریافت کرتے تھے۔ قائد نے کبھی رتی جناح کے بارے میں کوئی مخالفانہ بات منہ سے نہیں نکالی۔ وہ بدستور قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے' دیوان چمن لال قائداعظم اور رتی جناح کے ذاتی دوستوں میں سے ایک تھے۔ قائداعظم 3 اپریل 1928ء کو جس جہاز سے انگلستان روانہ ہوئے تو دیوان چمن لال بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے قائداعظم سے ملاقات کے بعد اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں قلمبند کیا۔

"جناح آج بہت اداس ہیں' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ تنہا اور دل گرفتہ شخص ہیں" تاہم وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو نجی زندگی کیلئے ترک کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں۔"

قائداعظم کے ہندوستان سے چلے جانے پر رتی جناح اور بھی بیقرار ہو گئیں اور ان کی صحت پہلے سے زیادہ خراب رہنے لگی۔ آخر کار اپنے شوہر کی انگلستان روانگی کے صرف ایک ہفتہ بعد رتی جناح نے بھی رخت سفر باندھا اور 10 اپریل 1928ء کو ہندوستان سے رخصت ہو گئیں۔ پیرس پہنچ کر رتی جناح کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اور انہیں وہاں شانزے لیزے کے ایک کلینک میں داخلہ لینا پڑا۔

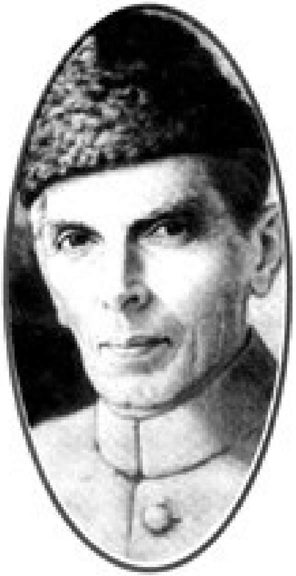

اتفاق سے دیوان چمن لال کو رتی جناح کی علالت کا علم ہو گیا۔ وہ ہسپتال پہنچے تو رتی جناح بستر علالت پر دراز تھیں' انہیں اس وقت 106 درجہ بخار تھا اور وہ مشکل سے ہل جل سکتی تھیں۔ اس حالت میں بھی ان کے ہاتھ میں آسکر وائلڈ کی نظموں کا مجموعہ تھا۔

دیوان چمن لال نے رتی جناح کی نازک حالت کو دیکھ کر قائداعظم کے نام آئرلینڈ میں ایک تار بھیجا اور انہیں پوری صورتحال سے آگاہ کیا۔ بدقسمتی سے قائداعظم ڈبلن گئے ہوئے تھے' جونہی انہیں رتی کی علالت کی اطلاع پہنچی وہ فوراً پیرس کیلئے روانہ ہو گئے۔ پیرس کے جارج پنجم ہوٹل میں قائداعظم کی دیوان چمن لال سے ملاقات ہوئی تو قائداعظم نے کہا:

"مگر رتی جناح کی ماں نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت بہتر ہے۔" اس پر دیوان چمن لال نے جواب دیا۔

"میں ابھی ہسپتال سے آیا ہوں' انہیں 106 درجہ بخار ہے اور ایسا لگتا ہے کہ قریب المرگ ہیں۔"

یہ سن کر قائداعظم چند لمحوں تک خاموش اور ساکت بیٹھے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے' پھر انہوں نے کلینک فون ملوا کر رتی جناح کی نگران نرس سے بات چیت کی۔ نرس کی باتیں سن کر وہ اور پریشان ہوگئے۔ انہوں نے کہا:

"آؤ چلو ہمیں اس کو بچانا ہے۔"

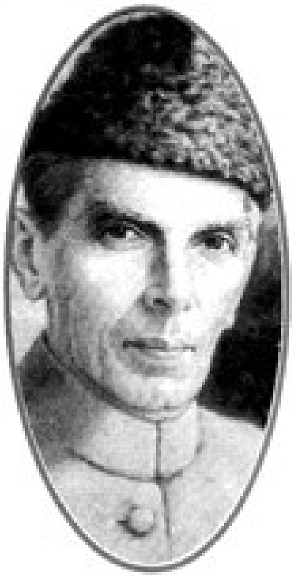

قائد کے سوانح نگار ہیکٹر بولا تھو لکھتے ہیں کہ اس کے بعد وہ تین گھنٹے تک تنہا رتی جناح کے کمرے میں رہے' اس دوران دیوان چمن لال باہر ایک کیفے میں ان کی واپسی کے منتظر رہے۔ قائداعظم واپس آئے تو وہ کچھ مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے رتی جناح کیلئے نئے طبی کلینک اور نئے طبی مشیر کا انتظام کر دیا تھا۔ انہوں نے چمن لال سے کہا:

"میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی بچائی جا سکتی ہے' مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر اور ہسپتال کی تبدیلی سے وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

☆......☆......☆

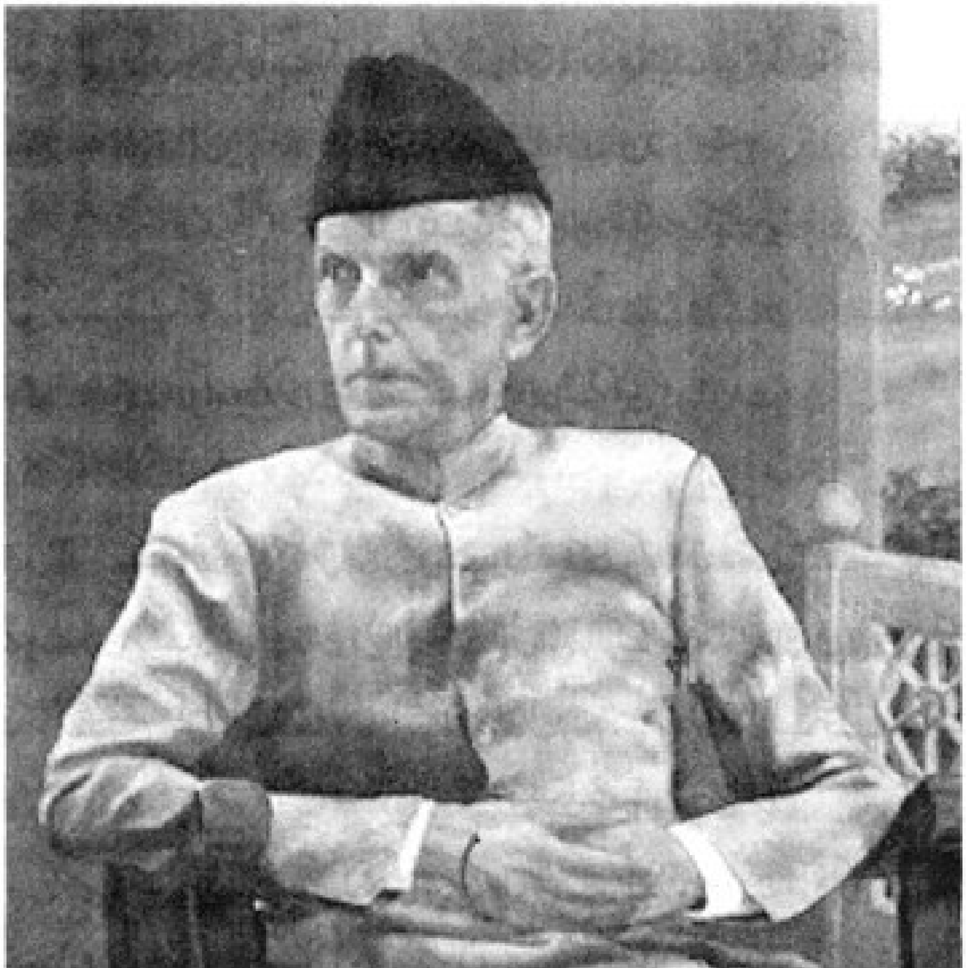

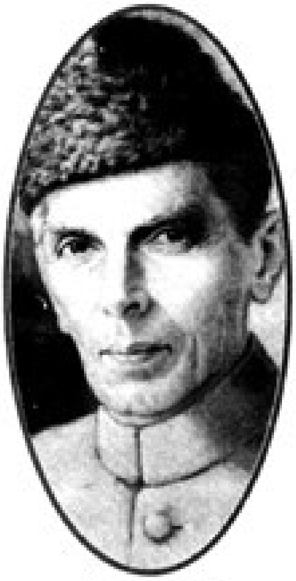

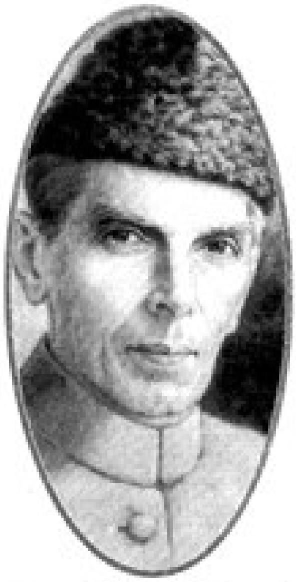

محبت اور فرض

قائداعظم کو چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود اپنی بیگم رتی جناح سے کس قدر محبت تھی اور وہ ان کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ پیرس میں رتی بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہوئی تو قائداعظم اپنی بیگم کی تیمارداری کی غرض سے اس کے ساتھ نرسنگ ہوم میں مسلسل ایک ماہ تک قیام پذیر رہے۔ اس دوران وہ نہایت انہماک سے رتی جناح کی تیمار داری اور دیکھ بھال کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ایک موقع پر رتی جناح نے دوار کاداس کو بتایا کہ جناح صاحب بھی نرسنگ ہوم میں وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ کھایا کرتی تھیں۔ عارضی صحت یابی کے بعد رتی جناح بمبئی واپس چلی گئیں اور اپنی والدہ اور بھائی کے ہاں قیام کیا۔

جنوری‘ فروری 1929ء کے دوران وہ مسلسل بیمار رہیں۔ وہ ہر وقت اداس‘ دل گیر اور بجھی بجھی دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھار ٹہلنے کیلئے تھوڑی دور تک باہر نکلتی تھیں‘ اسی عرصے میں قائداعظم بھی ہندوستان لوٹ آئے‘ وہ ہر شام مزاج پرسی کیلئے رتی جناح کے گھر جاتے اور دیر تک ان سے گفتگو کرتے۔ مسٹر جی ایم چھاگلہ نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

''انصاف سے دیکھا جائے تو مجھے کہنا پڑے گا کہ کوئی شخص اپنی ناراض بیوی کے ساتھ جناح صاحب سے زیادہ فیاضانہ سلوک نہیں کر سکتا' ان کا سلوک بہت ہی نفیس تھا''۔

اختلافات کے باوجود رتی جناح اپنے شوہر کو بہت چاہتی تھیں۔ شریف الدین پیرزادہ کے مطابق ایک خط میں رتی جناح نے تحریر کیا۔

''آپ آئیں اور جناح صاحب سے ملیں، دیکھیں وہ کیسے ہیں' ان کی عادت ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ کام کر کے اپنے آپ کو تھکا لیتے ہیں اور اب جبکہ میں ان کو پریشان کرنے اور ستانے کیلئے موجود نہیں ہوں تو ان کی حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب ہو رہی ہوگی''۔

یہ الفاظ ایک محبت کرنے والی بیوی کے دل کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ رتی جناح علالت کے باوجود بھی ہر روز دریافت کرتیں کہ قانون ساز اسمبلی میں جناح صاحب کیسی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

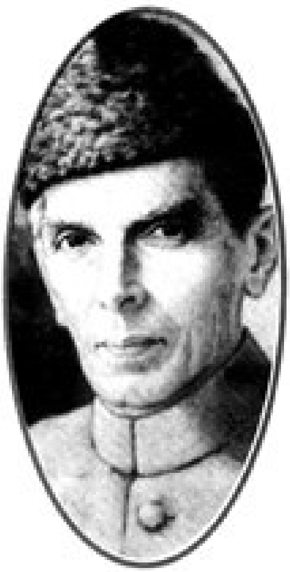

19 فروری 1929ء کو رتی بیہوش ہو گئیں۔ قائداعظم کو تار دیا گیا۔ قائداعظم نے فوراً بمبئی واپسی کا انتظام کیا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے پہلے 20 فروری 1929ء کی شام رتی اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ 22 فروری کو رتی جناح کی تدفین ہوئی۔ قائداعظم اس میں شریک ہوئے' نماز جنازہ کے بعد مسلم رسوم و رواج کے مطابق ان کے جسد خاکی کو آرام باغ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ تدفین کے انتظامات شریف دیوجی نے کئے' جسد خاکی لحد میں اتر چکا اور مٹی ڈالنے کا جاں گداز لمحہ آیا تو رتی جناح کی عزیز ترین ہستی اور محبوب شوہر نے سب سے پہلے مٹی ڈالی۔ اس وقت قائداعظم کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور وہ سر جھکا کے بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔

کرم حیدری کی کتاب ''ملت کے پاسبان'' میں یہ واقعہ درج ہے۔ رتی جناح سے قائداعظم کی لازوال محبت کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ رتی کے انتقال کے کافی برس بعد

جب قیام پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اور قائداعظم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہندوستان چھوڑ کر جانے والے تھے تو ایک روز صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ بمبئی کے ایک مسلم قبرستان میں پہنچے۔ وہ قبرستان میں واقع پتھر سے بنی ہوئی ایک قبر کے پاس گئے' ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور قبر پر پھولوں کا ہار چڑھایا۔ یہ قبر ان کی محبوب اور خوبصورت بیوی رتی جناح کی تھی۔ جس شہر سے وہ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو رہے تھے' اس وطن کی طرف جانے کیلئے جو انہوں نے اپنی صحت' اپنی خوشی بلکہ اپنی بیوی کی خوشی کو قربان کر کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کیلئے حاصل کیا تھا۔

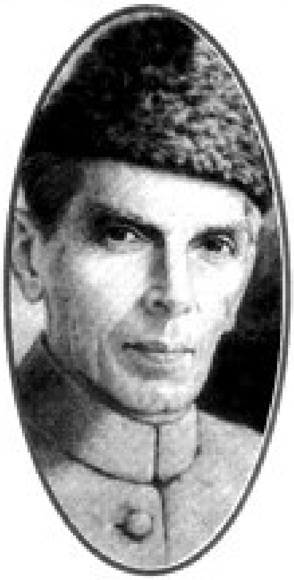

ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ قائد اور ان کی بیگم رتی جناح کے حالات اس لئے بیان کئے ہیں کہ یہ معلومات عام نہیں اور بہت تگ ودو کے بعد بعض کتابوں سے جمع کی گئی ہیں تاہم ان سے ایک بات ظاہر ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح دنیا میں جس ہستی کو اپنی جان سے بھی عزیز سمجھتے تھے' ان سے بھی زیادہ انہیں اپنے مقصد سے' اپنے اصولوں سے اور اپنے مشن سے پیار تھا۔ مسلمانوں کی بہتری ان کیلئے حقوق کی جنگ اور آخر میں ان کیلئے آزاد ریاست کا قیام قائد کی منزل تھی جبکہ رتی جناح زندگی کی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونے اور سیر و تفریح میں شوہر کو ساتھ لے جانے کی دھن میں ناکام رہیں۔ قائد نے ذاتی خوشی اور بیوی کی خُوشنودی کے بجائے اعلیٰ اصولوں اور مسلمانوں کی اجتماعی بہتری کو زیادہ اہمیت دی اور یوں ذاتی محبت کو اپنے فرض پر قربان کر دیا' یہی بڑے آدمی کی نشانی ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

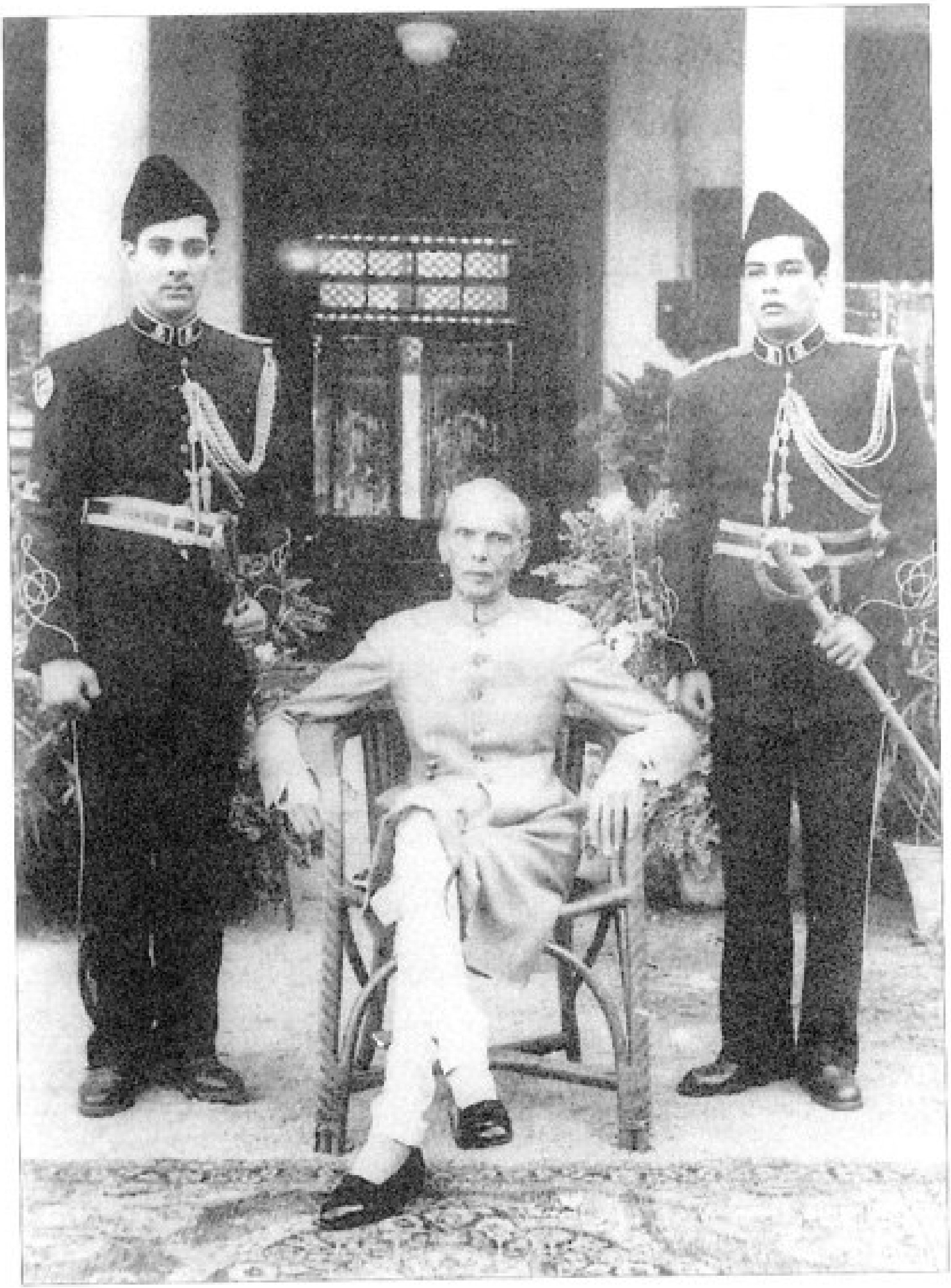

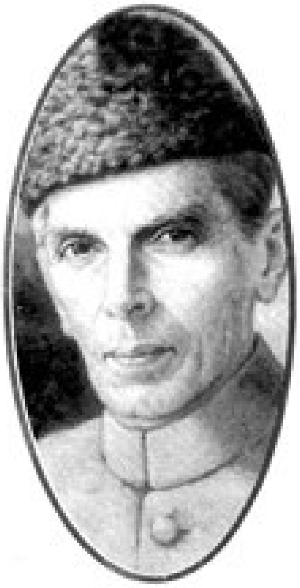

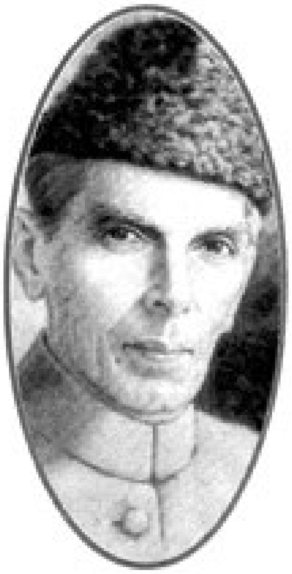

خوددار اور خود اعتماد جناح

قائداعظم کی داستان حیات سے دلچسپ اور سبق آموز واقعات ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ ہماری قومی اور سیاسی زندگی میں گزشتہ صدی کے دوران ایک بھی شخصیت ایسی نہیں جو پاکستانی قوم کیلئے قابل تقلید ہو۔

نوجوان وکیل کے طور پر قائد کی زندگی کے بارے میں کئی واقعات نہایت دلچسپ ملتے ہیں۔ ہیکٹر بولائتھو کی کتاب "جناح" میں ایک باب "نوجوان جناح عدالت میں" کے عنوان سے موجود ہے۔ بولائتھو اس سوانح حیات کی تیاری کیلئے خود بمبئی پہنچے اور وکٹورین عہد کی اس عمارت میں گئے' جہاں سے قائداعظم نے اپنی وکالت کا آغاز کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بمبئی میں کچہری کی عمارت کے ایک حصے میں حوالات ہے اور دوسرے میں ایک لمبا چوڑا ہال' جس کے ایک کونے کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ نوجوان جناح نے اپنی وکالت کا پہلا دفتر یہاں قائم کیا تھا۔

بولائتھو لکھتے ہیں کہ "ایک بوڑھے وکیل نے بڑے شوق سے محمد علی جناح کی جوانی کی باتیں سنائیں۔" وہ کہنے لگا: "جناح کے مزاج میں بڑی بے باکی تھی' لیکن انہوں نے جو کہا تھا کر

دکھایا۔ اپنی وکالت جمانے کے بعد انہوں نے بمبئی کے دوسرے تمام وکیلوں سے زیادہ روپیہ اور روپے سے بھی زیادہ نیک نامی اور اچھی شہرت کمائی۔

پھر بوڑھے وکیل نے پاس کے ایک دفتر سے دو دوستوں کو بلایا جنہوں نے اپنی زندگی میں محمد علی جناح کو دیکھا تھا اور تینوں نے باری باری مسٹر جناح کے متعلق قصے سنائے۔

ان میں سے ایک شخص مسٹر جناح کو اس زمانے سے جانتا تھا جب ان کے مالی حالات اچھے نہ تھے، لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس وقت بھی جناح کا عمدہ سلا ہو الباس ان کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا اور اس مشکل وقت میں بھی انتہا کی خود اعتمادی اور بے باکی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ان کی دیانت بھی انتہا درجے کی تھی، میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے کوئی ناانصافی یا ہیر پھیر کیا ہو۔ تیسرے درجے کی یہ گھٹیا باتیں ان کی فطرت کے خلاف تھیں۔"

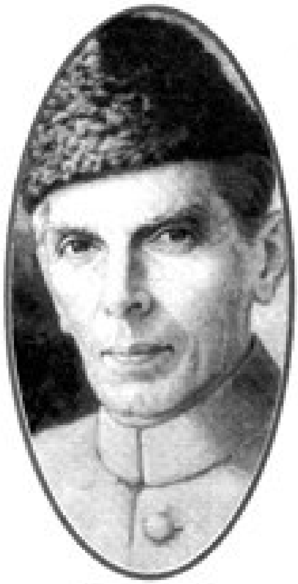

تیسرے وکیل نے کہا: "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ان کی قسمت نے صحیح معنوں میں پلٹا کیوں کر کھایا۔ 1903ء میں جیمز میک ڈانلڈ نامی سکاٹ لینڈ کا ایک باشندہ بمبئی کارپوریشن کا میئر تھا۔ وہ نہایت اہم شخص تھا اور کارپوریشن کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا تھا۔ ایک دن ہائیکورٹ میں ایک بڑا مقدمہ سنا جا رہا تھا اور عدالت کا کمرہ اتنا بھر گیا تھا کہ اس کے دروازے بند کرنا پڑے۔ کمرہ عدالت کا ایک حصہ حسب دستور وکلاء کیلئے مخصوص تھا، لیکن جب جناح اندر آئے تو اس میں ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ جناح نے دیکھا کہ وکیلوں کی کرسیوں میں سے ایک پر شہر کے میئر جیمز میک ڈانلڈ بیٹھے ہیں۔ جناح نے ان سے کرسی خالی کرنے کو کہا۔ جب وہ نہ مانے تو جناح نے عدالت کے ریڈر سے شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ میک ڈانلڈ صاحب کو کرسی سے اٹھا دیا جائے کیونکہ یہ کرسیاں صرف وکلاء کیلئے مخصوص ہیں۔ ریڈر ہچکچایا کہ وہ میئر کو کیسے اٹھائے مگر جناح نے دھمکی دی کہ وہ جج سے شکایت کریں گے کیونکہ یہ بات ضابطے کے خلاف ہو رہی ہے اور کوئی بھی شخص جو کسی بھی حیثیت کا مالک ہو، وکلاء کی کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس

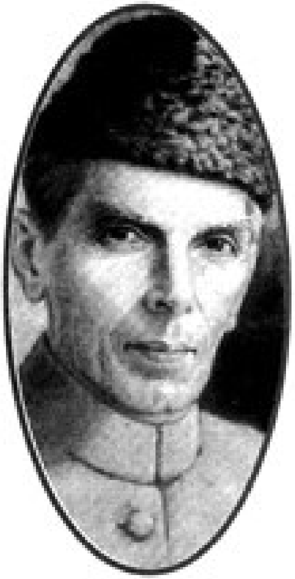

پر بے چارہ ریڈر مجبور ہو کر مسٹر میک ڈانلڈ کے پاس گیا اور ان سے کرسی خالی کروالی۔

میک ڈانلڈ بھی غیر معمولی آدمی تھا۔ بجائے ناراض ہونے کے اس نے کرسی چھوڑ دی اور مسٹر جناح کی اصول پرستی اور دلیری سے اس قدر متاثر ہوا کہ کچھ دن بعد اس نے مسٹر جناح کو اپنے دفتر مدعو کیا اور ایک ہزار روپے ماہوار پر کارپوریشن کا وکیل مقرر کر دیا۔“

ہیکٹر بولا تھو لکھتے ہیں کہ اس پر دوسرا وکیل بات کاٹتے ہوئے بولا: ”مسٹر جناح کی خود اعتمادی حیرت انگیز تھی۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ایک جج نے کسی مقدمے کی سماعت کے دوران میں ان کے انداز تخاطب پر بگڑ کر کہا: ”مسٹر جناح یاد رکھیے کہ آپ کسی تیسرے درجے کے مجسٹریٹ کے سامنے بحث نہیں کر رہے۔“ مسٹر جناح نے برجستہ جواب دیا: ”جناب عالی! آپ کی اجازت سے میں بھی آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جناب کے سامنے بھی اس وقت کوئی تیسرے درجے کا وکیل نہیں ہے۔“

ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ ایک امیر ہندو زمیندار نے مسٹر جناح کی بھاری فیس پر ان سے احتجاج کیا تو مسٹر جناح بولے: ”کیا آپ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنا چاہتے ہیں؟ میری جو فیس ہے وہ میرے کام کے مطابق ہے۔ آپ کو منظور نہیں تو کوئی دوسرا وکیل کر لیں، جو آپ کی تجویز کردہ فیس پر کام کرنے کیلئے تیار ہو۔“

☆......☆......☆

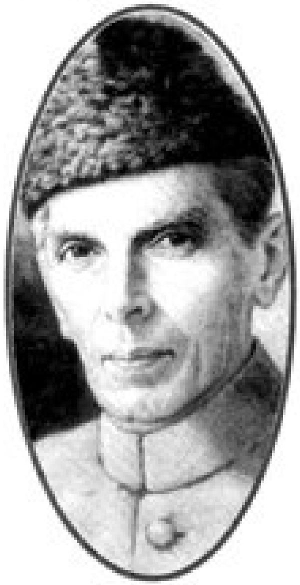

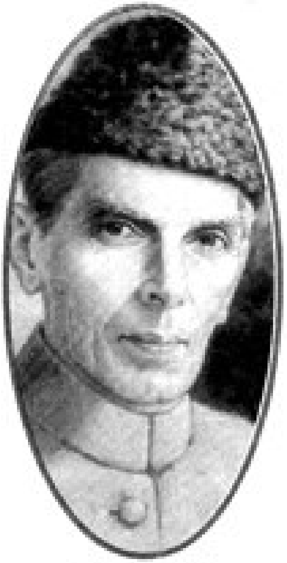

بطور وکیل...... چندیادیں

قائداعظم بطور وکیل کیسے تھے۔اس سلسلے میں ہم نے متعدد واقعات اور بھی تلاش کیے ہیں۔ان کے اس دور کے ایک ساتھی وکیل نے کہا

"مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں ایک امدادی فنڈ کیلئے چندہ جمع کر رہا تھا کہ بار لائبریری میں مسٹر جناح کو دیکھ کر میں ان کے پاس گیا اور چندے کی فہرست ان کے ہاتھ میں دی۔انہوں نے اپنا اِکالگا کر اسے بغور پڑھا' پھر فہرست واپس مجھے لوٹادی اور بولے "جناب مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں اور جس کام سے مجھے دلچسپی نہ ہو میں اس کیلئے وقت ضائع کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا' چندہ دینا تو دور کی بات ہے "ایک اور وکیل نے اس دور کی یادوں کو شمار کرتے ہوئے کہا"مسٹر جناح بہت بڑے وکیل تھے ہر مقدمے کی تفصیلات بڑی احتیاط سے انہیں سمجھانا پڑتی تھیں 'لیکن ایک مرتبہ معاملہ سمجھ لینے کے بعد وہ پوری طرح کیس پر حاوی ہو جاتے تھے اور پھر بحث میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ان کی صلاحیتیں زیادہ تر خداداد تھیں تاہم خود ان کی کوششوں کا بھی ان میں بہت دخل تھا۔یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر جناح میں کوئی پوشیدہ حس

ایسی ہے جس کی مدد سے انہیں مقدمے کے چھپے ہوئے پہلو اور س کی دقتیں آسانی سے نظر آجاتی ہیں۔ وہ اپنے مقدمے کے اہم نکتے بڑی خوبی سے نکالتے اور پھر آہستہ آہستہ 'لفظ بہ لفظ' انہیں جج کو سمجھاتے۔ ان کی بحث خالص منطقی ہوتی تھی۔ جذبات کے جوش اور گرمی سے پاک" بولائتھو کے بقول تینوں میں سے ایک وکیل نے ایک اور قصہ سنایا اس نے کہا

"مسٹر جناح کے زمانے میں ہائیکورٹ میں ایم اے 'سوم جی نامی ایک اور وکیل تھا' جو عمر میں ان سے چھوٹا تھا۔ (سوم جی بعد میں ہائیکورٹ کے جج ہوگئے) ایک مقدمے میں جناح اور سوم جی مخالف فریقوں کی طرف سے پیش ہو رہے تھے۔ سوم جی کسی اور عدالت میں بحث کر رہے تھے کہ یکایک مسٹر جناح والے مقدمے کی آواز پڑگئی۔ سوم جی کے منشی نے مسٹر جناح سے مختصر التوا کی درخواست کی کہ اگلی تاریخ لے لیں۔ مسٹر جناح نے انکار کردیا۔ منشی نے جج سے مدد چاہی تو جج نے کہا "اگر مسٹر جناح مان جائیں تو مجھے اگلی تاریخ دینے پر کوئی اعتراض نہیں" لیکن مسٹر جناح راضی نہ ہوئے اور بولے "میرے فاضل دوست (سوم جی) کا فرض ہے کہ وہ ذاتی طور پر مجھ سے التوا کی درخواست کرتے' آج بحث کا وقت مقرر ہے اور اصولی طور پر میں اپنے موکل کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہیکٹر بولائتھو لکھتے ہیں کہ مسٹر جناح کے تینوں ساتھیوں نے ان کے بارے میں یادیں سمیٹتے ہوئے کہا مسٹر جناح لائق اور دھن کے پکے تھے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں جذباتی انداز کی کمی ہے لیکن بحث میں ان کی لیاقت اور برتری کے ہم سب قائل تھے۔ وہ غیر جذباتی انداز میں عدالت میں بحث کیلئے ایک خاص انداز میں کھڑے ہوتے 'اپنا اکا یعنی ایک شیشے والی عینک آنکھ پر لگاتے اور پھر آہستہ سے جج کی طرف آنکھ اٹھاتے۔ ان کی حرکات و سکنات سے ایک مدبر کا انداز جھلکتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ وہ ساری عدالت پر چھاگئے ہیں۔ ہاں مسٹر جناح رفتہ رفتہ اپنے دلائل سے سچ مچ چھاجاتے تھے"

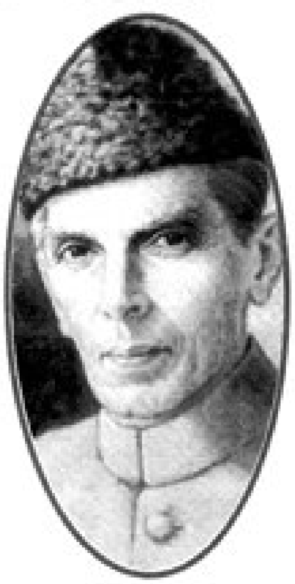

ان وکلاء نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا

"جب ہم مسٹر جناح کو یاد کرتے ہیں تو ہمیں بار بار ان کی غیر معمولی دیانتداری کا خیال آتا

ہے۔ایک مرتبہ ان کے سولسٹر نے ایک موکل ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ اس کے پاس مقدمے کیلئے زیادہ روپیہ نہیں۔ مسٹر جناح نے مقدمہ لے لیا۔وہ ہار گئے۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ مقدمے میں جان ہے۔اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اپیل کی جائے۔سولسٹر نے انہیں یاد دلایا کہ موکل کے پاس پیسے نہیں۔ مسٹر جناح نے سولسٹر سے کہا کہ اپیل دائر کرنے کے اخراجات کا کچھ وہ اپنی جیب سے دے اور کچھ حصہ میں چھوڑ دیتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ موکل کو انصاف مل سکتا ہے۔سولسٹر مان گیا۔ مسٹر جناح نے مقدمہ دائر کیا اور اپیل میں جیت گئے۔ لیکن جب سولسٹر نے انہیں موکل سے مزید فیس دلوانا چاہی جو بہت خوش تھا اور مزید فیس دینا چاہتا تھا تو مسٹر جناح نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں نے مقدمہ بغیر فیس کے لڑنے کا وعدہ کیا تھا میں اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔"

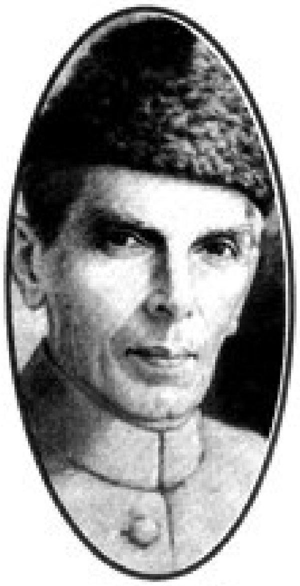

ایک اور وکیل نے بھی ایک واقعہ سنایا' اس نے کہا:

"مسٹر جناح کا ایک مؤکل عدالت میں ان کی کارکردگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے مقررہ معاوضے کے علاوہ ان کو کچھ روپیہ بھیج دیا۔ مسٹر جناح نے یہ فاضل رقم واپس کر دی اور اس کے ساتھ ایک پرچے پر لکھ بھیجا "آپ مجھے جتنی رقم دے چکے ہیں' فیس اتنی ہی طے ہوئی تھی بقایا رقم واپس بھیج رہا ہوں' اسے رکھنا بے اصولی ہو گی"

قائداعظم پر کتاب لکھنے والے ہیکٹر بولا کھو نے ان تین بوڑھے وکیلوں سے پوچھا کہ کیا آپ مسٹر جناح کی قابلیت سے متاثر تھے یا انہیں پسند کرتے تھے تو ان میں سے ایک بولا: میں انہیں واقعی پسند کرتا تھا' کیونکہ وہ بڑے منصف مزاج تھے۔ سیاسی زندگی کے اختلافات اور تلخیوں کے باوجود ان کے دل میں کسی کیلئے بغض یا نفرت نہیں تھی۔ وہ سخت ضرور تھے لیکن کسی کیلئے بھی کدورت یا کینے سے بالکل پاک تھے۔

ان تینوں وکیلوں میں سے دو ہندو تھے اور ایک پارسی لہذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مسلمان تھے اس لئے تعریفیں کر رہے تھے اور یہی قائداعظم کی ذاتی دیانتداری اور پروقار زندگی بسر کرنے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

☆......☆......☆

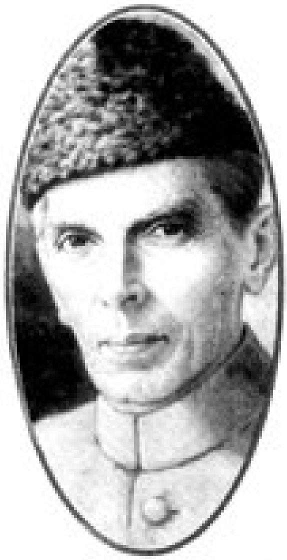

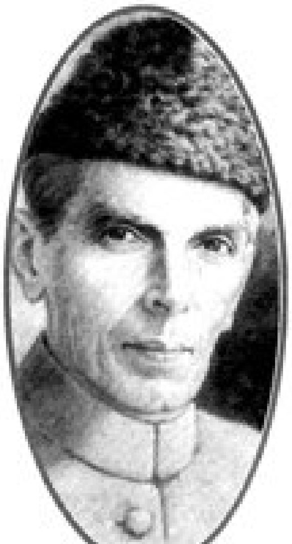

اچھا وکیل اور اچھا انسان

بطور وکیل قائد کیسے تھے۔اس سلسلے میں معلومات بہت دلچسپ ہیں۔ان کے پرانے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ

''مسٹر جناح اس وقت بمبئی میں واحد مسلمان بیرسٹر تھے۔ ممکن ہے کہ دو ایک اور بھی ہوں لیکن ان میں سے کوئی قابل ذکر نہ تھا۔نامور وکلاء میں سے اکثر ہندو یا پارسی تھے اور شاید وہ اس بات پر خوش نہ تھے کہ مسلمان تاجروں کے خاندان کا ایک نوجوان بیرسٹر اپنے کام میں ایسی غیر معمولی محنت کر رہا ہے۔اس لئے جناح پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح کی زندگی لطف و عشرت سے یکسر خالی تھی اور اپنے کام کے سوا نہیں کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ رات دن اپنے مقدموں میں لگے رہتے۔ان کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بانس کی طرح پتلے دبلے ہیں اور ہمیشہ معلوم ہوتا کہ بڑی جلدی میں ہیں۔ان کی نجی زندگی بہت صاف ستھری تھی اور اس کے متعلق کسی قسم کی چہ میگوئیاں سننے میں نہیں آئیں۔ وہ ایک محنتی جوان تھے۔ مزاج میں سنجیدگی اس قدر تھی کہ بہت کم لوگ ان سے دوستی کرنا چاہتے۔ایسے سنجیدہ کردار کے حامل افراد پر لوگ عموماً زیادہ تنقید کرتے ہیں۔ بالخصوص مشرقی ممالک میں جہاں لوگوں کے پاس کام کم اور باتوں کی فرصت زیادہ ہے اور جہاں انسان کی خامیاں

تو معاف کر دی جاتی ہیں لیکن اس کی خوبیاں ہدف تنقید بن جاتی ہیں۔

بولائتھو کے بقول بمبئی کے ایک اور پرانے وکیل نے بتایا یہ ٹھیک ہے کہ جناح کے طور طریقے ذرا انوکھے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مقدمے کی سماعت کے دوران میں ایک جج نے انہیں کہا "مسٹر جناح میں آپ کی آواز نہیں سن سکتا۔"

مسٹر جناح نے جواب دیا "میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں' جج بات پی گیا لیکن ذرا دیر کے بعد پھر مجبور ہو کر بولا 'مسٹر جناح میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ذرا اونچا بولیے' اس بار مسٹر جناح نے کہا کہ اگر آپ کتابوں کا انبار اپنے آگے سے ہٹا دیں تو آسانی سے مجھے سن سکیں گے۔"

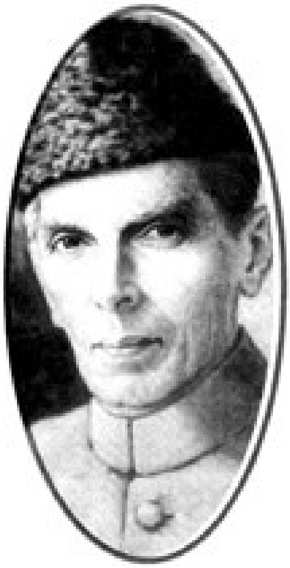

قائد کی وکالت ہی کے دور کا ایک اور واقعہ بھی دلچسپ ہے جو اس کتاب میں درج ہے اس زمانے میں بمبئی کے ایک مشہور تاجر حاجی عبدالکریم تھے جنہیں کسی الزام کے سلسلے میں عدالت میں طلب کیا گیا۔ وہ قائد کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ مقدمے کی کتنی فیس لیں گے۔ قائد نے کھرے پن سے جواب دیا "پانچ سو روپے روز"

حاجی صاحب محتاط آدمی تھے۔ پوچھا: "مقدمہ کتنے عرصے چلے گا؟ میرے پاس کل پانچ ہزار روپے ہیں 'کیا آپ یہ ساری رقم بطور معاوضہ قبول کرلیں گے خواہ مقدمہ کتنی دیر لڑنا پڑے"

قائد اپنی بات پر اڑے رہے اور کہا کہ میں یہ رقم قبول نہیں کروں گا۔ میری فیس 500 روپے روز ہے یا تو آپ اس فیس پر مجھے اپنا وکیل کریں' یا کوئی اور وکیل تلاش کریں"

عبدالکریم نے ان کی شرط منظور کرلی۔ قائد نے تین دن میں مقدمہ جیت لیا۔ ان کی فیس 1500 روپے بنی' جو انہوں نے بخوشی قبول کرلی۔

ایک اور وکیل نے بولائتھو سے جو واقعہ بیان کیا وہ بھی سن لیجئے۔

یہ وکیل عمر میں مسٹر جناح سے چھوٹا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے والد کی قرابت مسٹر جناح کے خاندان سے تھی اور جب میں "گریزان" سے بیرسٹری کی سند لے کر بمبئی واپس آیا تو والد صاحب مجھے مسٹر جناح کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے اس کو اپنا سا لائق بنا دیجئے۔" مسٹر جناح نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "یہ خوشی سے آکر میرے دفتر میں

کام کریں لیکن لیاقت خود اپنی محنت سے پیدا کریں۔ میں اس ضمن میں ان کی زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔"

وکالت میں کامیابی کے آغاز میں قائد کی ملاقات معروف مصنفہ اور بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو سے ہوئی۔ یہ پہلی ذہین اور حساس خاتون تھیں جنہوں نے قائد کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کیا اور ان کی ظاہری رعونت کے پردے کے پیچھے ان کے کردار کی اصلیت کو پہچانا وہ قائد کے متعلق اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

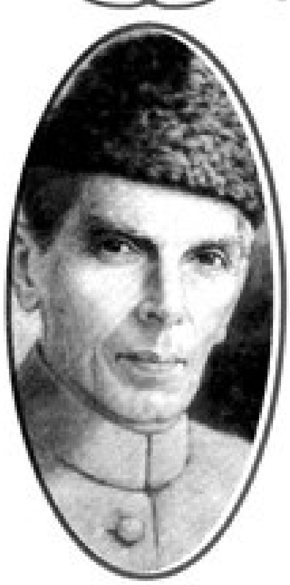

"میں نے کسی شخص کی ظاہری خصوصیتوں اور اس کے اصلی کردار میں اتنا فرق نہیں دیکھا مسٹر جناح بلند قامت ہیں لیکن دبلے اور دیکھنے میں کمزور معلوم ہوتے ہیں ان کی عادتیں رئیسانہ ہیں لیکن ان کی جسمانی ناتوانی ایک نظر فریب پردہ ہے جس کے پیچھے ان کے کردار کی غیر معمولی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ روکھے اور تنگ مزاج سمجھے جاتے ہیں اور بالعموم لوگوں سے بے تکلفی سے نہیں ملتے انکا انداز اکثر تحکمانہ ہوتا ہے لیکن جو لوگ ان کو اچھی طرح جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مسٹر جناح کی تمکنت اور رعونت کے خول میں ایک بڑی دلکش شخصیت ہے ان کی انسانیت میں بڑا بھولا پن ہے ان کا مشاہدہ ایک عورت کے مشاہدے کی طرح تیز اور نازک ہے اور انکے مزاج میں بچوں کے مزاج کی سی شوخی اور دلکشی ہے مسٹر جناح بنیادی طور پر عملی آدمی ہیں اور انکے جذبات پوری طرح ان کے ذہن کے تابع ہیں زندگی کے متعلق انکے خیالات بالکل غیر جذباتی ہیں لیکن ان کی دنیاداری اور حقیقت پسندی کے پردے میں اصول پرستی اور بے غرضی کے بڑے جوہر پوشیدہ ہیں اور یہی مسٹر جناح کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے جو انہیں لاکھوں میں ممتاز بناتی ہے۔

یہی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے قائد کو ایک سچا اور کھرا وکیل بنایا اور قائد نے اپنے انداز میں پاکستان کا مقدمہ بھی بڑی محنت اور سچائی سے لڑا اور کامیاب رہے۔

☆......☆......☆

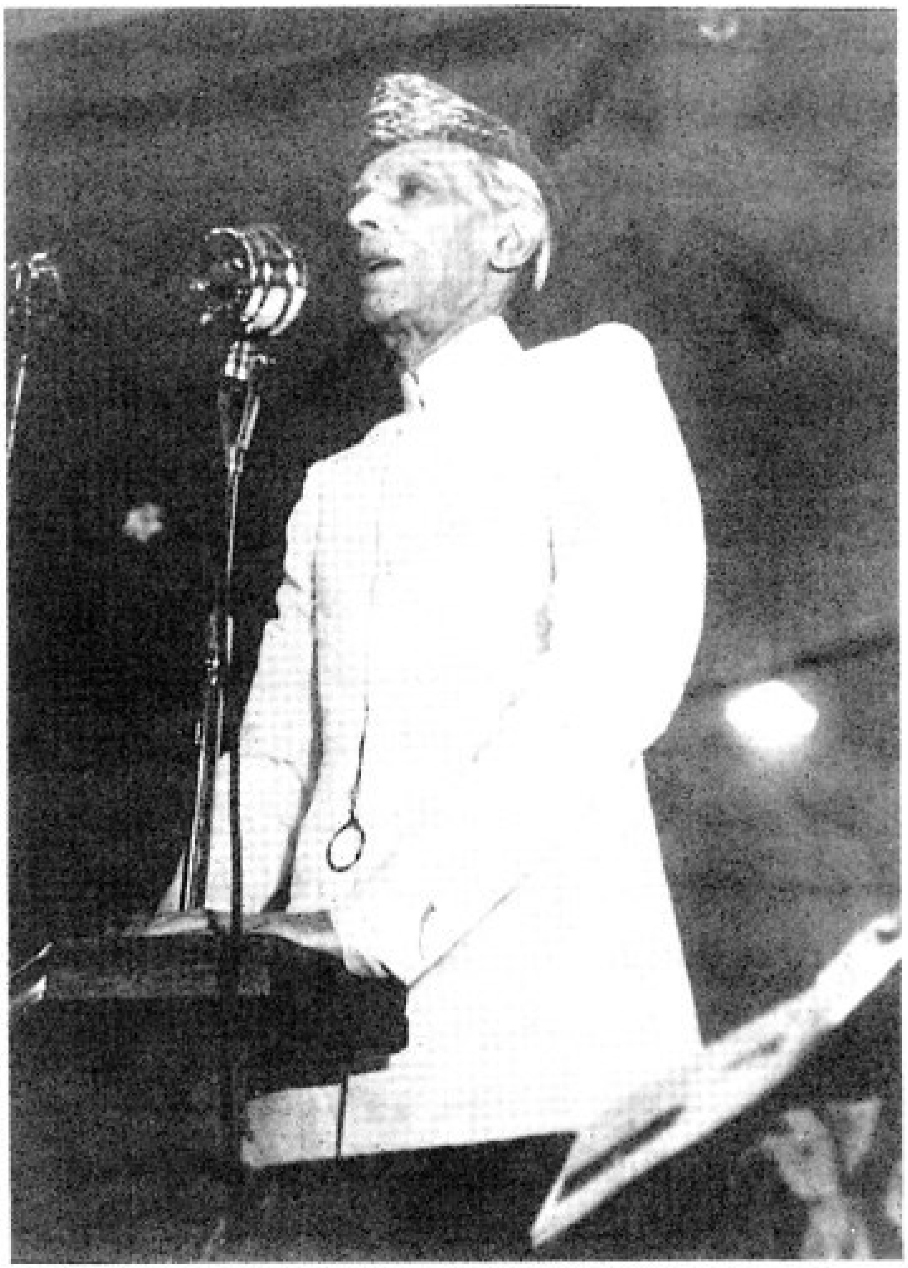

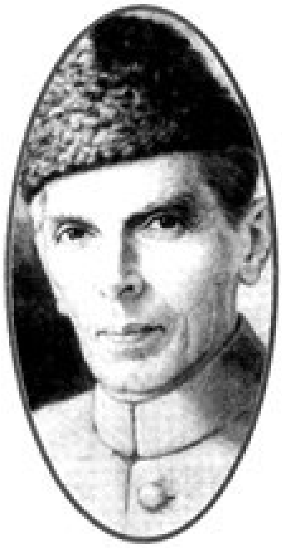

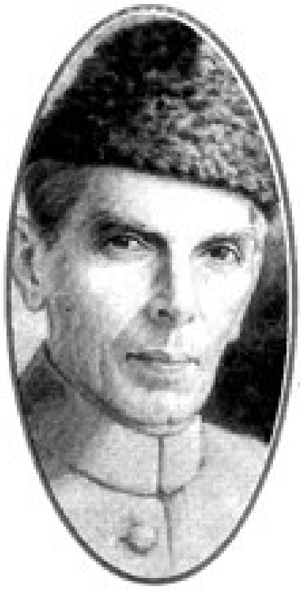

آزادی کا پیغام

قائداعظم کے بارے میں ایک بہت دلچسپ تحریر معروف شاعر اور مزاح نگار سید ضمیر جعفری مرحوم کی ہے، جو 1970ء میں شائع ہوئی۔ اس کا عنوان ہے "قائد کی خوداعتمادی" یہ تحریر اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے تاکہ اس جذبے کا اندازہ کیا جا سکے جو ان دنوں مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں مچل رہا تھا۔

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں: "میں ان دنوں ہندوستان کی غیر منقسم فوج کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبۂ تعلقات عامہ کے ساتھ منسلک تھا، جس کا ہیڈ کوارٹر سنگاپور کی چودہ منزلہ "کیتھے بلڈنگ" میں واقع تھا۔"

1947ء کے موسم بہار میں پنڈت جواہر لال نہرو نے نئی دہلی میں جو ایشیائی کانفرنس بلائی اس میں انڈونیشیا کے پہلے وزیراعظم ڈاکٹر سلطان شہریار بھی شریک ہوئے تھے۔ واپسی پر جکارتہ جاتے ہوئے وہ ایک روز کیلئے سنگاپور بھی رکے ہم نے درخواست کی کہ ہمارے میس میں آکر چائے پئیں۔ اسی شام ہمارا معزز مہمان ہمارے فوجی میس کے ناریلوں اور بانسوں سے بنے ہوئے کمرے میں ہمارے درمیان تھا۔ قدرتی طور پر ہم قائداعظم کے متعلق کچھ جاننا چاہتے تھے۔

"آپ ہمارے قائداعظم سے بھی ملے؟" ہم میں سے کسی نے سوال کیا۔ ڈاکٹر شہریار بولے: "مجھے خود ان سے ملنے کا ایک مدت سے اشتیاق تھا' خوشی ہے کہ زندگی کی یہ تمنا پوری ہوگئی۔ مسٹر جناح بے حد پُرکشش آدمی ہیں' ایک مقناطیسی شخصیت۔ میری ملاقات اگرچہ مختصر تھی' لیکن میں بہت ہی گہرے نقوش لے کر آیا ہوں۔"

"آپ کی قائداعظم سے کیا باتیں ہوئیں؟"

"انہوں نے میری ہر بات کو شفقت اور وابستگی کے گہرے احساس کے ساتھ سنا۔ مسٹر جناح کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا' وہ ان کی خوداعتمادی اور صاف گوئی ہے۔" قائد نے مجھ سے کہا: "ڈاکٹر شہریار! مجھے صاف صاف بتاؤ کہ انڈونیشیا کے مسلمان براعظم ہند کے مسلمانوں سے کیا توقعات رکھتے ہیں' ہم ان کی ہر ممکن امداد کیلئے تیار ہیں۔" ان کی آواز میں صداقت اور خلوص کی ایک ایسی قوت تھی' جو میں نے بہت کم لیڈروں میں دیکھی ہے' بہت ہی کم۔

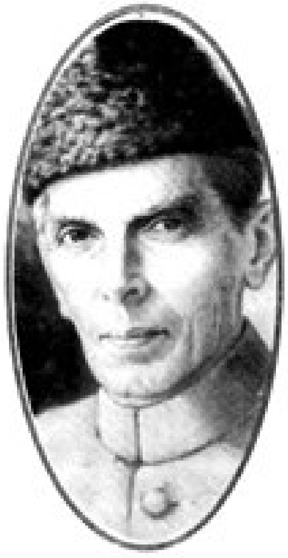

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں: "ہمارا دوست ٹونی جو اس زمانے میں پنڈت نہرو کا اندھا عقیدت مند تھا' بولا: "ڈاکٹر صاحب میں بھی آپ سے ایک صاف اور سیدھے سوال کا صاف اور سیدھا جواب چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ ہندوستان کے کس لیڈر سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے' مسٹر نہرو سے یا مسٹر جناح سے؟"

انڈونیشی وزیراعظم ڈاکٹر شہریار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "آپ لوگ یقیناً بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے ملک میں دو تین آدمی یقیناً اتنے بڑے ہیں کہ وہ دنیا بھر کے لیڈروں کے مقابلے میں لائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کی دوسرے سے برتری کا موازنہ کرنا میرا یا کسی بھی شخص کا منصب نہیں کیونکہ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ ویسے بھی آپ کے لیڈر اصل میں ہماری جنگ لڑ رہے ہیں' ایشیا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ البتہ میری رائے میں آج ایشیا کی روندی مسلی ہوئی انسانیت مسٹر جناح کی طرف دیکھ رہی ہے کیونکہ وہ صرف سیاستدان ہی

نہیں، انسانی حقوق آزادی اور مساوات کے علمبردار بھی ہیں اور سب قوموں کے بارے میں ایسا ہی چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ آزاد ہو گئے تو ہم بھی غلام نہیں رہ سکتے۔"

پھر ڈاکٹر شہریار نے اپنے کاغذات کے تھیلے میں سے سرخ رنگ کی ایک آٹوگراف بک نکال کر اس کے ایک ورق پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہ دیکھئے، آپ کے قائداعظم کے دستخط، یہ میں نے اسی ملاقات میں حاصل کیے تھے۔"

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں، واقعی آٹوگراف کے سفید ورق پر ہمیں قائداعظم کے مانوس و محبوب دستخط ثبت نظر آئے۔ دستخط کے اوپر بحروف انگریزی یہ الفاظ تحریر تھے:

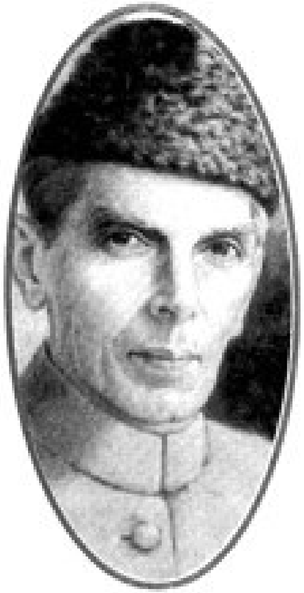

Live and let live.

قائداعظم کے دستخط کے نیچے کسی انگریزی نظم کے دو بند تھے اور پھر مسز سروجنی نائیڈو کے دستخط تھے۔

وطن سے ہزاروں میل دور پردیس میں بیٹھے ہوئے قائداعظم کے مبارک ہاتھ کی تحریر دیکھتے ہی جوش و حرارت سے ہم جذباتی ہو گئے اور آداب و قواعد اور فرق مراتب کی تمام حدود توڑ تاڑ کر سارے مسلمان نوجوان یکبارگی آٹوگراف بک پر ٹوٹ پڑے۔ جیسے اچانک کوئی آسمانی نعمت ہمارے سامنے آگئی ہو۔ انڈونیشی وزیراعظم ڈاکٹر سلطان شہریار اس منظر سے بہت متاثر ہوئے اور تاثر میں ڈوبی ہوئی تقریباً گلوگیر آواز میں پاس بیٹھے ہوئے قوم پرست لیڈر واتو جعفر بن عون سے کہنے لگے: "مسٹر جناح واقعی بہت بڑی قوت ہیں۔"

اور ان کے پاس بیٹھے ہوئے ملایا کے گورنر جنرل مسٹر میلکم میکڈانلڈ نے کہا: "آج پتہ چلا مسٹر جناح کی قوت اور تمکنت کا راز کیا ہے۔ ان کی پشت پر پوری قوم ہے اور خاص طور پر یہ نوجوان جوان کے دیوانے ہو رہے ہیں۔"

☆......☆......☆

قائداعظمؒ کی بیگم مریم جناح

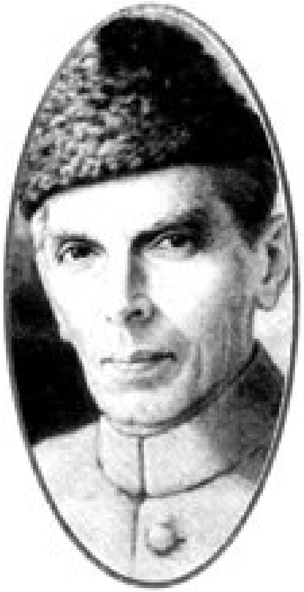

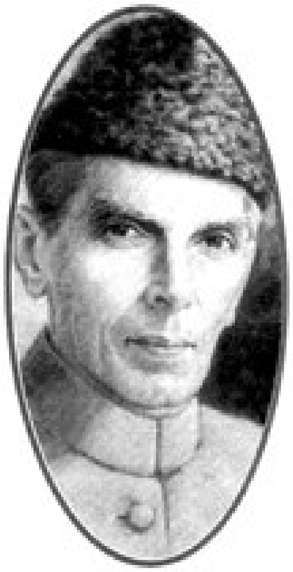

ظاہر داری سے نفرت

"اپنا قائداعظم ایک" یہ کتاب کا نام ہے جو ستار طاہر مرحوم نے قائد کی زندگی پر لکھی۔اس کتاب سے چند واقعات پیش خدمت ہیں' ستار طاہر لکھتے ہیں:

"1939ء میں قائداعظم شملہ گئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ پورے شہر کو سجایا گیا' سڑکوں پر محرابیں کھڑی کی گئیں۔ رات کو ان گنت قمقموں کی جگمگاہٹ نے عجب سماں باندھ دیا۔ شملہ کی لوئرمال روڈ کو بیش قیمت شاندار قالینوں سے سجایا گیا۔ شملہ میں قائداعظم کے ہمراہ محترمہ فاطمہ جناح' لیاقت علی خاں' مولوی اے کے فضل الحق' حسین شہید سہروردی' خواجہ ناظم الدین' مولانا ظفر علی خاں' حسرت موہانی' مولانا شوکت علی' نواب سر محمد سعداللہ خاں' عبدالمتین چودھری' سردار اورنگزیب' راجہ صاحب محمود آباد' حاجی عبدالستار' اصفہانی اور اسحٰق سیٹھ بھی گئے تھے۔

رات کو جامع مسجد میں قائداعظم کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے جلسے میں دو نعتیں پڑھیں اور تقریر بھی کی۔ مولانا شوکت علی نے بھی تقریر کی۔ حسین شہید

سہروردی بھی بولے۔"

قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا: "مسلمانو! ایک ہو جاؤ' ایک ہو جاؤ۔ یہ اللہ اور رسول کا حکم ہے۔" تقریر کے بعد بعض لوگوں نے عقیدت سے قائداعظم کے ہاتھ چومنے کی کوشش کی' جس پر انہوں نے فرمایا: "ہم سب مسلمان برابر ہیں' میں آپ سے برتر نہیں ہوں۔"

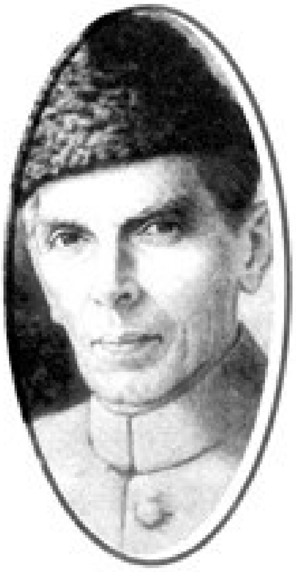

قائداعظم کی بیگم رتی جناح جن کا اسلامی نام مریم رکھا گیا تھا' کے بارے میں بھی اس کتاب میں ایک واقعہ درج ہے۔ "اپنے جری اور بہادر شوہر کی طرح بیگم رتی جناح بھی حق گوئی اور بے باکی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ بیگم رتی جناح ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے ہاں قائد سمیت دوپہر کے کھانے پر مدعو تھیں۔ باتوں باتوں میں وائسرائے نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا: "مسز جناح' میری بڑی خواہش رہی ہے کہ میں جرمنی جاؤں' مگر افسوس کہ میں جا نہیں سکتا۔"

"آپ جرمنی کیوں نہیں جاسکتے؟" بیگم جناح نے وائسرائے سے پوچھا۔

"جرمن عوام ہم برطانیہ کے لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔" لارڈ ریڈنگ نے جواب دیا۔

بیگم جناح نے لارڈ ریڈنگ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا: "تو پھر آپ ہندوستان کیسے چلے آئے؟"

وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کا چہرہ یکدم بجھ گیا۔ بیگم جناح نے بڑی معصومیت اور سادگی سے انہیں احساس دلایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ بھی انہیں اور ان کی حکومت کو پسند نہیں کرتے۔ ایسی بات بڑے سلیقے اور طریقے سے قائد کی بیگم ہی کہہ سکتی تھیں۔

قائد کو بناوٹ اور ظاہرداری سے کس قدر نفرت تھی' اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک بار صوبہ سرحد کے دورے میں پارلیمانی بورڈ کے ارکان قائداعظم محمد علی

جناح سے ملنے کیلئے آئے۔ ان میں خان عبدالقیوم خاں' ڈاکٹر سی۔ سی گھوش اور قائم شاہ شامل تھے۔ قائداعظم نے ان سے طویل گفتگو کی۔ مسلم لیگ کے مخالفین فیصلہ کر چکے تھے کہ قائد کے دورے کو ناکام بنائیں گے۔ سادہ لوح مسلمانوں کو قائد سے الگ کرنے کیلئے پشاور اور صوبہ سرحد کے باقی علاقوں میں کانگریس سے تعلق رکھنے والوں نے پراپیگنڈہ کیا کہ مسٹر جناح انگریزی لباس اور انگریزی ہیٹ پہنتے ہیں۔ ان کا مقامی لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک مقامی لیڈر پیر بخش یہ پراپیگنڈا سن کر قائد کے پاس آئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ شام کے جلسے میں انگریزی ٹوپی کے بجائے رومی ٹوپی پہن کر جائیں۔ قائد نے یہ مشورہ سنا تو غصے میں بولے:

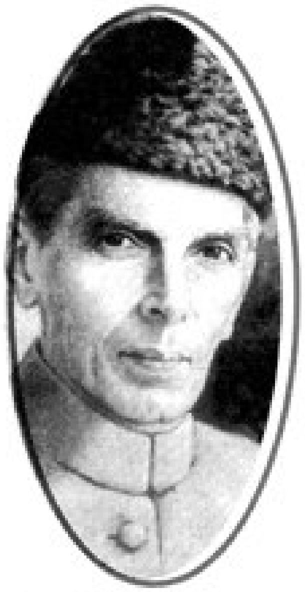

''مسٹر پیر بخش میں مکر و فریب کی سیاست کو پسند نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کے ساتھ فریب نہیں کروں گا۔ میں جو لباس پہنتا ہوں وہی پہن کر پشاور کے مسلمانوں کے سامنے سٹیج پر جاؤں گا۔ لوگوں کو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ میں کس قسم کا لباس پہنتا ہوں بلکہ انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' یوں قائد انگریزی لباس پہن کر اس جلسے میں گئے اور تقریر کی۔ انہوں نے کہا: ''میں اُردو اچھی طرح نہیں بول سکتا لیکن اسے بخوبی سمجھ لیتا ہوں۔ جو بات کہنا چاہتا ہوں' آپ میری بات سنیں اور جو لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں' میرا ساتھ دیں کیونکہ مسلمانوں کیلئے اس میں بہتری ہے۔''

قائد کی اسی صاف گوئی نے ان کیلئے مسلمانان برصغیر کے دل میں عزت واحترام پیدا کیا اور ظاہرداری اور منافقت سے ان کی نفرت نے بالآخر ایک سچے اور کھرے لیڈر کی حیثیت سے انہیں تاریخ عالم میں ایک باعزت اور باوقار مقام عطا کیا۔

☆......☆......☆

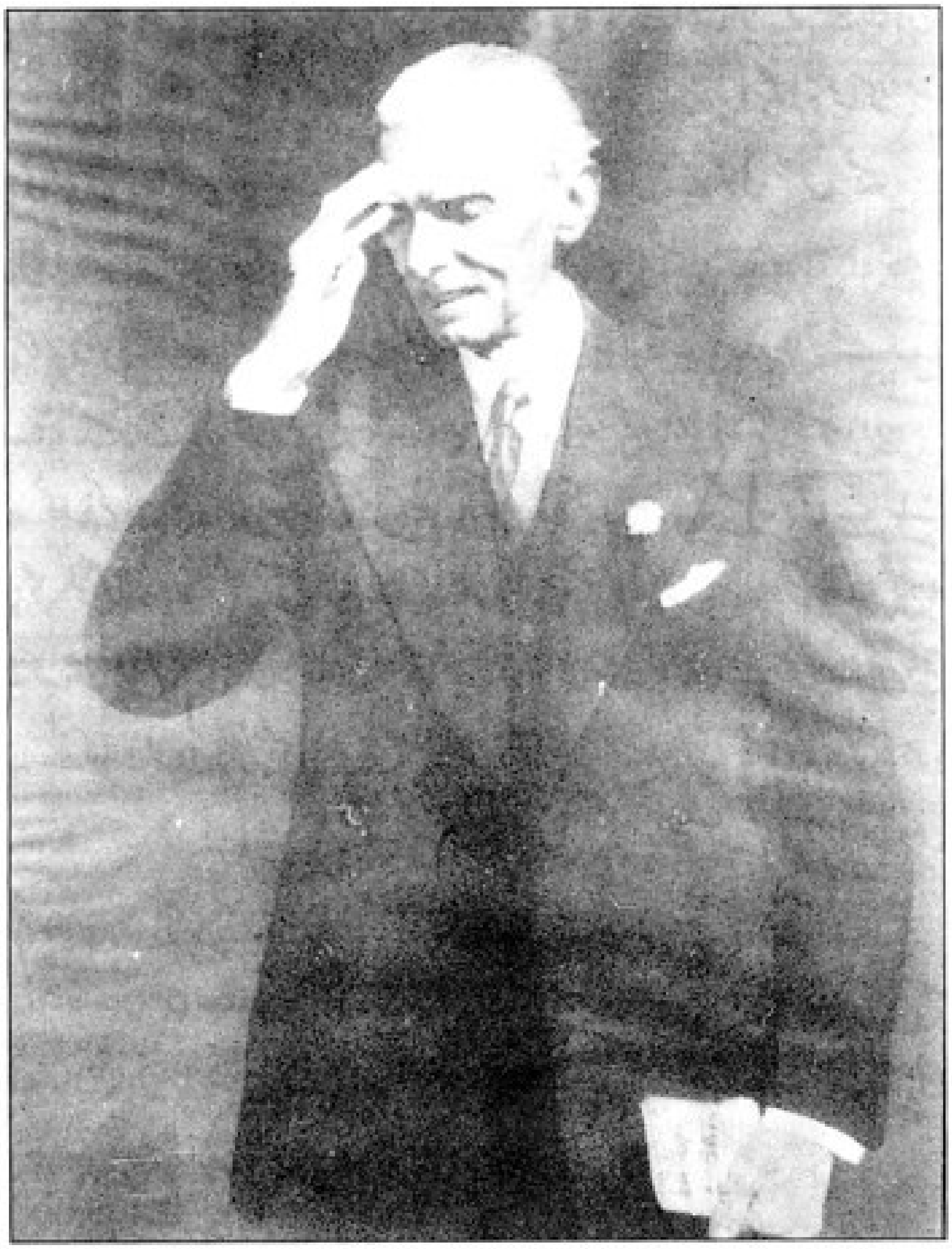

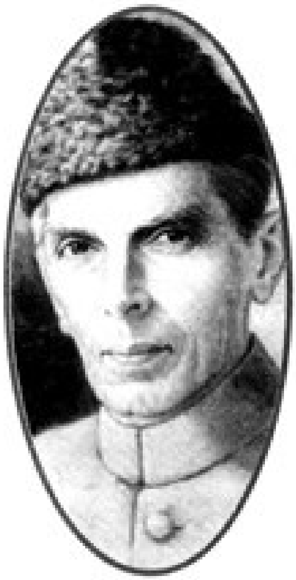

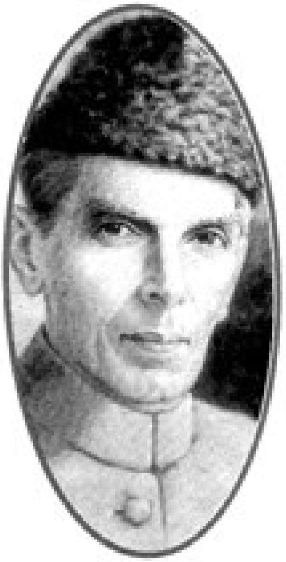

آزادی کے لئے تڑپ

قائداعظم کی ذاتی زندگی کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ان کے دورۂ لاہور میں پیش آیا۔
3مارچ 1941ء کا ذکر ہے' قائداعظم آسٹریلیا مسجد نزد ریلوے سٹیشن نماز عصر ادا کرنے کیلئے گئے۔ مسجد نمازیوں سے کھچاکھچ بھری تھی۔ مرزا عبدالحمید تقریر کر رہے تھے۔ قائداعظم اچکن اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے۔ انہیں دیکھتے ہی لوگوں میں ہلچل مچ گئی لیکن قائداعظم نے ایک اشارے پر نظم وضبط کو بگڑنے نہ دیا۔ لوگوں نے انہیں اگلی صف میں جگہ دینے کیلئے راستہ بنادیا مگر قائد نے اگلی صف میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"میں چونکہ دیر سے پہنچا ہوں اس لئے میری جگہ یہیں ہے' جہاں ہونی چاہئے۔"

قائد نے پچھلی صف میں ہی بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ قائد کے جوتے اٹھانے کی سعادت حاصل کرے' کئی لوگ اصرار کر رہے تھے مگر قائد انکار کرتے رہے۔ اپنے جوتے خود اٹھائے' کچھ لوگوں نے ان سے جوتے لینے چاہے تو انہوں نے جوتوں پر گرفت مضبوط کر دی اور لوگوں کے درمیان ننگے پاؤں چلتے رہے اور کسی شخص کو اپنے

جوتے اٹھانے کی زحمت نہ دی۔اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد اپنی پوزیشن کی بنیاد پر مراعات لیناکس قدر ناپسند کرتے تھے۔

اس دورے کا ایک اور واقعہ قائد کا طلبہ سے خطاب ہے' جس کا ایک حصہ ان کے دلی جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ 1941ء کے مارچ میں قائد لاہور آئے تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے' جس کا انعقاد نیڈوز ہوٹل کے لاؤنج میں ہوا تھا۔اس تقریب میں قائداعظم طالبعلموں کے ساتھ بے تکلفی سے گھل مل گئے اور نوجوانوں کی ایک پُرجوش ٹولی سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ابتدائی دور وکالت کے بارے میں کہا:

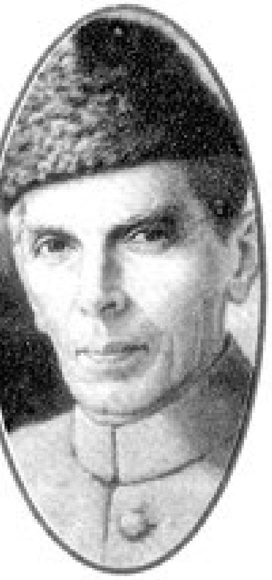

"جب میں شروع میں بطور وکیل پریکٹس کرنے لگا تو بمبئی میں کئی ذہین وکیل پہلے سے موجود تھے۔پارسی' انگریز اور ہندو وکیلوں کا طوطی بولتا تھا۔ان غیر مسلم وکلاء میں مجھے اپنی جگہ بنانے کیلئے شدید محنت کرنی پڑی۔ میں جس طرح کی زندگی ایک زمانے میں بسر کر چکا ہوں' وہ آپ کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ میں نے اپنے پیشے میں جو شہرت اور دولت کمائی' وہ میری شب وروز کی محنت کا ثمر ہے۔میں اپنی محنت سے جو کما چکا ہوں' وہ اس لحاظ سے میرے لئے بہت کافی ہے کہ میں اس سے اپنی باقی ماندہ زندگی آرام واطمینان اور پورے وقار سے گزار سکتا ہوں۔ اس قدر سخت اور لمبے عرصے کی محنت کے بعد میں ریٹائرمنٹ کا استحقاق رکھتا ہوں لیکن ریٹائر ہونا پسند نہیں کرتا۔ میرے نزدیک مال و دولت کی کثرت' عزت اور شہرت بے معنی ہیں کیونکہ میں غلام قوم کا ایک غلام فرد ہوں۔ غلامی کا احساس مجھے بے چین رکھتا ہے اور میں آزادی کیلئے تڑپ رہا ہوں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جس کا تقاضا ہے کہ میں آرام سے بیٹھوں' لیکن میں ملک کے مختلف حصوں میں شہر شہر گھوم پھر رہا ہوں کہ مسلمانوں کیلئے آزاد ریاست حاصل کر سکوں۔ میں اپنے اس مقصد کے مقابلے میں ہر آسائش' مال وزر' عزت اور شہرت

سبھی کو کمتر اور حقیر سمجھتا ہوں۔ میں مسلمانوں کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ کی رحمت سے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

جمہوریت اور شہری آزادیوں کیلئے قائد کی محبت اس قدر زیادہ تھی کہ انہوں نے انگریز کے بنائے ہوئے ایک کالے قانون کے خلاف مرکزی قانون ساز کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات خاصے بڑھ گئے تھے۔ عوام میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت میں اس حد تک اضافہ ہو چکا تھا کہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانوی حکومت صورتحال سے بوکھلا گئی اور مرکزی کونسل میں ایک ترمیم پیش کر دی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ضابطہ فوجداری میں یہ گنجائش پیدا کی جائے کہ حکومت جب اور جیسے چاہے عوامی مظاہروں کو دبا سکے۔ اس ترمیم کی بنا پر حکومت کو غیر معمولی اختیارات مل گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے، جو ان دنوں اس مجلس کے رکن تھے، اس ترمیم کی بے حد مذمت اور مخالفت کی۔ انہوں نے کہا: "میں اس مسودۂ قانون پر شدید اعتراض کرتا ہوں۔" 20 مارچ 1919ء کو انہوں نے اس عوام دشمن کالے قانون کے خلاف وائسرائے ہند کے نام ایک کھلا خط لکھا۔ یہ خط قائد کی عظیم شخصیت کا ترجمان ہے اور ایک تاریخی دستاویز بھی۔ خط کا متن حسب ذیل ہے:

"جناب والا! عوامی امنگوں کے خلاف رولٹ بل کی منظوری اور آپ کی تصدیق کے بعد برطانوی انصاف کے بارے میں عوام کے اعتماد کو شدید ٹھیس پہنچی ہے۔ اس کے علاوہ امپیریل کونسل کی تشکیل کی اصل حقیقت بھی عوام پر ظاہر ہو گئی ہے۔ دعویٰ تو کیا جاتا ہے کہ امپیریل کونسل قانون سازی کا اختیار رکھتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کونسل غیر ملکی حکومت کی انتظامیہ کی آلہ کار ہے۔ کونسل کے ارکان کی رائے اور عوام کے جذبات کا مطلق خیال نہیں رکھا گیا، انصاف کے بنیادی اصولوں اور عوام کے آئینی حقوق کو ایک سنگدل اور گھٹیا نوکر شاہی

نے ایسے موقع پر ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے جب حکومت کو کسی طرح کا خطرہ لاحق نہ تھا۔ یہ نوکر شاہی نہ تو عوام کے سامنے جوابدہ ہے اور نہ اسے عوامی جذبات کا احساس ہے۔ اس مسودۂ قانون کی منظوری اور اس قانون کو جس طرح منظور کیا گیا ہے' اس کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے میں امپیریل کونسل سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی کونسل میں شمولیت سے میرے ملک کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ بات کسی بھی شخص کی عزت نفس کے منافی ہے کہ وہ کسی ایسی حکومت سے تعاون کرے' جس نے کونسل کے ایوان میں عوامی نمائندوں اور ایوان سے باہر ملک کے عوام کی رائے کو سرے سے نظرانداز کر دیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حکومت زمانہ امن میں اس قسم کے قانون کی منظوری دیتی ہے' اسے مہذب حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے آج بھی امید ہے کہ وائسرائے ہند برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اس کالے قانون کو منظور نہ کریں۔"

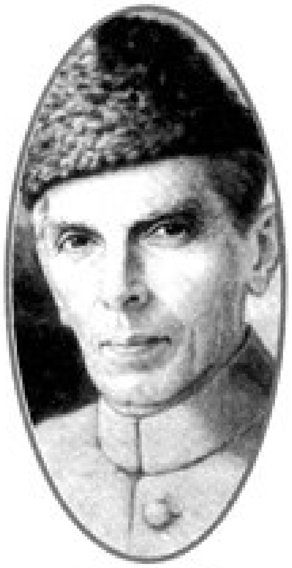

قائد کے اس استعفیٰ نے ثابت کر دیا کہ وہ اصول پرست اور کھرے سیاسی رہنما ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کی ریاکاری کا بھرم کھول دیا' البتہ قائد آئینی انسان تھے۔ اس لئے احتجاج کیلئے بھی آئینی ذرائع اختیار کرتے تھے۔

☆......☆......☆

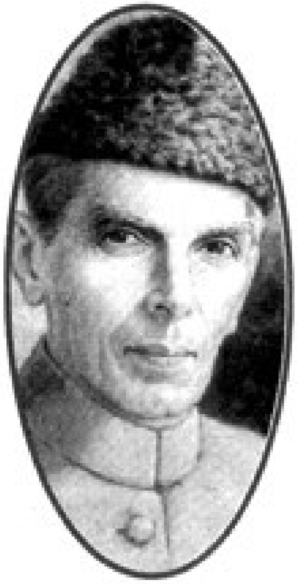

مفتی اعظم فلسطین کا خط

قائداعظم جب پاکستان کی آزادی کیلئے جنگ کر رہے تھے اس وقت بھی جانتے تھے کہ غیر منقسم ہندوستان سے باہر عالم اسلام کے کیا مسائل ہیں اور وہ بھرپور انداز میں عالم اسلام کے سلگتے ہوئے مسائل پر نظر رکھتے تھے۔ ذیل میں ہم مفتی اعظم فلسطین کا قائداعظم کے نام ایک خط جو عربی زبان میں ہے اور جو قائد کے خطوط پر مشتمل مجموعے "صرف مسٹر جناح" میں اصل اور ترجمے کے ساتھ موجود ہے، پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

"عزت مآب جناب محمد علی جناح صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، میں پہلی دفعہ آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں۔ میرا یہ خط آپ کی ان گراں قدر خدمات پر آپ کیلئے اظہار تشکر ہے جو آپ احکام خداوندی کے مطابق اخوت اسلامی اور مسلمانوں کے مابین تعاون کی خاطر ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ سارے اسلامی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کیلئے انجام دے رہے ہیں۔

میں اس پُرجوش دلچسپی پر بھی سپاس گزار ہوں جو ہندوستان کے مسلمان عالم اسلام

کے دوسرے مسلمان بھائیوں کے معاملات میں لیتے ہیں' چاہے وہ فلسطین ہو یا طرابلس' شام ہو یا جاوا یا کوئی دوسرا ملک۔ آپ لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں جذبہ تعاون زندہ ہو گیا ہے۔ میں آپ کا بالخصوص مسلم لیگ کا اس غیر معمولی التفات پر بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو آپ نے مجھے عطا کیا۔ کیونکہ میری جلاوطنی کے دوران میں جب حالات بے حد کٹھن تھے آپ کی آواز پہلی اسلامی آواز تھی جو میرے کانوں تک پہنچی اور اس کا تاثر شاندار تھا۔

میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ساری کی ساری اسلامی دنیا آپ کے اور مسلم لیگ کے موقف کی قدر اور مسلمانوں کیلئے آپ کی مسلسل اور بابرکت کوشش کی ستائش کرتی ہے اور تہہ دل سے ہندوستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے مفاد اور ان کے ساتھ تعاون میں اپنی کوششیں مجتمع کرنا چاہتی ہے۔ میرے نزدیک یہ اشد ضروری ہے کہ ہمارے درمیان رابطہ مسلسل اور مستحکم ہو۔ میں ان تمام بھائیوں کیلئے' جو مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں آپ کے ساتھ رابطہ اور تعاون کئے ہوئے ہیں' جو کچھ بھی ممکن ہوا کروں گا۔

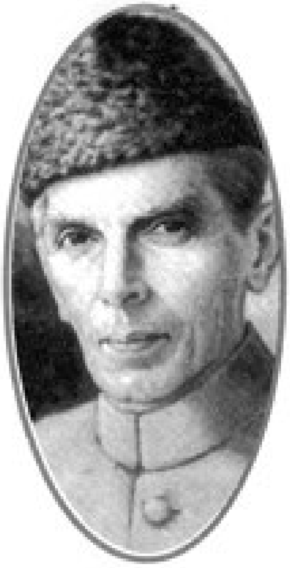

اپنے اس پیغام کے ساتھ میں آپ کی توجہ فلسطین کی گمبھیر صورتحال اور ہر ملک کے مسلمانوں کی حمایت کی ضرورت کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا کیونکہ فلسطین مقدس اسلامی ملک ہے جس کا تعلق ہر مسلمان سے ہے اور یہ ایک اسلامی کاز ہے۔ مزید برآں' فلسطین پر جارحیت بھی خالصتاً مذہبی وجوہ کے باعث ہے۔ کیونکہ صیہونی تحریک اصلاً ایک مذہبی تحریک ہے اور یہودی مذہبی محرکات کے تحت فلسطین پر اپنی بالادستی کیلئے کوشاں ہیں۔ اس میں اہم ترین محرک ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تسخیر ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اسی جگہ تھا جہاں اب مقدس مسجد اقصیٰ ہے' جیسا کہ ان کے ذمہ دار لیڈر اس کا اظہار کھلے بندوں اور بار بار کر چکے ہیں۔ لہٰذا جن اہم ترین وجوہ نے انگریزوں اور امریکیوں کو یہودیوں کی امداد پر آمادہ کیا ان میں بڑی وجہ مذہبی کاز ہے' یعنی بعض مذہبی پیش گوئیوں کی ظہور پذیری۔ لہٰذا یہ دنیا بھر کے

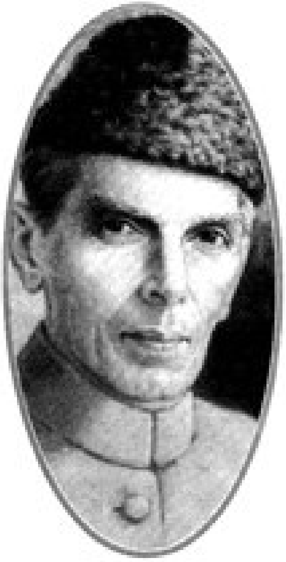

مسلمانوں کا حق بلکہ فرض عین ہے کہ وہ اس اسلامی کاز کی طرف بھرپور توجہ دیں اور اپنی تمام تر کوششوں کا رخ اس طرف موڑ دیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں ہمارے مسلمان بھائیوں کی آواز نے غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔ آپ کے انتھک کارکنوں کے خلوص کا شکریہ' بالخصوص جو انگلستان میں ہیں' اس لئے کہ ان کا تعاون اور آواز غیر معمولی نتائج کی حامل ہو گی۔

دراصل عام انگریزوں کی توجہ اس غیر معمولی امتیازی برتاؤ کی طرف دلانا بہت اہم ہے جو ان کی حکومت کی طرف سے عربوں اور یہودیوں کے مابین روا رکھا جا رہا ہے۔ جیسا کہ عربوں کو قید کر لیا گیا ہے اور جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ فلسطین کے بہت سے مسلمان لیڈروں میں سے بعض کو رہوڈیشیا (جنوبی افریقہ)' بعض کو یورپ اور بہت سوں کو ترکی' حجاز' عراق اور مصر وغیرہ میں زبردستی بھیج دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی کیلئے فلسطین میں کوئی بھی نہیں رہا۔

دوسری طرف کسی بھی یہودی لیڈر کو نہ تو جیل بھیجا گیا ہے اور نہ ہی جلاوطن کیا گیا ہے' حالانکہ انہوں نے بڑے مکروہ حملے کئے تھے اور اس کے باوجود کہ انہوں نے لارڈ میان کو قتل کر دیا' اور وہاں کے برطانوی ہائی کمشنر سر مائیکل اور اس کے رفقائے کار کو ہلاک کرنے کی کوششوں میں بُری طرح زخمی کر دیا۔

یہودیوں نے برطانوی پولیس اور فوج کے کئی افسر اور آدمی قتل کر دیئے۔ سرکاری عمارتیں تباہ کر دیں۔ برطانوی بارود خانہ لوٹ لیا اور کئی ظالمانہ فعل کئے۔ ان کے بعض انتہا پسند لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریروں کے باوجود انگریزی حکومت یہودیوں' ان کے لیڈروں اور ان کی تنظیموں کو پوری آزادی' سہولت اور امداد دے رہی ہے۔ آج عملاً صورتحال یہ ہے کہ وہ ہمارے ملک میں جہاں مرضی سفر کریں اور جس طرح چاہیں مزے اڑائیں۔ اس کے برعکس ہم

اور ہمارے بھائی قید و بند اور جلاوطنی کے مصائب جھیل رہے ہیں اور وہ ہمیں اپنے ملک میں واپس آنے اور قیام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

امید ہے آپ میری گزارشات پر غور فرمائیں گے اور ہمیں اپنی مستقل حمایت سے نوازیں گے۔"

12/اکتوبر 1945ء
سید محمد امین الحسینی
مفتی اعظم فلسطین

قارئین کرام اس خط سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابھی پاکستان قائم نہیں ہوا تھا، پھر بھی مفتی اعظم فلسطین ہمارے قائد اعظم سے کیسی زبردست توقعات رکھتے تھے۔

☆......☆......☆

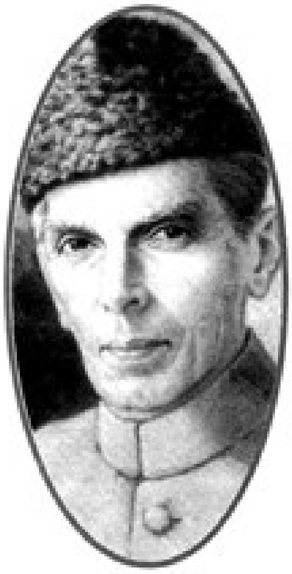

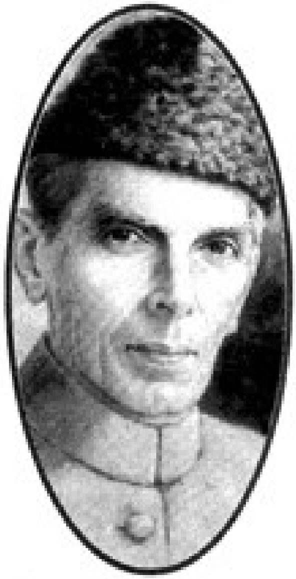

اقلیتوں سے رواداری

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، شروع میں قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی اور ایسے فارمولے دیئے کہ ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمان اقلیت کے سیاسی اور معاشی حقوق کی ضمانت دی جاسکے۔ مگر کانگریس نے ان معقول تجویزوں کو نظرانداز کردیا۔ اس پر کلکتہ کانفرنس میں قائد نے ایک طویل تقریر کی جس میں بڑے زور سے مسلمانوں کے مطالبات دہرائے اور کانگریس کی قائم کردہ نہرو کمیٹی کی تنگ نظری پر غم و غصے کا اظہار کیا۔

کلکتے میں قائد کی یادگار تقریر سننے والوں میں ایک پارسی، جمشید نوشیروان جی بھی تھے۔ آگے چل کر وہ شہر کراچی کے میئر بنے۔ وہ مسٹر جناح کے دوست اور ان کے بڑے مداح تھے۔ اپنے دوست کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مسٹر جناح کی یاد بڑی دلکش ہے۔ انہیں اپنے اوپر پورا قابو تھا اور وہ اپنے جذبات کا اظہار بہت کم کرتے۔ وہ کم آمیز اور باوقار تھے اور ان کی زندگی بہت تنہا تھی۔ میں آپ کو 1928ء کی کلکتہ کانفرنس کے متعلق ایک واقعہ سناؤں گا جس سے تصویر کا دوسرا پہلو بھی آپ کے سامنے

آجائے گا۔ مسٹر جناح نے حسب معمول عمدہ اور باوضع کپڑے پہنے ہوئے تھے جو وہ حال ہی میں انگلستان سے لائے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے بڑی زوردار تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ ان کا دل کتنا بڑا ہے۔ حالانکہ ان کا ایمان تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد ہو سکتا ہے۔ ان کا دل نفرت کے جذبے سے یکسر خالی تھا۔ مدتوں بعد، جب ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا، مسٹر جناح نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ پاکستان کے مسلمان اقلیتوں سے رواداری برتیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح بڑے انسان دوست شخص تھے۔ وہ آنسو بہانے کے عادی نہ تھے لیکن میں نے انہیں دو موقعوں پر روتے دیکھا۔ تقسیم ہند کے بعد میں ان کے ہمراہ ان ہندوؤں کا ایک کیمپ دیکھنے گیا جو پاکستان میں رہ گئے تھے۔ ان کی مصیبت دیکھ کر جناح رو پڑے۔ میں نے ان کے رخساروں پر آنسو چمکتے دیکھے۔

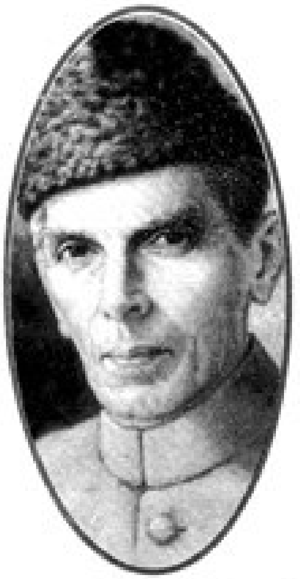

اس سے پہلے میں نے ان کے آنسو 1928ء میں کلکتہ کانفرنس کے بعد دیکھے تھے۔ جہاں انہوں نے بڑی خوبی اور قابلیت سے مسلمانوں کی وکالت کی تھی، مگر ان کے مطالبات رد کر دیئے گئے۔ کانفرنس میں کسی شخص نے مسٹر جناح کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ ان کے نمائندہ نہیں۔ مسٹر جناح کو اس پر رنج محسوس ہوا اور وہ اپنے ہوٹل میں واپس چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے مسٹر جناح کلکتے سے روانہ ہو گئے اور میں اسٹیشن پر انہیں خدا حافظ کہنے گیا۔ وہ اپنے فرسٹ کلاس کے ڈبے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولے: "جمشید یہ ہندوستان میں دو بڑی قوموں کے مابین جدائی اور تفریق کا آغاز ہے" اور میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔

ہیکٹر بولائتھو نے 1929ء کے محمد علی جناح کے بارے میں بہت اثر انگیز سطریں لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

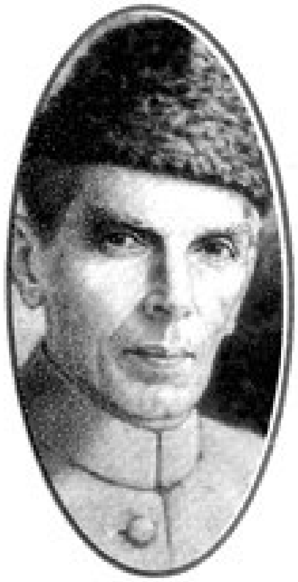

”پھر مسٹر جناح مالابار ہل پر اپنی عالی شان مگر ویران کوٹھی میں واپس چلے گئے۔ شادی شدہ زندگی کے جھگڑے اور شکررنجیاں اب ختم ہو چکی تھیں، مگر یہ سکون بڑا بے کیف اور تکلیف دہ تھا۔ مسٹر جناح کے دل پر ان دنوں ایک نہیں دو داغ تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی دیرینہ آرزو خاک میں مل چکی تھی، محبت ناکام ہو چکی تھی اور ان کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں جا چکی تھیں۔ وہ اپنی کوٹھی میں بالکل اکیلے تھے اور اس طرز زندگی سے ان کی وہ تنہائی پسندی اور بڑھ گئی جس نے ساری عمر ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان دنوں ایک پرانے دوست ان سے ملنے آئے اور انہوں نے رتن بائی کی زندگی کی آخری گھڑیوں کا حال انہیں سنانا چاہا، لیکن مسٹر جناح کی آنکھوں میں سرد مہری کے آثار دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ رتن بائی نے جن حسین و نایاب چیزوں سے گھر کو سجایا تھا وہ سب مسٹر جناح نے الماریوں میں بند کروا دیں اور اس زمانے کی ایک ایک تصویر اور یادگار گھر سے ہٹوا دی۔ ان کے رنج و الم کی مظہر صرف ایک نشانی رہ گئی، یہ ان کے کوٹ کی آستین پر سیاہ ماتمی پٹی تھی۔“

☆......☆......☆

قائداعظم مسلم لیگ ویمن نیشنل گارڈ کراچی کی ارکان کے ہمراہ

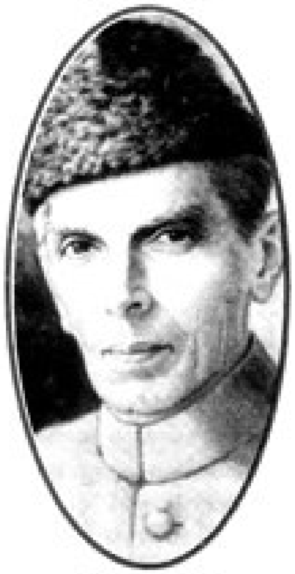

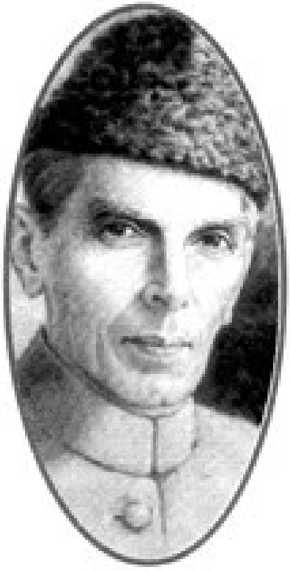

قائداور خواتین

”تحریک پاکستان اور مسلم خواتین“ یہ کتاب کا نام ہے جسے تحریک پاکستان کی نامور خاتون ورکر بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے لکھا۔ اس کتاب کے چند اقتباسات قائداعظم کی زندگی اور سوچ کے حوالے سے پیش خدمت ہیں، بیگم صاحبہ لکھتی ہیں:

”برصغیر کی خواتین نے قائداعظم کی ہدایات کے مطابق مسلم لیگ کے منشور کو عوام تک پہنچانے کی خدمات انجام دیں۔ پنجاب کی خواتین کی کارکردگی زیادہ تر انتظامی امور، وسیع سیاسی و تبلیغی جلسوں کے انعقاد، جلوسوں اور بین الصوبائی رابطے پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں پنجاب کی مسلم خواتین نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ سرحد کی خواتین کو سول نافرمانی جاری رکھنے اور سیاسی جوش و ولولہ کو زندگی دینے کا شرف حاصل ہے۔ سرحد کی خواتین نے شدید سیاسی پابندیوں کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس صوبے کی غیور اور بہادر خواتین نے کانگریسی وزارت کا غرور پارہ پارہ کر کے پاکستان کیلئے ریفرنڈم جیت لیا جبکہ یوپی میں مسلم لیگ کو بام عروج تک پہنچانے میں دلی کی خواتین کا کردار قابل فخر رہا۔

بنگال کے مشرقی و مغربی دونوں حصوں میں خواتین نے بھرپور کردار ادا کیا۔ مشرقی حصے کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ مسلم لیگ کا اولین اجلاس ہی ڈھاکہ میں ہوا جس کی صدارت بزرگ رہنما نواب وقار الملک نے فرمائی۔ خواتین مسلم لیگ کے قیام کا اعزاز بیگم حفیظ الدین کو حاصل ہے۔ بیگم محمد علی جوہر تو پہلے ہی سے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں۔ علاوہ ازیں منشی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار کی دختر فاطمہ بیگم نے 1901ء میں تکمیل تعلیم کے بعد بمبئی جا کر انسپکٹریس آف سکولز کا عہدہ سنبھالا اور بعدازاں وہیں سے مجلّہ "شریف بی بی" کا اجراء کیا تو ایک ملاقات میں قائداعظم نے ان سے کہا: "آپ کا تعلق لاہور سے ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو اس وقت باعمل خواتین کی شدید ضرورت ہے۔ آپ سرکاری ملازمت چھوڑیں اور لاہور جا کر ملک و قوم کیلئے مسلم خواتین کو منظم کریں۔"

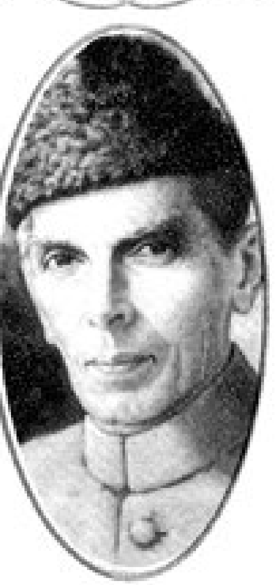

محترمہ فاطمہ بیگم نے بلا تامل اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ملازمت کو خیر باد کہا اور لاہور چلی آئیں۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی مسلم لیگ اور قوم کیلئے وقف کر دی۔ لاہور لوٹتے ہی انہوں نے متعدد زنانہ مدارس کھولے اور خواتین کو گھر گھر جا کر دعوت عمل دی۔ 1935ء میں جناح کالج کھولا جس کی عمارت نواں کوٹ میں آج بھی موجود ہے۔ ان کے جوش و جذبے کا عالم یہ تھا کہ اپنی تمام املاک قوم کیلئے وقف کر دی۔

1937ء میں پہلی بار برصغیر میں صوبائی سطح پر انتخابات کا آغاز ہوا تو مسلمان خواتین اپنے گھروں سے باہر نکلیں اور انہوں نے اپنے امیدواروں کو ووٹ دے کر کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔

بیگم سلمیٰ تصدق لکھتی ہیں: "فاطمہ بیگم نہایت شفیق، انتھک اور بے لوث خاتون تھیں۔ جذبہ ملی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کیلئے قریہ قریہ بستی بستی دورے کر کے رائے عامہ کو ہموار کرنا شروع کر دیا۔ چند ماہ بعد ہی یعنی 1938ء میں میری پہلی

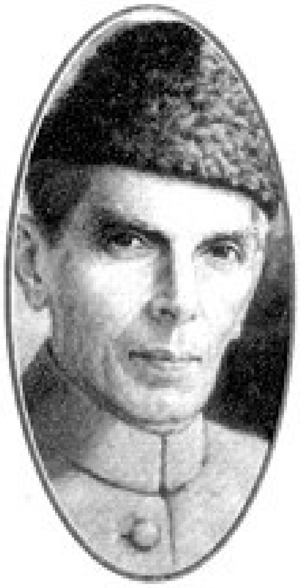

ملاقات قائداعظم سے لاہور میں اس وقت ہوئی جب انہوں نے ایک سکول کی عمارت میں خواتین سے خطاب کیا۔ اس موقع پر قائد نے بھی فاطمہ بیگم کو تاکید کی کہ وہ رضاکار لڑکیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیں کیونکہ عورتوں کے بغیر مسلم لیگ کیلئے آگے بڑھنا بہت مشکل ہو گا۔ یہ اسی تاکید کا نتیجہ تھا کہ کالجوں کی تو کیا سکولوں تک کی لڑکیاں میدان عمل میں اُتر آئیں۔ اسی سال یعنی 1938ء میں اسلامیہ کالج برائے خواتین کا قیام عمل میں آگیا۔

مسلمان خواتین میں تعلیمی شرح کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1915ء میں پہلی مسلمان لڑکی کوئین میری سکول لاہور سے میٹرک پاس کر کے نکلی۔ بعد ازاں خواتین مسلم لیگ کی پہلی جنرل سیکرٹری قدسیہ اعزاز رسول نے میٹرک کا امتحان دیا اور یوں دوسری مسلمان بچیوں میں حصول تعلیم کا شوق فزوں تر ہوتا گیا۔"

بیگم سلمیٰ تصدق حسین مزید لکھتی ہیں: "صوبہ سرحد جیسے قدامت پرست علاقے میں بھی مسلمان خواتین نے فتح ونصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے اور انگریزی حکومت کے ساتھ کانگریس کا غرور بھی پارہ پارہ ہوگیا۔ اسی سال مجھے قائداعظم نے خاص طور پر دلی طلب فرمالیا کیونکہ وہ پشاور کی سول نافرمانی کی روداد سننے کے خواہاں تھے۔ حکم ملتے ہی میں دلی پہنچی اور قائداعظم نے ازراہ کرم اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر مجھے وقت عنایت فرمایا۔

میں نے انہیں لحہ بہ لحہ رپورٹ پیش کی۔ خواتین کی جرأت کی مکمل داستان سنائی اور پشاور میں مسلم لیگی خواتین کی گورنر اور وائسرائے دونوں سے ملاقات کے دوران بات چیت بھی حرف بحرف سنائی۔ انہوں نے تمام روداد کمال توجہ سے سنی' وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے رخصت کرتے وقت تک ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی رہی۔ انہوں نے شاباش دیتے ہوئے کہا:

"مجھے مسلم خواتین سے یہی امید تھی۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میری قوم کی خواتین

زندہ ہیں، وہ آئندہ بھی ہمیں اپنے عمل سے اپنی زندگی کی بہترین کارکردگی کا ثبوت دیں گی۔ وہ وقت دور نہیں جب ہمیں پاکستان مل جائے گا اور پھر آپ خواتین ہی کو اسے سنبھالنا ہوگا۔"

چلتے وقت قائداعظم نے مجھ سے فرمایا:

"آپ سارے ہندوستان سے سرگرم خواتین لے کر پھر سرحد جائیں اور ریفرنڈم کیلئے پوری ہمت اور تندہی سے کام شروع کردیں تاکہ ہم ریفرنڈم جیت کر سرحد کو پاکستان میں شامل کرسکیں۔"

☆......☆......☆

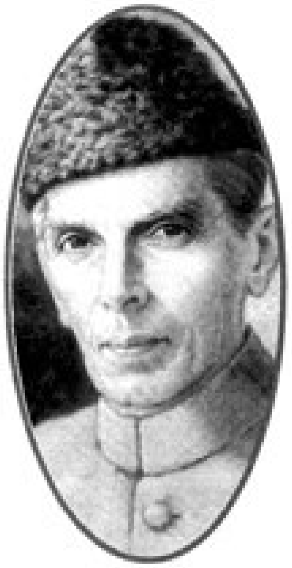

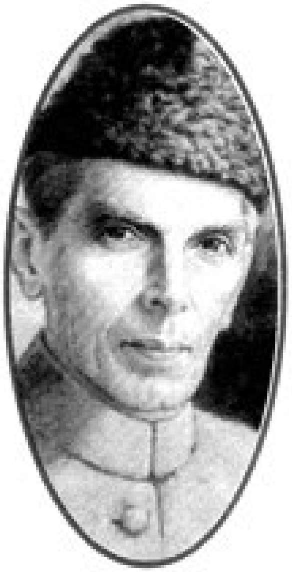

ایک دلچسپ ملاقات

قائد کی داستان حیات کے حوالے سے ذکر ہو رہا تھا بیگم سلمیٰ تصدق حسین کی کتاب ”تحریک پاکستان اور مسلم خواتین“ کا۔ صوبہ سرحد میں پاکستان کے مطالبے کے حق میں ریفرنڈم کے دوران مسلمان خواتین کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

انتخابات کے بعد بہار کے مسلم کش فسادات پھر تحریک سول نافرمانی اور آخر میں سرحد میں ریفرنڈم‘ یکے بعد دیگرے یہ سارے کام سر پر تھے۔ بمشکل وقت نکال کر گھنٹہ بھر بھی آرام کرتے تو رات کروٹیں لیتے گزر جاتی اور خیال آتا کہ کل کیا ہوگا۔ جو کام قائداعظم نے خود بلا کر سونپا ہے کہیں اس میں ناکام نہ ہو جائیں۔ ادھر قائداعظم کا حکم تھا‘ جسے پورا کرنا جزو ایمان تھا۔ ہم نے صوبہ سرحد کے دیہی علاقوں کیلئے خواتین کے گروپ تشکیل دیئے‘ بیشتر مقامات پر پشتو میں تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ریفرنڈم تو 6 جولائی سے 17 جولائی تک رہا مگر ہماری مصروفیات بہت پہلے شروع ہو گئیں۔ سڑکوں اور گلی کوچوں میں جلسے جلوس ترتیب دیئے گئے۔

خواتین نے درۂ خیبر تک اور دیگر تمام ایجنسیوں میں چکر لگائے۔ سرحد کی عورت نے پردے میں رہ کر سول نافرمانی اور استصواب رائے کے دوران جو کمال کیا اس پر حریف بھی عش عش کر اٹھے۔ دیگر صوبوں بالخصوص صوبہ پنجاب کی خواتین سرحد کی بہنوں کے دوش بدوش تھیں۔ ریفرنڈم ہوا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلم لیگ کو عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی۔ بے اندازہ اکثریت سے صوبہ سرحد کو پاکستان کی نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بیگم سلمیٰ تصدق لکھتی ہیں: ”تقسیم یقینی ہوگئی تو ہندو مہا سبھا نے کہا' بھارت ناقابل تقسیم ہی رہے گا۔ ہم اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھیں گے جب تک تقسیم شدہ علاقے دوبارہ ہندوستان میں شامل نہ کرلیں۔ نہرو نے کہا: ”وہ دن دور نہیں جب دو قومی نظریے کا بے بنیاد عقیدہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔“ لیکن قائداعظم کے زیر قیادت آزادی کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ پاکستان کے قیام اور پھر اس کے استحکام کی طرف پہنچی اور مسلمان خواتین نے اس میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔“

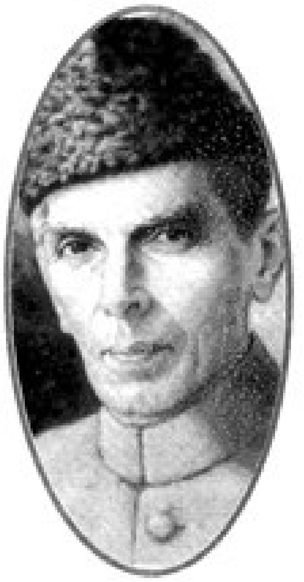

1947ء میں قیام پاکستان کی تیاریوں کے حوالے سے قائد سے ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیگم سلمیٰ تصدق لکھتی ہیں:

”جون 47ء میں ہم سب دلی گئے۔ میاں امیر الدین' میاں ممتاز دولتانہ اور میاں افتخار الدین کے ساتھ میں بھی اورنگزیب روڈ پر قائد کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کمرے میں ایک گول میز' صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز پر فائلوں اور کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا۔ قائد کے چہرے پر تدبر و تحمل کے ساتھ ساتھ انتہائی فکر مندی اور جسمانی تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ لگتا تھا وہ بے انتہا جاگے ہیں۔ پھر بھی ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور سب کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ 3 جون تک قیام پاکستان کا اعلان ہو جائے گا۔ اس کے

بعد تقسیم کی بنیاد پر پاکستان کے حصے کا ذکر کیا۔ اس میں ریلوے' مالیات' فوج' دریا' صوبائی و مرکزی ملازمتیں' قرضے' واجبات غرضیکہ سب کچھ شامل تھا۔ اس ضمن میں حکومت سے مذاکرات ابھی جاری تھے۔ قائداعظم گفتگو کے دوران بعض اوقات ذرا تیز تیز بولتے تھے۔ دراصل یہ انداز ان کی حدت فکر اور احساسات کا غماز تھا۔ آپ بار بار فرماتے:

"آپ سب لوگ میرا ایک' ایک لفظ قوم کے ہر فرد تک پہنچادیں تاکہ بعد میں لوگ معترض اور پریشان نہ ہوں کہ ہمیں بہت آزمائش درپیش ہے' مگر ہم اپنا وطن حاصل کر کے رہیں گے۔" سوال وجواب کا سلسلہ کوئی 45 منٹ تک جاری رہا۔ اس دوران جب ایک صاحب نے دوسری بار تقسیم اموال کے بارے میں پوچھا تو قائداعظم نے تیز لہجے میں کہا' آپ کو مال کی فکر ہے اور مجھے انسانوں اور ان کے مستقبل کی۔ اس وقت باؤنڈری کمیشن اور باؤنڈری فورس کے تقرر کا سوال درپیش ہے اور اتنے اہم امور طے ہونا باقی ہیں کہ فی الحال مال کی تقسیم اتنا اہم مسئلہ محسوس نہیں ہوتا۔"

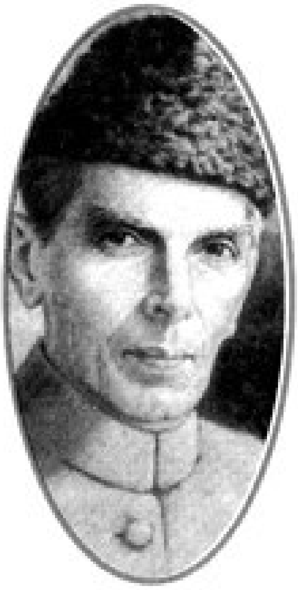

رخصت کرتے وقت قائد نے ہم سے فرمایا: "آپ لوگ تمام حفاظتی انتظامات مکمل رکھیں اور سیاسی بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے ہر معاملہ پر کڑی نظر رکھیں۔ یاد رکھیں مستعد اور الرٹ رہنا ہے۔"

قائداعظم کی زبان سے قیام پاکستان کے اعلان کی بات سن کر ایک نیا جوش اور ولولہ انگڑائیاں لینے لگا' مارے خوشی کے ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر دروازہ بند ہوگیا اور قائد اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

☆......☆......☆

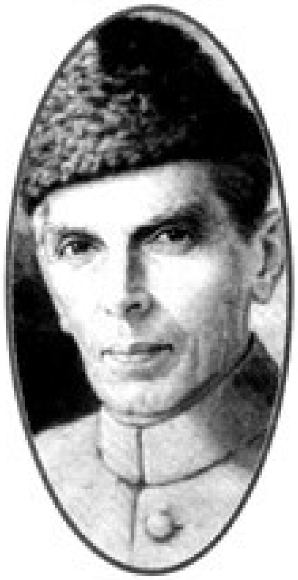

قائداعظمؒ کراچی میں پہلے کل پاکستان اولمپکس کھیلوں کے موقع پر خواتین کے ہمراہ

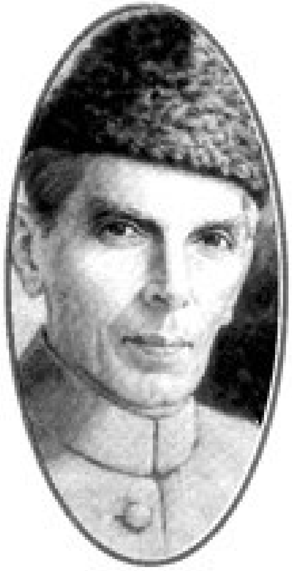

23مارچ کی یادیں

بیگم سلمیٰ تصدق حسین کی جس کتاب کے حوالے سے ہم نے قائداعظم کی زندگی کے حوالے سے واقعات بیان کیے' اس کتاب میں 23مارچ 1940ء کے حوالے سے بھی چند یادداشتیں موجود ہیں۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین لکھتی ہیں:

23مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا 27واں سالانہ اجلاس منعقد ہونا تھا۔ فروری 1940ء میں دلی میں ہونے والے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پاکستان سے متعلق تاریخی قرارداد پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس قرارداد کا مسودہ مختلف سرکردہ مسلم لیگی رہنماؤں نے تقسیم ہند کی بنیاد پر تیار کیا۔ قائداعظم نے یہ مسودہ دیکھنے کے بعد اسے موضوعاتی کمیٹی کے سامنے رکھ دیا اور کمیٹی نے کافی غوروخوض کے بعد مسودے میں کچھ ترامیم کیں۔ پھر یہی مسودہ ترمیم شدہ شکل میں قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کے نام سے 23مارچ 1940ء کے اجلاس لاہور میں منظور ہوا۔

1940ء کی اسی قرارداد کے بعد مسلمانان ہند کے سامنے پہلی مرتبہ ایک آزاد'

خود مختار اور اسلامی مملکت کا تصور پوری وضاحت کے ساتھ ابھرا۔ ان دنوں اسے "قرارداد ہند" کہا گیا۔ صرف بیگم محمد علی جوہر نے اس کیلئے "قرارداد پاکستان" کے الفاظ استعمال کئے۔

لاہور میں 22، 23 اور 24 مارچ 1940ء کو منعقد ہونے والے ملت اسلامیہ کے اس پر وقار اور عظیم الشان اجتماع کی رونق اس کا دبدبہ اور جاہ و جلال آج بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ منٹو پارک جسے آج کل اقبال پارک کہا جاتا ہے کے وسیع و عریض میدان میں نہایت شاندار پنڈال، کارکنوں کے کیمپ کا طویل سلسلہ، سبز وردیوں میں ملبوس رضاکار، مسلم لیگی رہنماؤں کا ہجوم، کارکنوں کی دوڑ دھوپ، مہمانوں کی آمد اور سٹیج پر قائداعظم کا بارعب وپروقار چہرہ، یہ سب کچھ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔

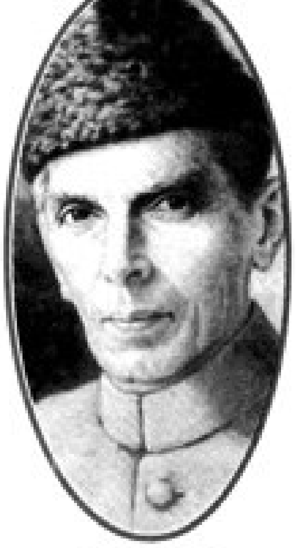

بیگم صاحبہ مزید لکھتی ہیں: "مجلس استقبالیہ کے صدر نواب محمد شاہ نواز خان ممدوٹ اور سیکرٹری میاں بشیر احمد تھے۔ خواتین کی الگ استقبالیہ کمیٹی قائم تھی۔ خواتین رضاکار ٹیم کا کیپٹن مجھے بنایا گیا۔ اسلامیہ کالج کوپر روڈ میں مہمان خواتین کے قیام کا بندوبست ہمارے ذمہ تھا۔ بیگم قلندر علی اور فاطمہ بیگم صاحبہ کے ذمے مہمانوں کے طعام کا انتظام تھا۔ بہت سی خواتین مندوب شہر کے معززین کے گھروں میں ٹھہرائی گئیں۔ ان کی آمدورفت کے انتظامات رضاکار خواتین کے سپرد تھے۔ مہمان خواتین میں مدراس سے دلی اور پنجاب سے سرحد تک مجلس عاملہ کی تیس اور 150 سے زائد مندوبین شامل تھیں۔ خواتین کیلئے پنڈال میں پردے کا انتظام تھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم شامل حال تھا۔ مارچ کا نہایت خوشگوار موسم اور اس عظیم الشان اجتماع کی ایمان افروز فضا صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

پہلے جلسے کا آغاز ہوا تو فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ تقاریر کا آغاز ہوا۔ نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کا تو عالم ہی عجیب ہوتا تھا۔ باقاعدہ کارروائی ختم ہونے پر ان کی تقریر رات دس بجے شروع ہوئی تو صبح چار بجے تک جاری رہی اور عوام کی حالت یہ تھی کہ کوئی اپنی

جگہ سے نہ ہلا۔ یہی حالت خواتین کی تھی۔

ہماری مصروفیتوں کا عالم یہ تھا کہ ہم تین دن تک اپنے گھروں کی صورت نہ دیکھ سکے۔ مہمان خواتین کی رہائش و آسائش کا انتظام کرنا تھا اور پنجاب کی روایتی مہمان نوازی کو بھی شایان شان طریق پر نبھانا تھا۔ یوپی‘ سی پی‘ بہار‘ بنگال‘ دہلی‘ سندھ‘ بنگال اور نہ جانے کہاں کہاں سے خواتین اجلاس میں شریک تھیں۔ اس دور کی سیاست کا تقاضا بھی یہ تھا کہ یہ قرارداد پنجاب کے دل لاہور میں پیش اور منظور ہو۔ اسی بنا پر قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بنفس نفیس اس اجلاس کی تیاری میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔ اگرچہ اس وقت پنجاب میں مخالف لوگوں کی بھی کمی نہ تھی۔ آخری وقت تک قائداعظم کو ہزاروں خطوط اور تاریں بھیجی گئیں کہ لاہور میں جلسہ منعقد نہ کیا جائے کیونکہ فساد کا شدید خطرہ ہے مگر قائداعظم کا استقلال اور عزم ان دھمکیوں سے کب متاثر ہو سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے واضح الفاظ میں کہا‘ اجلاس ہو کر رہے گا اور لاہور ہی میں ہوگا۔ حقیقت یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس‘ یونینسٹ حکومت اور دیگر مسلم لیگ مخالف گروپ‘ مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت اور قائداعظم کے سحر سیاست سے حواس باختہ اور خائف تھے۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ اول تو لاہور میں یہ جلسہ منعقد نہ ہو اور اگر ہو تو قرارداد تقسیم ہند اس میں پیش نہ ہو سکے مگر انہیں منہ کی کھانی پڑی۔“

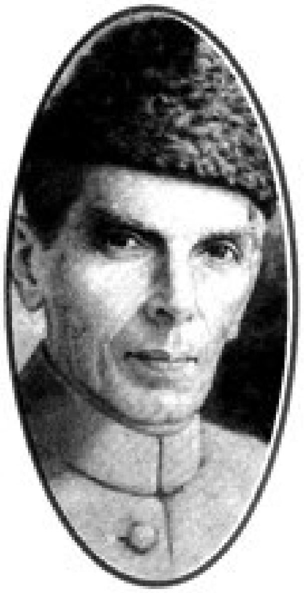

☆......☆......☆

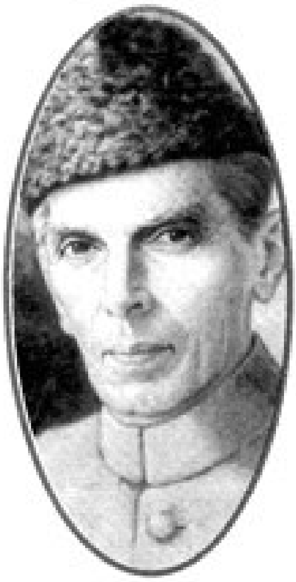

بنوں میں ایک عظیم الشان جلسہ عام کا منظر، جلسے میں ہزاروں خواتین بھی شریک ہوئیں قائداعظمؒ نے اس جلسہ عام سے خطاب کیا۔ (اپریل 1948ء)

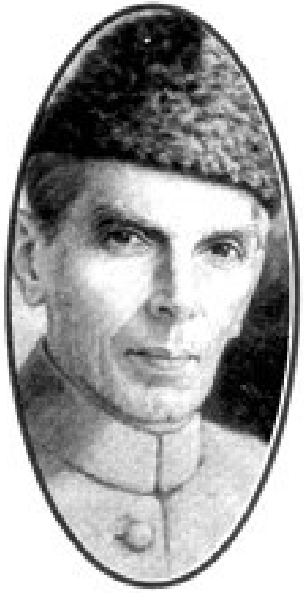

قرار دادِ پاکستان کا دن

ہم بیگم سلمیٰ تصدق حسین کی کتاب ''تحریک پاکستان اور مسلم خواتین'' کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ لکھتی ہیں:

''1940ء میں مسلم لیگ کی طرف سے 21 مارچ سے 23 مارچ تک سالانہ اجلاس کا اعلان ہو چکا تھا کہ انہی دنوں خاکساروں کی پنجاب کی یونینسٹ حکومت سے ٹھن گئی۔ حکومت نے ان جلوسوں پر اندیشۂ نقصِ امن کی آڑ لیتے ہوئے دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا لیکن خاکساروں نے اس پابندی کو تسلیم نہ کیا اور ایک زبردست جلوس نکالا، جس پر یونینسٹ حکومت کی پولیس نے گولی چلا دی۔ نتیجتاً کچھ خاکسار شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ قائداعظم کی لاہور میں آمد سے دو روز پہلے ہوا۔ حکومت کے اس اقدام سے فضا انتہائی ناخوشگوار ہو گئی اور حالات بے حد کشیدہ ہو گئے۔ اِسی کشیدگی کو جواز بنا کر مسلم لیگ سے سالانہ اجلاس منعقد نہ کرنے کو کہا گیا۔ لیکن مسلم لیگ نے صاف انکار کر دیا اور جلسے کے انعقاد کے انتظامات جاری رہے۔ اس دوران بعض لوگوں نے نہایت پریشان کن اور مبالغہ آمیز اطلاعات روانہ کیں مگر قائداعظم چٹان کی طرح ڈٹے رہے

اور ان کے ارادوں کو کوئی طاقت متزلزل نہ کر سکی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس موقع پر قائداعظم نے فرمایا:"

"مسلمان کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا ہے۔"

محترمہ لکھتی ہیں: "لاہور میں انسانوں کا ایک بحر بیکراں تھا جو موج در موج جلسہ گاہ میں داخل ہو رہا تھا' بلکہ آخری دن تو یہ عالم تھا کہ منتظمین جلسہ نے قناتوں کو گرا دیا تاکہ لوگ اپنے محبوب رہنما کی جھلک دیکھ سکیں۔ قائداعظم تشریف لائے تو لاکھوں افراد نے کسی کی ہدایت کے بغیر اتنے نظم و ضبط کا ثبوت دیا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

قائداعظم کے سواری سے اترتے ہی عوام نے دونوں طرف سمٹ کر درمیان میں راستہ بنا دیا۔ فضا فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ قائداعظم ڈائس پر پہنچے تو یہ راستہ چند ثانیوں میں پھر بھر گیا' نہ دھکم پیل ہوئی' نہ شوروغل! قائداعظم ڈائس پر تھے' ان کے دائیں جانب نوابزادہ لیاقت علی خان اور بائیں جانب نواب محمد شاہ نواز ممدوٹ تھے۔ ڈائس پر ہی اے کے فضل الحق' خواجہ ناظم الدین' مولوی محمد اسماعیل' چودھری خلیق الزمان' سردار عبدالرب نشتر' سر غلام حسین ہدایت اللہ' نواب سر محمد یوسف' مولانا ظفر علی خاں' سردار اورنگزیب' نواب بہادر یار جنگ' نواب صدیق علی خاں' راجہ محمود آباد' نواب اسماعیل آف میرٹھ' مسٹر حسن امام' ملک برکت علی' مولانا راغب احسن اور مولانا حسرت موہانی جیسی عظیم شخصیتیں موجود تھیں۔

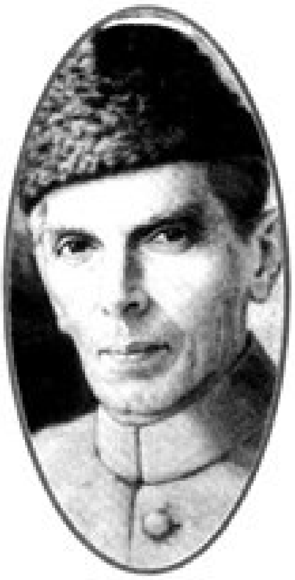

کارکنوں کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر' مندوبین' نیشنل گارڈز اور سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ پشاور سے مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے سینکڑوں رکن سردار اورنگزیب کے ہمراہ لاہور آئے اور اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہ کارکن شب و روز پنڈال کی نگرانی کرتے اور تمام تر مخدوش حالات کا سامنا عزم و ہمت سے کرتے چونکہ ایسی

اطلاعات مل چکی تھیں کہ قائداعظم اور پنڈال کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں' اس لئے یہ کارکن ہمہ وقت چوکس رہتے۔"

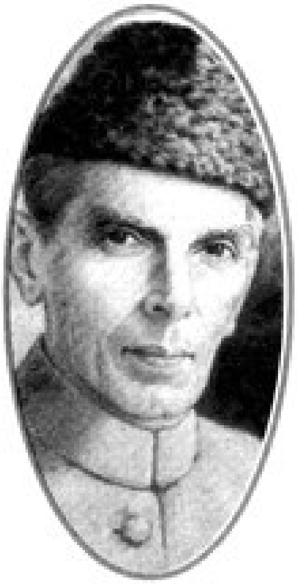

بیگم سلمٰی تصدق حسین مزید لکھتی ہیں: "قائداعظم نے سالانہ اجلاس سے پہلے خواتین کے ایک عظیم الشان اجتماع سے جناح گرلز کالج میں خطاب فرمایا۔ خواتین لاہور کیلئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ قائداعظم کے روبرو تھیں' مسلمان خواتین ایک عجیب ولولے اور جوش و خروش کے ساتھ جذباتِ عقیدت لئے ہزاروں کی تعداد میں جلسہ گاہ کی طرف رواں دواں تھیں۔ متعدد خواتین اور طالبات نے اس جلسے میں تقاریر کیں اور نظمیں پڑھیں' جن کے ایک ایک لفظ سے ذوقِ آزادی اور شوقِ عمل کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ قائداعظم بھی مسلم خواتین کے اس جوش و خروش اور عزم و عمل کا مظاہرہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ خود تقریر کیلئے مائیک پر تشریف لائے تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔" آپ نے فرمایا:

"بہنو اور بیٹیو! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا مشن کامیاب ہو گا اس لئے کہ اب ہندوستان کی مسلمان عورت نے بھی آزادی کے مفہوم اور اس کے مقاصد کو سمجھ لیا ہے' لہٰذا میدانِ جنگ بہر حال ہمارے ہاتھ رہے گا۔ مجھے فخر ہے کہ اب میری قوم کے مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی جنگِ آزادی میں شریک ہوں گی۔ اس وقت آپ کو اتحاد اور عمل کی ضرورت ہے۔"

"قائداعظم کے ان الفاظ میں ایک عجیب اثر تھا' جادو تھا...... ہزاروں خواتین کے اجتماع میں مکھی کی بھنبھناہٹ بھی نہ تھی۔ بس ایک رہنما' سچے رہنما کی آواز گونج رہی تھی۔ ان کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دلوں میں اترتا جا رہا تھا۔ ایک ایسا نشہ تھا جو حصولِ منزل تک دل و دماغ پر محیط رہا اور اسی کا اثر تھا کہ قائداعظم نے ایک مشفق باپ کی طرح خواتین کو جو احساس دلایا وہ بیدار رہا اور خواتین قائداعظم کے اشارۂ ابرو پر جانیں قربان کرنے کیلئے تیار ہو گئیں اور بالآخر پاکستان کی منزل ہمیں مل گئی۔"

☆......☆......☆

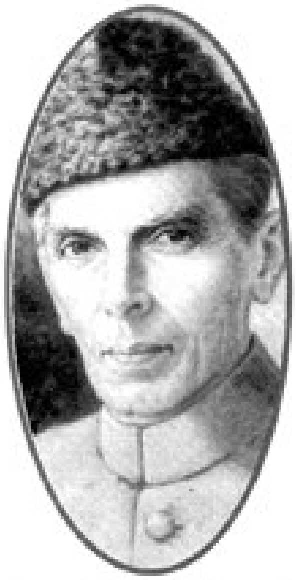

قائداعظمؒ 1946 میں دیال سنگھ کالج لاہور کے طلبا کے ساتھ۔

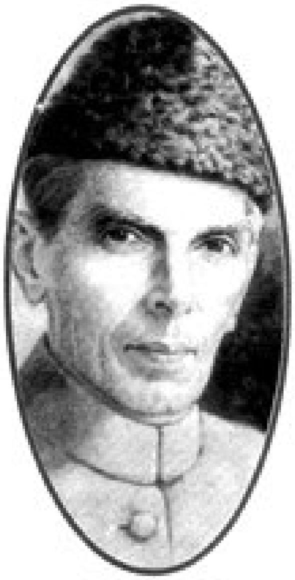

قائداعظم اور طلبہ

قیام پاکستان کے زمانے کے بارے میں طالب علم لیڈر ڈاکٹر ضیاء الاسلام نے "میرا قائد" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"مسلم لیگی اور کانگریسی لیڈروں نے کیبنٹ مشن کے اہم رکن کرپس سے مذاکرات شروع کیے تو قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ لاہور کے مسلمانوں نے اپنے محبوب لیڈر کا مثالی اور یادگار استقبال کیا۔ صبح فرنٹیئر میل کی آمد سے پہلے لاہور ریلوے سٹیشن پر اتنے مسلمان اکٹھے ہوگئے کہ پلیٹ فارموں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ فلک شگاف نعروں میں قائداعظم کو خوش آمدید کہا گیا۔ پھر وہ ریلوے سٹیشن سے ممدوٹ ولا پہنچے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر ضیاء الاسلام لکھتے ہیں: "اسلامیہ کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں قائداعظم کی تقریر سننے کے لیے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمان جمع تھے۔ کرپس اور اس کے ساتھی کالج گراؤنڈ سے ملحقہ وطن ہائی سکول کی چھت کے اوپر بیٹھے مسلمانان لاہور کے جوش و خروش کو دیکھ رہے تھے۔ میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا رضاکار تھا اور میری ڈیوٹی سٹیج کی پشت پر

تھی۔ قائداعظم نے تقریر شروع کی تو قریبی مبارک مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ حاضرین جلسہ حیران تھے کہ اس وقت کسی نماز کا وقت نہ تھا۔ آخر اس بے وقت کی اذان کا مطلب کیا؟

تھوڑی دیر بعد جلسہ گاہ کے ایک کونے میں خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی آمد سے جلسے میں شور مچ گیا' جو بعد میں طوفان کی صورت اختیار کر گیا۔ علامہ مشرقی اسی طوفان کے بہاؤ پر بہتے ہوئے سٹیج پر قائداعظم کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے اس فعل نے عوام کو اتنا مشتعل کر دیا کہ لوگ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے سٹیج سے علامہ مشرقی کو دھکے دینا شروع کر دیے۔

اسلامیہ کالج کے پرنسپل عمر حیات ملک قائداعظم کے قریب بیٹھے تھے۔ قائد نے انتہائی بردباری اور صبر و تحمل کا ثبوت دیا اور عمر حیات ملک سے مخاطب ہو کر بولے: "مسٹر ملک' علامہ مشرقی کو بحفاظت گھر پہنچنا چاہئے' یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔"

اگر قائداعظم اس لمحے جذباتی ہو جاتے تو علامہ مشرقی کا اس مشتعل ہجوم سے زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہوتا۔"

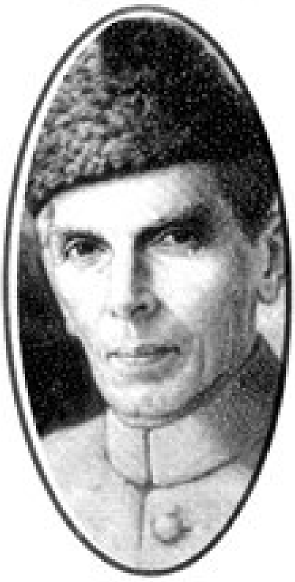

ڈاکٹر ضیاء الاسلام نے ایک اور واقعہ بھی کچھ اس طرح بیان کیا ہے: "قائد کی اپیل پر اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کلاسوں سے نکل کر سیاست کے میدان میں آ پہنچے۔ میں نے بھی اس اپیل پر لبیک کہا۔ ان دنوں مجھے اپنی بھانجی کی شادی کے سلسلے میں بمبئی جانا پڑا۔ دوسرے دن میں عقیدت و احترام کا جذبہ لیے اور دھڑکتے دل کے ساتھ قائداعظم کی کوٹھی پر پہنچا اور ان کے سیکرٹری کو بتایا: "میں پنجاب سے قائداعظم کو ملنے آیا ہوں۔ میری ان سے ملاقات کرا دیں۔"

قائداعظم کے سیکرٹری نے ہمارے محبوب لیڈر کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات کرانے سے معذوری کا اظہار کیا۔

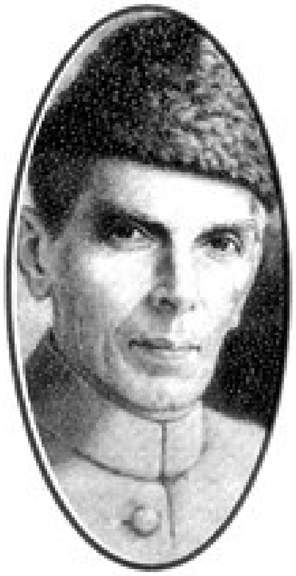

میں نے کے ایچ خورشید صاحب کا مشورہ قبول کر لیا، مگر میرے ایک جذباتی دوست نے فیصلہ کن انداز میں خورشید صاحب سے کہا: ''ہم قائداعظم سے ملاقات کریں گے' تو آج ہی اور ابھی۔''

میرا دوست اتنا جذباتی ہو گیا کہ وہ اونچی آواز سے بولنے لگا۔ ابھی خورشید صاحب اور میرے دوست میں تلخ باتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا کہ میں نے قائداعظم کو ایک دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد قائداعظم ہماری طرف آئے اور بڑے غصے سے بولے: ''یہ کیا ہو رہا ہے۔''

خورشید صاحب نے ہمارے بارے میں بتایا تو قائداعظم نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تم طالبعلم ہو۔''

میں نے بتایا کہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتا ہوں۔ یہ سن کر قائداعظم بڑی سختی سے بولے۔ ''تمہیں تو اس وقت پنجاب میں ہونا چاہئے تھا' کیونکہ وہاں پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی ہے' تم اپنا مورچہ چھوڑ کر مجھے ملنے یہاں پہنچے ہو' جاؤ پنجاب واپس چلے جاؤ اور جا کر مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچاؤ۔ میرے اور تمہارے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ جب ہم پاکستان کی جنگ جیت لیں گے میں تمہیں خود ملاقات کی دعوت دوں گا۔''

ڈاکٹر ضیاء الاسلام لکھتے ہیں: ''عزیزوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے شادی میں شرکت کا خیال دل سے نکالا اور فوراً ہی واپس لاہور چلا آیا جہاں قائد کے حکم کے مطابق مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے نوجوانوں کی ٹولیاں پنجاب کے دیہات اور قصبات کی طرف نکل رہی تھیں۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میں کالجوں اور سکولوں کے طلباء ہراول دستے کے سپاہی تھے۔ انہوں نے قائداعظم کی قیادت میں ایک ناممکن خواب کی تعبیر پوری کر دکھائی۔

☆......☆......☆

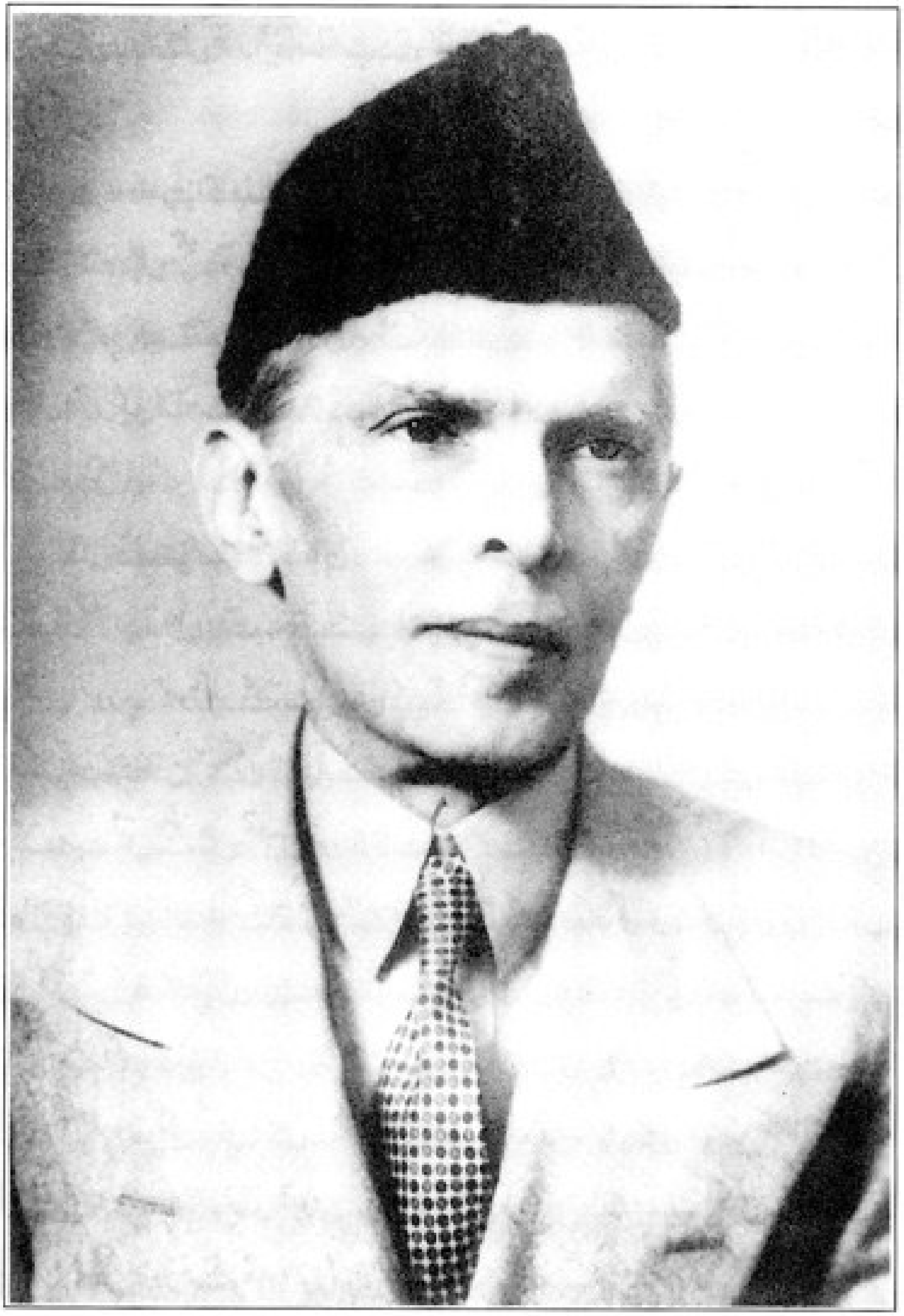

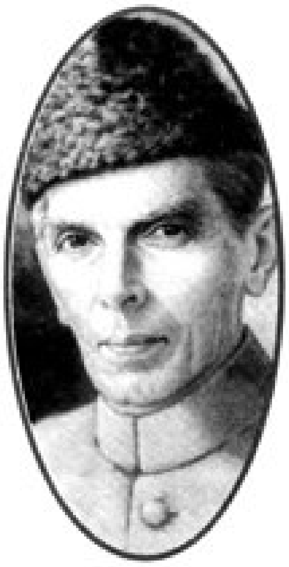

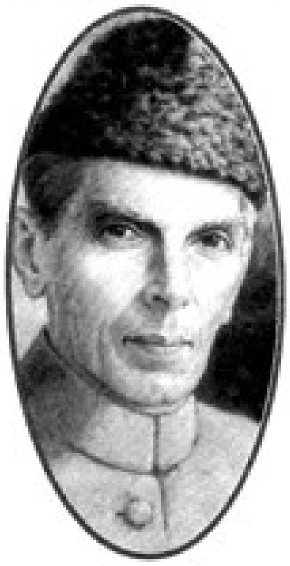

قائد عالمی دانشوروں کی نظر میں

ہم اس مجموعہ میں قائد اعظم کی شخصیت کے بارے میں اس دور کے عمائدین کی آراء پیش کر رہے ہیں۔ آئیے دیکھیں عالمی مدبر اور دانشور ہمارے قائد کے بارے میں مزید کیا کہتے ہیں:

سری لنکا کے وزیر اعظم سینانائیکے نے قائد کی وفات پر کہا تھا کہ "دنیا کے سیاسی لیڈروں کے درمیان مسٹر جناح سب سے الگ غیر معمولی قد آور بلکہ دیو ہیکل نظر آتے ہیں۔"

عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمان عزام پاشا نے کہا تھا: "مسٹر جناح ساری دنیا کے عظیم ترین لیڈروں میں سے ایک تھے۔"

سر سلطان محمد شاہ آغا خان نے کہا کہ "میں مسٹر محمد علی جناح کو ان تمام عظیم لوگوں سے زیادہ عظیم تصور کرتا ہوں جن سے ملنے کا موقع مجھے ملا۔"

مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی قائد کے سیاسی مخالف تھے۔ انہوں نے بھی ہمارے محبوب رہنما کے بارے میں یہ الفاظ کہے: "یہ حقیقت ہے کہ مسٹر جناح اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے۔ وہ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر تھے جہاں کوئی طمع، کوئی خوف، کوئی طعنہ انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ وہ عزم و ہمت کے پہاڑ تھے، جسے خریدا نہیں جا سکتا تھا۔"

عالمی شہرت کے عظیم دانشور برٹرینڈ رسل نے کہا: ”اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی پوری تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ میں کوئی بڑے سے بڑا شخص ایسا نہیں گزرا جسے مسلمانوں میں اتنی محبت حاصل ہو جو مسٹر جناح کو حاصل ہوئی۔“

پنڈت جواہر لال نہرو نے شدید ترین مخالفت کے باوجود بھی ہمارے قائد کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ”مسٹر جناح اعلیٰ کردار اور سیرت کے مالک تھے اور یہی موثر حربہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے زندگی بھر ہر معرکے کو سر کیا۔“

برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے کہا: ”مسٹر جناح کا بے مثل جذبہ حریت اور شبانہ روز محنت ہی وہ سرمایہ ہے جس نے پاکستان جیسے ملک کی بنیاد ڈالی۔“

سر ونسٹن چرچل نے کہا: ”مسٹر جناح بڑے ذہین و فطین سیاستدان ہیں۔ میں مسلمانوں کے اس بڑے لیڈر کی یاد کو کبھی دل سے بھلا نہیں سکتا۔“

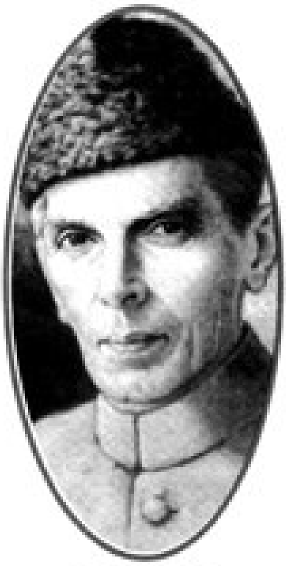

برطانوی ہند کے وائسرائے لارڈ ویول نے کہا: ”مسٹر جناح مخلص قوم کے مخلص رہنما ہی نہیں بلکہ سچے وکیل بھی ہیں۔ مسٹر جناح کے ارادے اٹل ہیں‘ ان کو اپنے ارادوں اور رائے سے کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی۔“

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: ”مسٹر جناح اگر کسی فریق سے سمجھوتہ کرتے تھے تو اصولوں کو قربان نہ کرتے ہوئے مردانہ وار سمجھوتہ کرتے تھے۔ مسٹر جناح نے کبھی کوئی سمجھوتہ جھک کر اور بزدلانہ انداز میں نہیں کیا۔ یہ اس عظیم لیڈر کی بڑی خوبی تھی۔“

”ورڈکٹ اون انڈیا“ کے مشہور مصنف بیورلی نکلسن نے جو برطانیہ کے پرانے صحافی تھے‘ 1943ء میں اپنی کتاب لکھی جس میں کہا: ”مسٹر جناح ایشیا کے سب سے زیادہ اہم شخص ہیں“ اور یہ بھی لکھا کہ ”انڈیا کے سیاسی نقشے پر مجھے مسٹر جناح بونوں کے درمیان ایک قد آور اور دیو ہیکل شخصیت نظر آتے ہیں۔“

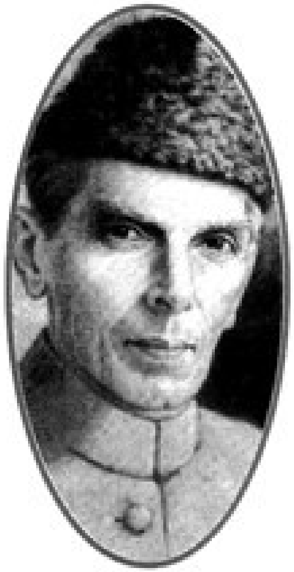

1948ء میں قائداعظم کی وفات کے بعد ایک مضمون میں انہوں نے لکھا:

"یہ شخص جس نے پاکستان کو وجود بخشا ایک دن اس کے سابق مخالفین بھی تسلیم کریں گے کہ وہ متمدن دور کی تاریخ میں بلند ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے۔" مزید کہا کہ "مسٹر جناح ایشیا کی اہم شخصیت تھے' وہ اپنی مرضی کے مطابق جنگی صورتحال کو بدل سکتے تھے۔"

سر سلطان محمد شاہ آغا خان نے مزید کہا: "میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مدبرین کو دیکھا: لائڈ جارج' چرچل' کرزن' مسولینی' مہاتما گاندھی لیکن ان سب میں جناح سب سے زیادہ عجیب اور قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی قوت اور کیریکٹر میں جناح سے زیادہ صاف ستھرا اور روشن نہ تھا' نہ ادراک و فراست اور عزم واستقلال کے ساحرانہ امتزاج میں ان سے کوئی آگے تھا اور یہی سٹیٹ کرافٹ ہے۔"

برطانوی وائسرائے کی بیگم لیڈی ویول نے مسٹر جناح کے بارے میں کہا' جو اپنی مثال آپ ہے۔

"میں نے اپنی زندگی میں جن خوبصورت ترین لوگوں کو دیکھا ان میں سے ایک مسٹر جناح ہیں۔ مغرب کا نہایت ہی واضح' تقریباً یونانی ناک نقشہ اور مشرق کی خوبی و لطافت اور حرکات وسکنات مسٹر جناح کے اندر دونوں کا امتزاج تھا۔"

قائداعظم کی وفات ہوئی تو بلبل ہند مشہور شاعرہ اور دانشور سروجنی نائیڈو نے ایک خط محترمہ فاطمہ جناح کے نام لکھا' اس خط کے الفاظ یہ ہیں:

"بے انتہا پیاری فاطمہ' تم کو معلوم ہے کہ میں کس قدر دل کی گہرائیوں سے تمہارے غم میں شریک ہوں۔ ہزارہا سوگوار ہیں جو اپنے عظیم رہنما کو خراج تحسین ادا کر چکے ہیں اور ادا کر رہے ہیں' لیکن میں اپنے غم والم کی درد انگیز خاموشی میں اپنی یادوں اور محبتوں کے غیر فانی پھول بھیج رہی ہوں۔ ان کو میرے پیارے اور محبوب دوست جناح کی قبر پر رکھ دینا۔"

☆......☆......☆

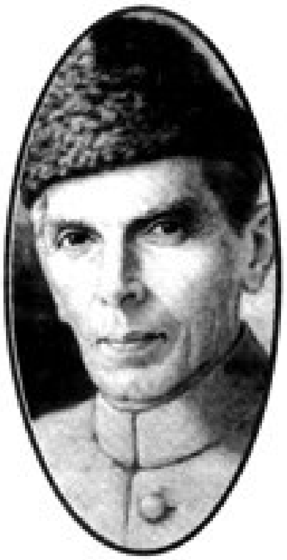

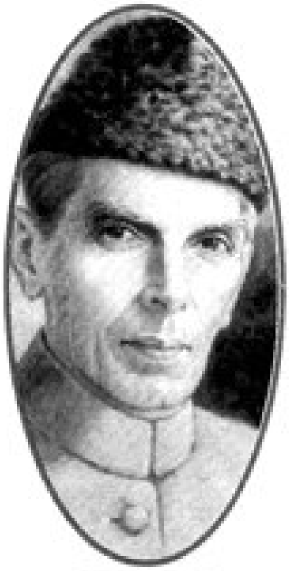

دیگر اقوام کا قائد پر اعتماد

ہمارے قائداعظم سیاستدان ہی نہیں ایک اعلیٰ پائے کے مدبر اور دانشور بھی تھے۔ قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد کیلئے پروفیسر احمد سعید صاحب نے "حیات قائداعظم' چند نئے پہلو" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے' جس میں پوری تحقیق کے بعد بہت سے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ جس سے قائد کے تدبر اور معاملہ فہمی کا پتا چلتا ہے۔

لاہور میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے' تاہم "حیات قائداعظم' چند نئے پہلو" کے مصنف کے قلم سے اس واقعہ کا جائزہ لیں تو قائداعظم کی معاملہ فہمی اور تدبر کا ایک نیا اور قابل تحسین پہلو سامنے آئے گا' جس سے پتا چلتا ہے کہ صحیح لیڈر کا کام عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے آگ لگانا نہیں بلکہ آگ لگی ہوئی ہو تو اسے بجھانا ہوتا ہے۔

احمد سعید لکھتے ہیں: 1935ء کے واقعہ مسجد شہید گنج نے لاہور کی سیاسی فضا میں ایک زبردست ہیجان پیدا کر دیا اور ماحول میں مذہبی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس تنازع کی ابتدا مغلیہ دور میں ہوئی تھی جو کئی بار اٹھایا گیا اور ہر مرتبہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان وجہ فساد

بنا' ان دنوں پھر مسجد شہید گنج مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ایک متنازعہ مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ یہ مسجد مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے کوتوال عبداللہ نے تعمیر کی تھی۔ سکھوں کی بڑھتی ہوئی انارکی اور سرکشی کو روکنے کی غرض سے جب پنجاب کے گورنر معین الملک نے کارروائی کا آغاز کیا تو ایک سرکردہ سکھ تارو سنگھ مسجد سے متصل کوتوالی میں مارا گیا۔ یہ شخص سکھوں کی نگاہ میں معزز تصور کیا جاتا تھا' اس لئے سکھوں نے اس جگہ کو شہید گنج کا نام دے دیا۔ بعد میں جب پنجاب میں مغلوں کی برائے نام حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور لاہور پر تین سکھ سرداروں کا قبضہ ہوا تو سکھ اس مسجد پر بھی قابض ہو گئے۔

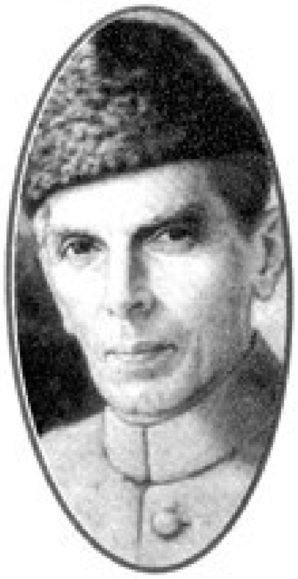

جون 1935ء میں سکھوں کے جتھے یکایک لاہور آنے لگے تو اچانک یہ افواہ پھیل گئی کہ سکھ مسجد کو شہید کرنا چاہتے ہیں۔ لاہور کے مسلمان زعماء نے اس نازک صورتحال کے پیش نظر سکھ لیڈروں سے گفت و شنید کی اور گورنر پنجاب کو بھی اس نازک صورتحال سے آگاہ کیا لیکن اسی دوران میں سکھوں نے مسجد کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ جس سے لاہور میں فرقہ وارانہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی' حتی کہ مسجد کا انہدام حکومت کی نگرانی میں کیا جانے لگا۔

مسلمان اس صورتحال کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے' چنانچہ جوابی کارروائی شروع ہوئی تو صورتحال اتنی خراب ہو گئی کہ فوج کو مداخلت کر کے گولی چلانی پڑی۔ مسلمان سیاسی زعماء کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اس پر مسلمانوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ہزاروں مسلمانوں نے حکومت پنجاب اور سکھوں کی اس ملی بھگت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جیلوں کو بھر دیا۔

اس نازک صورتحال میں قائداعظم محمد علی جناح نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اس اعتماد کو' جو ان پر تمام مذاہب کے سرکردہ لوگوں کو تھا کام میں لا کر اس مسئلہ کو طے کرانے کی کوشش کریں۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ ہندو'

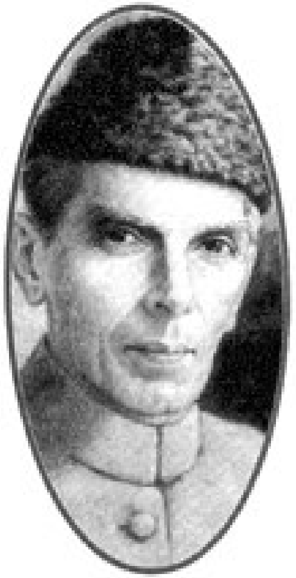

سکھ اور تمام دیگر اقوام بھی قائداعظم محمد علی جناح پر کس قدر اعتماد کرتی تھیں اور ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ 17 فروری 1936ء کو قائد نے ایک تار میں کہا کہ "میں شہید گنج کے جھگڑے کو طے کرانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا"۔

21 فروری 1936ء کو قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ لاہور کے مسلمانوں نے قائد کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ریلوے سٹیشن سے لوگوں نے انہیں جلوس کی شکل میں قیام گاہ تک لے جانا چاہا، مگر انہوں نے انکار کیا اور کہا میں خاموشی سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ اسی دوپہر کو قائداعظم نماز جمعہ کیلئے شاہی مسجد گئے اور وہاں حاضرین سے مسجد شہید گنج کے موضوع پر گفتگو کی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمانان لاہور نے قائداعظم کی حسب خواہش اس تحریک کو عارضی طور پر ملتوی کر دیا۔ قائد نے حاضرین کو مبارکباد دی کہ "آپ لوگوں نے مسجد شہید گنج میں بزور قوت نماز ادا کرنے کی تحریک کو عارضی طور پر میری خواہش کے مطابق بند کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک منظم قوم ہیں۔ اس تحریک کے عارضی التوا نے قوم کے وقار کو بلند کر دیا ہے۔ میں آپ حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگ ایسا رویہ اختیار کریں جس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور ہم اس مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کر سکیں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مسلمانوں کیلئے کوئی باعزت سمجھوتہ کرا دوں"۔

☆......☆......☆

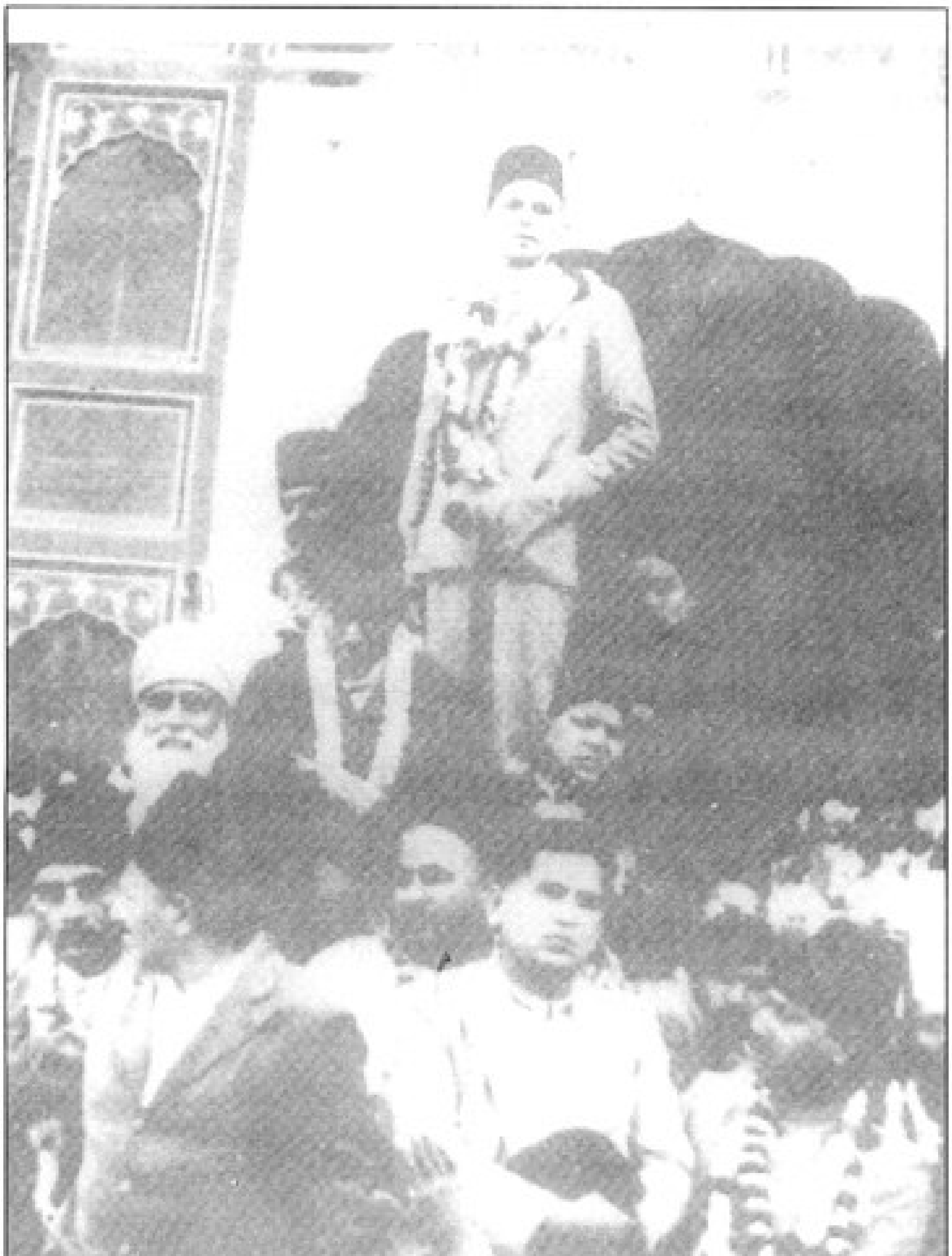

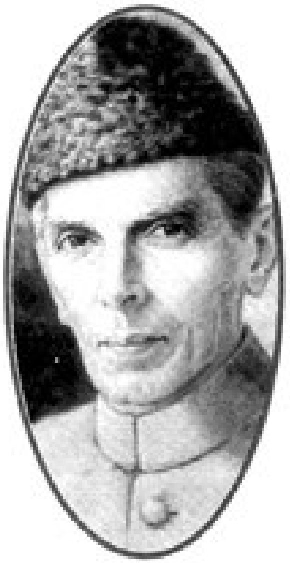

قائداعظمؒ بادشاہی مسجد لاہور میں خطاب کر رہے ہیں(1936ء)

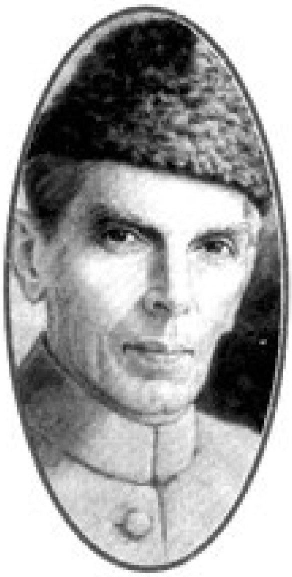

پہلی کامیابی

22 فروری 1936ء کو قائداعظم نے گورنر پنجاب سے ملاقات کی۔ باخبر حلقوں نے اس ملاقات کو امید افزا قرار دیا۔ اسی روز قائداعظم نے تحریک شہید گنج کے مسلمان لیڈروں سے بھی ملاقات کی۔ تحریک کے لیڈروں نے بقول روزنامہ الجمعیۃ دہلی قائداعظم کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے لیکن ساتھ ہی آپ کو یقین دلایا کہ وہ قائداعظم کے فیصلہ کے مطابق عمل کریں گے۔

لاہور میں اپنی آمد کے بعد قائداعظم کے سامنے دو اہم کام تھے۔ اول یہ کہ گفت وشنید کے ذریعے حکومت کو اس امر پر مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمان نظربندوں کی رہائی کے احکامات جاری کرے اور مسلمانوں کے اخبارات کی ضبط شدہ ضمانتوں کو واپس کر دیا جائے۔ دوئم سکھوں سے اس قضیہ کو حل کرنے کیلئے گفت وشنید کی جائے۔

روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے مطابق قائداعظم کی گفتگو میں گزشتہ مصالحانہ ناکامیاں رکاوٹ بن رہی تھیں کیونکہ سکھوں کا مطالبہ تھا کہ کسی بھی گفت وشنید کے آغاز سے پہلے

صوبہ میں اس کیلئے فضا ہموار کی جائے اور فریقین کو جو جہاں ہے اس اصول کی بنیاد پر مزید پیش قدمی سے روکا جائے۔ 23 فروری 1936ء کو قائداعظم نے دوبارہ گورنر پنجاب سے ملاقات کی اور سیاسی کارکنوں اور تحریک میں حصہ لینے والوں کی رہائی اور اخبارات کی ضمانتوں پر گفتگو کی۔ قائداعظم کو اپنی اس مہم میں کامیابی حاصل ہوئی اور گورنر پنجاب نے انہیں یقین دلایا کہ اگر مسلمان سول نافرمانی کی تحریک بند کر دیں اور مسجد کی بازیابی کیلئے آئینی طریق کار اختیار کریں تو حکومت ان کی دونوں باتوں کو مان لے گی۔

قائداعظم نے تحریک کے مسلمان کارکنوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔

24 فروری 1936ء کو حکومت پنجاب نے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا۔ ”اس وقت لاہور میں قضیہ مسجد شہید گنج کے حل کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اگر کوئی فوری تصفیہ نہ ہوسکے تو کم از کم صوبے میں ایسی فضا ضرور پیدا کی جائے جس کے زیر اثر بعد میں دونوں قوموں میں تصفیہ ہو جائے۔ اس وقت جو کوشش کی جارہی ہے اسے گورنمنٹ کی عملی تائید حاصل ہے۔ گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کوشش میں عملی امداد کی ایک صورت یہ ہے کہ جو حضرات زیر دفعہ 3 پنجاب کریمنل لاء امینڈمنٹ ایکٹ 1933ء ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں نظر بند کیے گئے ہیں ان کو رہا کر دیا جائے' اس ضمن میں احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔“

یوں قائداعظم کو اپنے مشن میں پہلی کامیابی حاصل ہوئی اور 28 فروری 1936ء بروز جمعہ بادشاہی مسجد میں شہید گنج کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان جلسہ سے خطاب کیا۔ دوران تقریر قائد نے فرمایا: ”حضرات! میں کئی روز سے لاہور میں مقیم ہوں۔ اس عرصہ میں ہر مکتب فکر کے مسلمانوں اور غیر مسلم لیڈروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ میں غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال سول نافرمانی کی تحریک کو بند کر دینا چاہئے۔ میں سکھ لیڈروں سے بھی گفت و شنید کر رہا ہوں۔ میری دلی آرزو ہے کہ آپس میں کوئی

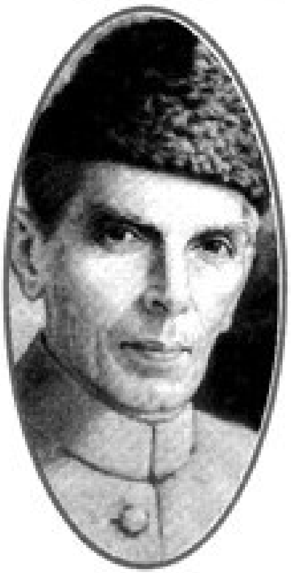

باعزت سمجھوتہ ہو جائے۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ ہم کسی ڈر کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ ہم ہرگز کسی سے نہیں ڈرتے۔ تاہم جو کچھ ہم کر رہے ہیں اپنی قوم کی بہتری اور فلاح و بہبود کیلئے کر رہے ہیں۔ قوم کی بہتری اس پروگرام میں ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہم مسجد شہید گنج کی واپسی کیلئے آئینی اور قانونی جدوجہد جاری رکھیں گے' لیکن براہ راست کوئی ایکشن نہیں لیں گے تاکہ مقابلے کی صورت میں جانی نقصان نہ ہو۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اس تحریک میں پوری کوشش اور طاقت کے ساتھ آپ کی مدد کروں گا۔"

☆......☆......☆

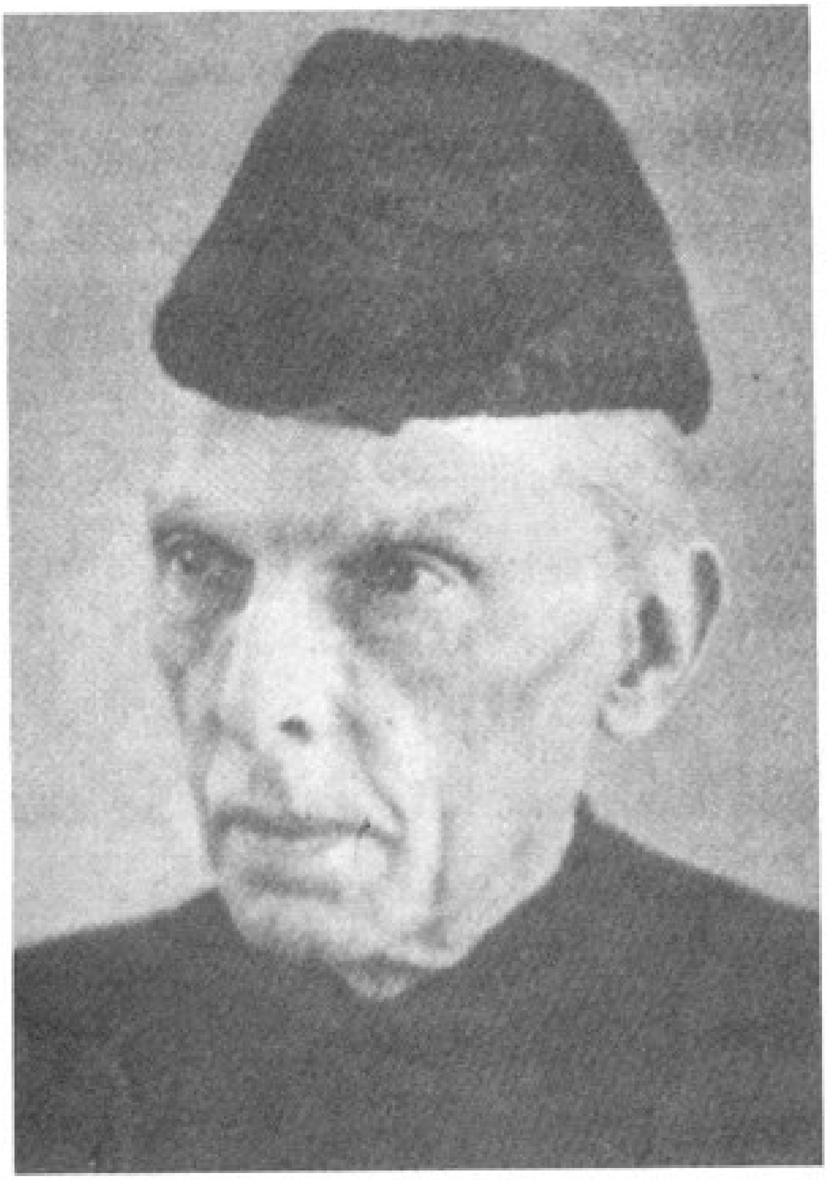

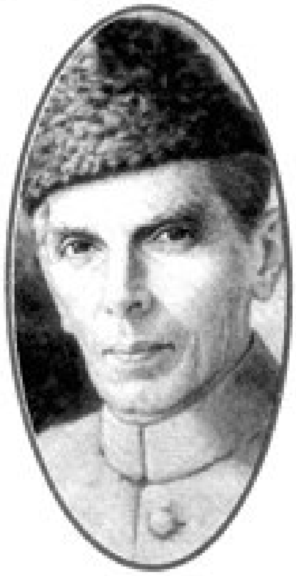

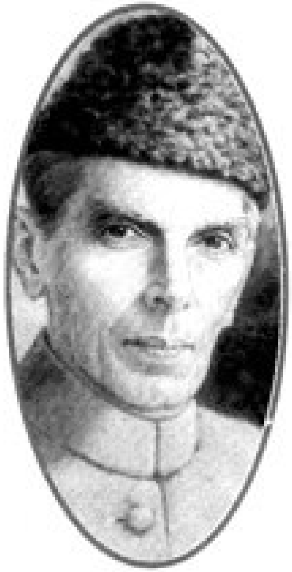

انصاف پسندی

ہم قیام پاکستان سے قبل لاہور میں مسجد شہید گنج کے واقعہ کا تذکرہ کر رہے تھے اور یہاں تک پہنچے تھے کہ قائد کی کوششوں سے کس طرح مسلمانوں اور سکھوں میں وقتی طور پر امن قائم کیا گیا اور کیونکر ایک بڑی خونریزی سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں جو آخری جلسہ منعقد کیا گیا اس میں سکھ' ہندو اور دیگر مقررین کے بعد جب قائداعظم تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"میں لاہور اس لئے نہیں آیا کہ صرف مسلمانوں کے مفاد کا ڈنکا پیٹوں۔ میں تو اس مسئلے کے تمام فریقوں کیلئے انصاف کروانے آیا ہوں۔ میرے سامنے ایک ہی مقصد ہے' یہ کہ شہید گنج کے جھگڑے کا منصفانہ اور اچھا سمجھوتہ ہو جائے۔ اگر سمجھوتہ اچھا اور منصفانہ ہو گا تو اسے دوام حاصل ہو گا بصورت دیگر وہ زیادہ دن نہیں چل سکے گا اور پھر وہی خون خرابہ ہو جائے گا۔ مختلف مقرروں کے خیالات سے میری ہمت بڑھ گئی ہے' خصوصاً سردار اجل سنگھ نے سکھوں کی طرف سے جس تعاون کا اظہار کیا ہے' اس پر میں سراپا سپاس ہوں۔ ایک بھی صحیح

الخیال مسلمان ایسا نہیں جو بھائی چارے کا خواہش مند نہ ہو۔ میرا ایمان ہے کہ اگر لیڈر ہر بات سے بے نیاز ہو کر جرأت سے حالات کا مقابلہ کریں تو بہت جلد یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

5 مارچ 1936ء کو دیال سنگھ یونین نے قائداعظم کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ انہیں غیر مسلم اقوام میں بھی کس قدر مقبولیت اور اعتماد حاصل تھا۔ کالج یونین کے صدر پروفیسر لاجپت رائے نے قائداعظم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور ان کو مشہور ہندو لیڈر گوکھلے سے تشبیہ دی اور کہا ہندوستان کی نجات کیلئے مسٹر جناح جیسا راست باز اور دلیر ڈکٹیٹر درکار ہے۔

اس تقریر کے جواب میں قائداعظم نے کہا: "آپ نے مسولینی اور ہٹلر ایسے ڈکٹیٹروں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس ملک کا ڈکٹیٹر بننے کی دعوت دی ہے۔ ہم ہندوستان میں ڈکٹیٹر شپ قائم نہیں کر سکتے۔ اس ملک میں کسی بے اصول خائن اور بد دیانت لیڈر کیلئے عوام کو بے وقوف بنانا اور وقتی طور پر ان سے حسب منشا کام لینا چنداں مشکل نہیں بشرطیکہ وہ ان کے جذبات کو بھڑکانے کے فن سے واقف ہو۔ اس لئے جب تک ہم عوام کی ذہنی' اخلاقی اور سیاسی تربیت نہ کریں اور جب تک عوام کا تربیت یافتہ عنصر صحیح لیڈر کی پہچان سے آگاہ نہ ہو اور خود غرض رہنماؤں کو قیادت کی گدی سے علیحدہ کرنے کا شعور اور طاقت نہ رکھتا ہو اس وقت تک ہم صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔"

قائداعظم نے 7 مارچ کو دہلی جانے سے قبل ایک کمیٹی شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے قائم کی جس میں قومی شاعر علامہ اقبال' مولوی عبدالقادر قصوری' میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء' راجہ نریندر ناتھ پنڈت' نانک چند' سردار بوٹا سنگھ' سردار اجل سنگھ' سردار سمپورن سنگھ اور میاں ممتاز دولتانہ کے والد میاں احمد یار دولتانہ بحیثیت کنوینر شامل تھے۔ لاہور سے روانگی پر قائداعظم نے ایک اخباری بیان میں کہا:

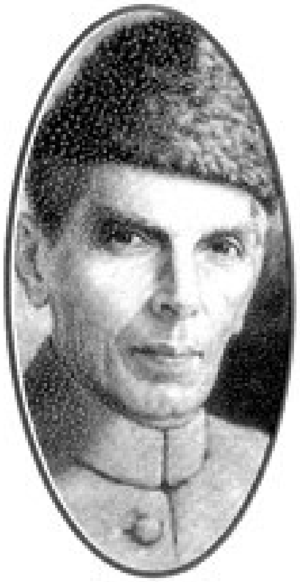

"مصالحانہ کوششوں کو بدستور جاری رکھنا چاہئے تاکہ باہمی سمجھوتہ جلد از جلد ہو سکے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس غرض کیلئے مختلف قوموں کے ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جائے جس کا نام شہید گنج مصالحتی بورڈ ہو' اس بورڈ کو ہم لوگوں نے قائم کر دیا ہے۔ میری خدمات اس بورڈ کیلئے ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر آیندہ میرا آنا ضروری ہوا تو میں سو کام چھوڑ کر لاہور پہنچوں گا۔"

لاہور کے انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے قائداعظم کی ان کوششوں پر انہیں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ اخبار نے لکھا: "پنجاب کے مقامی مسلمان لیڈروں کی ناکامی اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انہیں سرکار پرستی کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ انہیں ہمیشہ انصاف پسند اور غیر متنازعہ لیڈر سمجھا جاتا ہے اور ان کے اس سیاسی رجحان ہی کی وجہ سے بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے ان کی بات کو سننا اور ماننا منظور کیا۔"

گورنر پنجاب نے قائداعظم محمد علی جناح کی ان کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: "صوبہ کی صورتحال کی بہتری کیلئے ہم مسٹر جناح کے بہت ممنون ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا اس کا شکریہ ہم آسانی سے ادا نہیں کر سکتے۔"

اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قائد کس پائے کی مدبر شخصیت تھے اور کس طرح انہیں تمام مذاہب کے معقول سوچ رکھنے والے لیڈروں میں ایک انصاف پسند لیڈر سمجھا جاتا تھا۔ قائد ہمیشہ امن وامان کے حق میں اور مسائل کے آئینی اور قانونی حل کے خواہشمند رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ غیر آئینی راستہ مسلمانوں کو مزید مسائل سے دوچار کر دے گا۔

☆......☆......☆

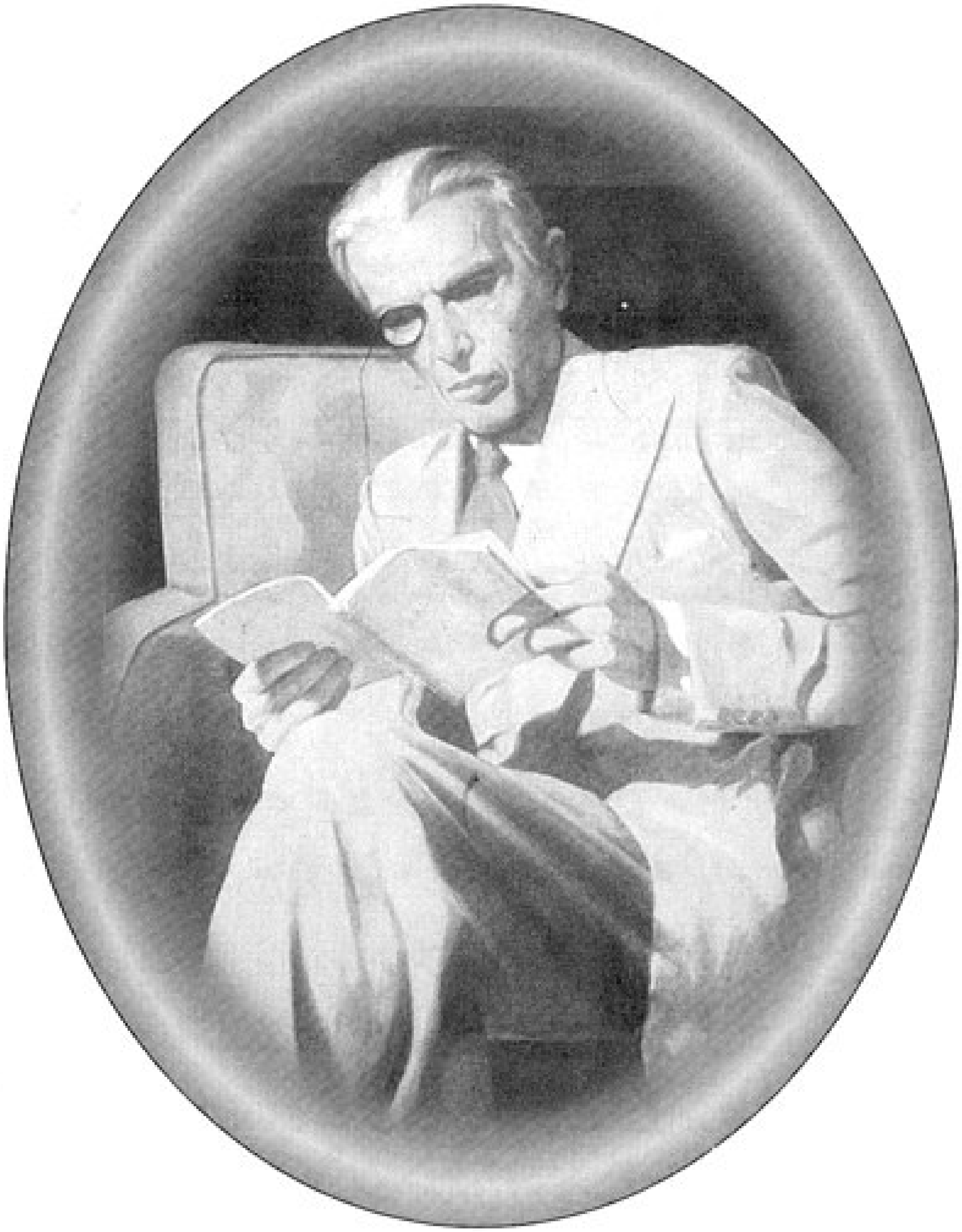

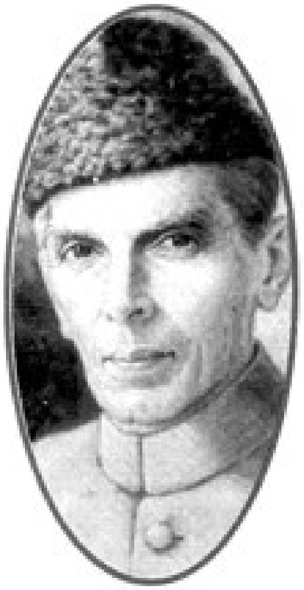

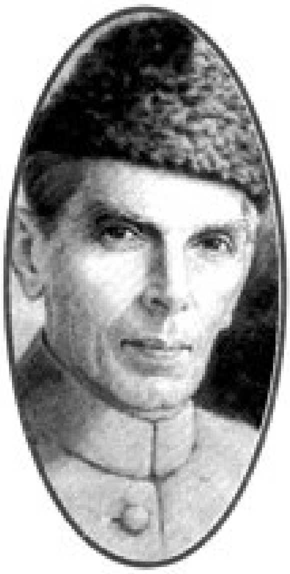

آزادیٔ اظہار کے چیمپئن

قائداعظم کی زندگی سے دلچسپ واقعات کا سلسلہ جاری ہے آزادیٔ تحریر کے بارے میں قائداعظم کی ایک مسلمہ رائے تھی۔ ”ڈان“ کے سابق ایڈیٹر الطاف حسین مرحوم لکھتے ہیں:

قیام پاکستان کے بعد کراچی میں ایک طویل گفتگو کے دوران قائداعظم نے میرے اخبار کے مقالوں میں آزادیٔ رائے کی ضرورت پر زور دیا میں نے ایک مضمون لکھا تھا جسے چھپے الفاظ میں خود قائداعظم پر اعتراضات سے تعبیر کیا جاسکتا تھا وہ اس مضمون کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اسی شام کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا:

”میں تمہارا سارا مضمون پڑھ چکا ہوں۔“

کچھ دیر بعد ان کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جنہیں میں تمام اخبار نویسوں اور صحافیوں کیلئے آزادی کا منشور سمجھتا ہوں انہوں نے فرمایا: ”کسی موضوع پر غور کرو اور اپنے دل میں فیصلہ کرو۔ اگر تم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہو کہ ایک خاص نظریہ یا اعتراض پیش کرنا ضروری ہے‘ تو بالکل وہی لکھ ڈالو جو حقیقتاً تم نے محسوس کیا ہے۔ کبھی پس و پیش نہ کرو‘ اس خیال سے کہ کوئی ناراض

ہو جائے گا' یہاں تک کہ اپنے قائداعظم کی ناراضگی کی بھی پروانہ کرو۔"

"ہمارے پیشے کی قدر و منزلت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت میں ایک عظیم المرتبت ہستی ہی یہ الفاظ ادا کر سکتی ہے۔ یہ واقعہ یاد کر کے میری گردن اظہار تشکر میں جھکتی اور احساس فخر سے بلند ہو جاتی ہے۔"

معروف مسلم لیگی نواب یامین خان لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا ایک شخص نے نعرہ لگایا:

"شہنشاہ پاکستان زندہ باد"

قائداعظم خوش ہونے کے بجائے خفا ہوئے اور کہنے لگے: "دیکھئے حضرات' آپ لوگوں کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہو گا' وہ مسلمانوں کی مملکت ہو گی' جہاں سب مسلمان برابر ہونگے۔"

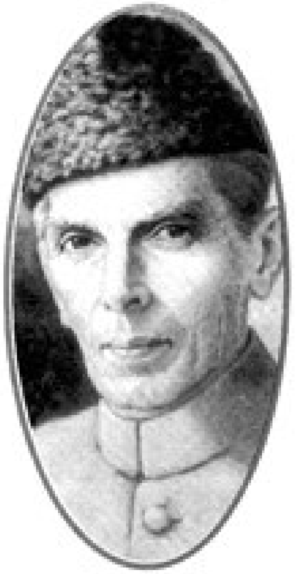

جی الانہ کی کتاب قائداعظم کے حوالے سے مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں: "قائداعظم دوسروں سے کام لینے میں سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی اتنا ہی مصروف رکھتے تھے جتنا کہ دوسروں کو مصروف رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا وقت نہایت قیمتی تھا۔ کھانا' آرام اور نیند وغیرہ کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا کام کو آگے بڑھانے کا جذبہ اور جوش ہی انہیں ٹھیک وقت پر کھانے اور آرام کرنے سے روکتا تھا۔ اس عادت نے بعد کے برسوں میں قائداعظم کی جسمانی قوت اتنی مضمحل کرنا شروع کر دی کہ وہ اسے بحال نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے نحیف جسم پر اس طرح ناقابل برداشت بوجھ ڈالے وہ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں تپ دق کا شکار ہو گئے جس نے بالآخر ان کی جان لے لی۔"

جب ان کا ملازم انہیں کھانے کیلئے آ کر کہتا تھا اور قائداعظم کسی مسئلے پر بحث کر رہے

ہوتے یا کوئی خط لکھوا رہے ہوتے تو وہ اپنے ملازم کی بات پر بالکل دھیان نہیں دیتے تھے۔ بعض اوقات ان کی بہن فاطمہ جناح اپنے بھائی کا انتظار کرتے تھک جاتیں اور خود آ کر کہتیں کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے' لیکن وہ بہت اخلاق سے جواب دیتے: "بس چند منٹ اور" یا "جاؤ شروع کرو' میں ذرا دیر میں تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں گا۔" قائداعظم کو پہلے کام کرنا ہوتا اور وہ بعد میں کھانے یا کسی دوسرے کام کی طرف دھیان دیتے تھے۔

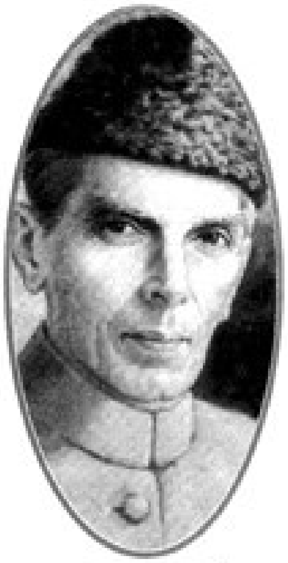

☆......☆......☆

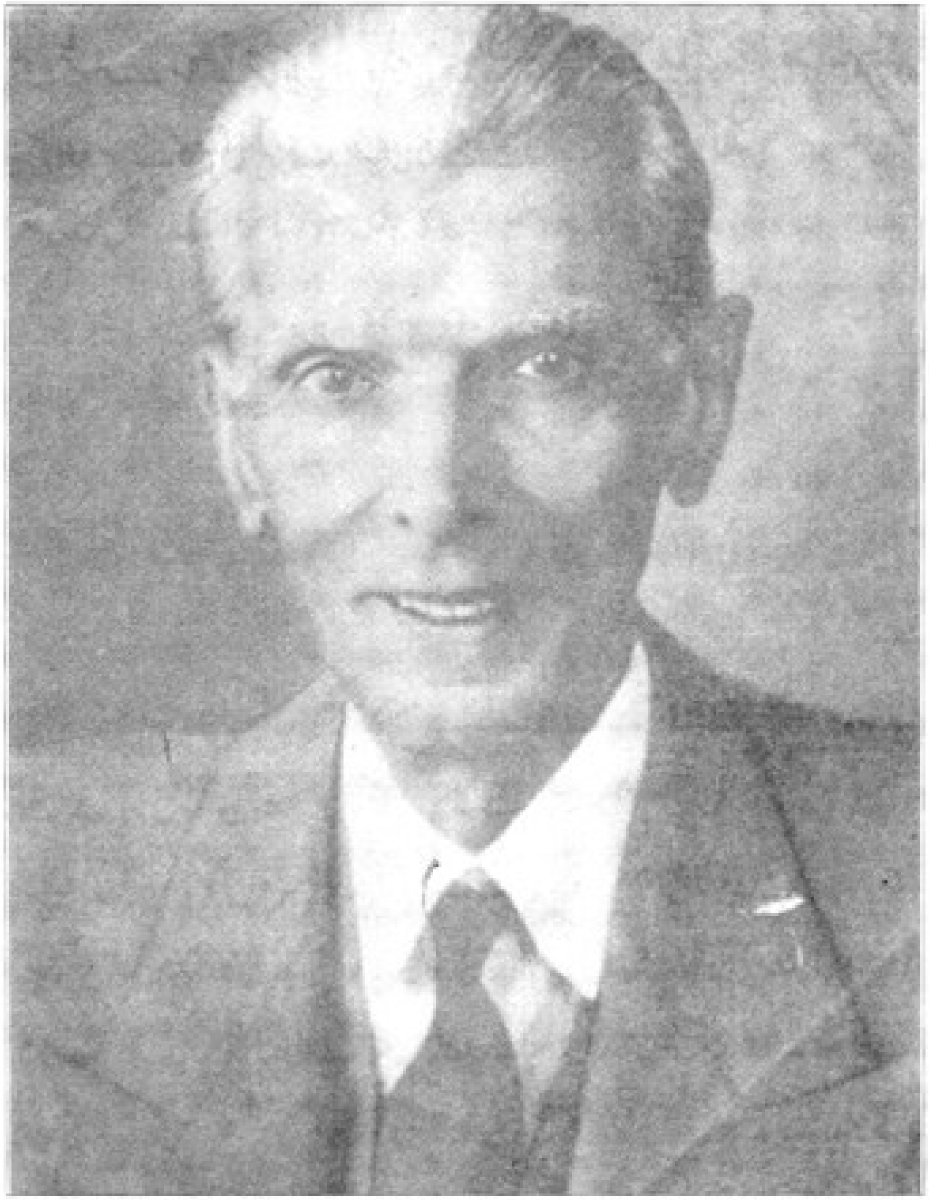

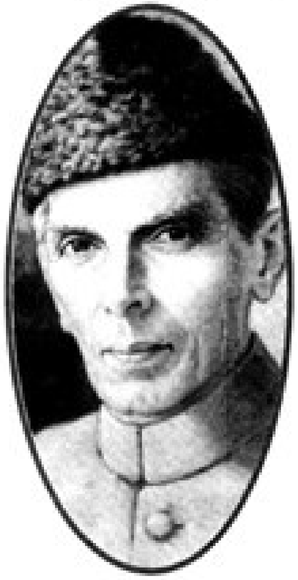

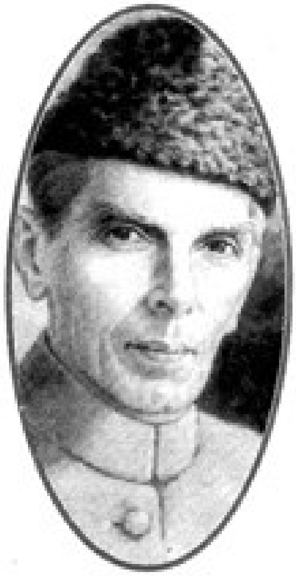

اصولوں کی چٹان

قائداعظم کی زندگی کے بارے میں مسلم لیگ کے ایک نوجوان اور سرگرم کارکن اور آج کے معروف قانون دان شریف الدین پیرزادہ ایک دلچسپ واقعہ یوں لکھتے ہیں:

قائداعظم ریل کے سفر کے دوران اپنے لئے دو برتھ ریزرو کرایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب میں انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ کہتے ہیں!

”میں شروع میں ایک ہی برتھ ریزرو کرایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں بمبئی سے لکھنؤ جارہا تھا کسی چھوٹے سٹیشن پر ٹرین رکی تو ایک اینگلو انڈین لڑکی میرے ڈبے میں آکر دوسرے برتھ پر بیٹھ گئی۔ چونکہ میں نے ایک ہی برتھ ریزرو کرائی تھی اس لئے خاموش رہا۔“

ٹرین نے رفتار پکڑی تو اچانک لڑکی بولی ”تمہارے پاس جو کچھ ہے فوراً میرے حوالے کردو ورنہ میں ابھی زنجیر کھینچ کر لوگوں سے کہوں گی کہ یہ شخص میرے ساتھ زبردستی کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے کاغذوں سے سر ہی نہ اٹھایا۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ میں پھر خاموش رہا۔ آخر کار تنگ آکر اس نے مجھے جھنجھوڑا تو میں نے سر اٹھایا اور اشارے سے کہا ”میں بہرہ ہوں، مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ کہنا ہے لکھ کردو۔“

اس نے اپنا مدعا کاغذ پر لکھ کر میرے حوالے کر دیا میں نے فوراً زنجیر کھینچ دی اور اسے بمع اس کی تحریر کے ریلوے حکام کے حوالے کر دیا جو اس کے جرم کا ثبوت تھی۔ اس دن کے بعد سے میں ہمیشہ دو برتھ ریزرو کراتا ہوں۔

یہ واقعہ نہ صرف قائد کی ذہانت بلکہ مشکل ترین حالات میں خود پر مکمل کنٹرول کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔

پیرزادہ صاحب ہی کی زبانی ایک اور واقعہ:

قائداعظم ایک روز بمبئی میں مسلم لیگ کے جلسے میں شرکت کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے Proud کے معنی پوچھے۔ میں نے بتایا کہ اس کا مطلب مغرور ہوتا ہے۔ قائداعظم نے جلسہ گاہ میں تقریر کے دوران اُردو جملہ بولتے ہوئے یہ لفظ اس طرح استعمال کیا۔"

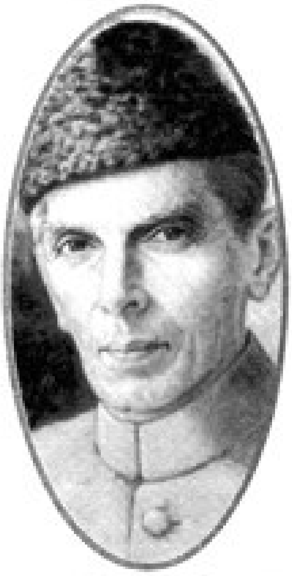

"میں مغرور ہوں کہ میں مسلمان ہوں' انہوں نے احتیاطاً Proud کا لفظ بھی ساتھ بول دیا۔"

واپسی پر میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ پورے جملے کا اُردو مطلب دریافت فرماتے تو میں آپ کو بتاتا کہ Proud ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اور آپ کو "مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے" کہنا چاہئے تھا۔ اس پر قائداعظم نے فرمایا: "میں اپنی تقریر یا اس کا کوئی اقتباس قبل از وقت کیسے افشاء کر سکتا تھا۔"

بظاہر یہ معمولی واقعہ ہے لیکن اس سے قائد کے اس عزم کا اظہار ہوتا ہے جو وہ صحیح اور غلط کے مابین فرق کے حوالے کو اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ معروف ادیب اور افسانہ نگار ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"قیام پاکستان سے کچھ دیر پہلے ایک مسلمان سول افسر سنٹرل انٹیلی جنس میں متعین تھا۔ اس کی دلی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔ ایک روز اتفاقاً اس کے ہاتھ ایک فائل لگی

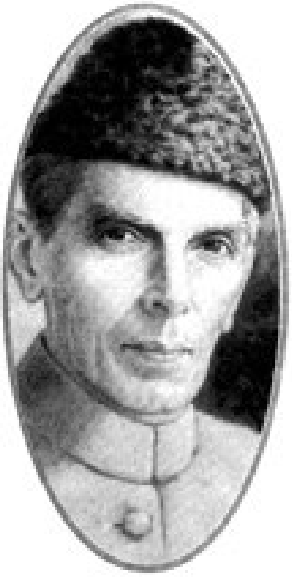

جسے پڑھ کر اسے پتہ چلا کہ ہندو لیڈر در پردہ اور پیشگی ہی ایسے منصوبے بنا رہے ہیں کہ پاکستان کے بنتے ہی اسے اپاہج بنا دیا جائے۔ مسلمان افسر نے محسوس کیا کہ اس امر سے قائداعظم کو خبردار کیا جانا چاہئے کیونکہ پاکستان کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔"

اس نے یہ فائل چرالی۔ تین دن کی رخصت لی' بھیس بدلا اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت وہ قائد کی کوٹھی پر پہنچا' اندر اپنے نام کی چٹ بھجوائی۔ تھوڑی دیر بعد قائداعظم نے اسے اندر بلا لیا۔ مسلمان افسر نے مختصراً اپنی آمد کی وجہ بیان کی اور پھر فائل سامنے رکھ دی۔ قائداعظم نے بڑے اطمینان سے ساری فائل پڑھی پھر بولے: نوجوان! کیا تم نے پاکستان میں ملازمت کیلئے OPT (خود کو پیش) کیا ہے؟ اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ افسر کوئی جواب دیتا' قائداعظم نے کہا: "میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ پاکستان میں ایسے افسروں کیلئے قطعی جگہ نہیں ہے جو دفتری راز غیر متعلقہ لوگوں پر فاش کریں۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

قائداعظم کے ڈرائیور فقیر محمد بیان کرتے ہیں:

"میں قائداعظم کے پاس ملازم تھا۔ ایک دفعہ جمعہ کے دن میں نے مس فاطمہ جناح سے کہا کہ مجھے نماز کیلئے چھٹی چاہئے۔ انہوں نے اجازت دیدی۔ اسی وقت بے بی (قائداعظم کی بیٹی) اندر آئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ انہیں ہارن بائی روڈ پر کچھ سہیلیوں سے ملنے جانا ہے اور انہیں کار کے ساتھ مجھے بھی لے جانا ہے۔"

اگرچہ میں بے بی کیلئے اپنے پروگرام میں ایک آدھ گھنٹہ کی ترمیم کرنے کیلئے تیار تھا' کیونکہ بعض مساجد میں آدھ گھنٹہ دیر سے نماز مل سکتی تھی لیکن اسی دوران قائداعظم تشریف لے آئے۔ انہوں نے بیٹی سے سختی سے کہا:

"نہیں! فقیر محمد جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہا ہے' تم کار پر نہیں جا سکتی' کسی سے کہو تمہارے لئے ٹیکسی لے آئے۔"

اس چھوٹے سے واقعے سے قائداعظم کی اصول پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

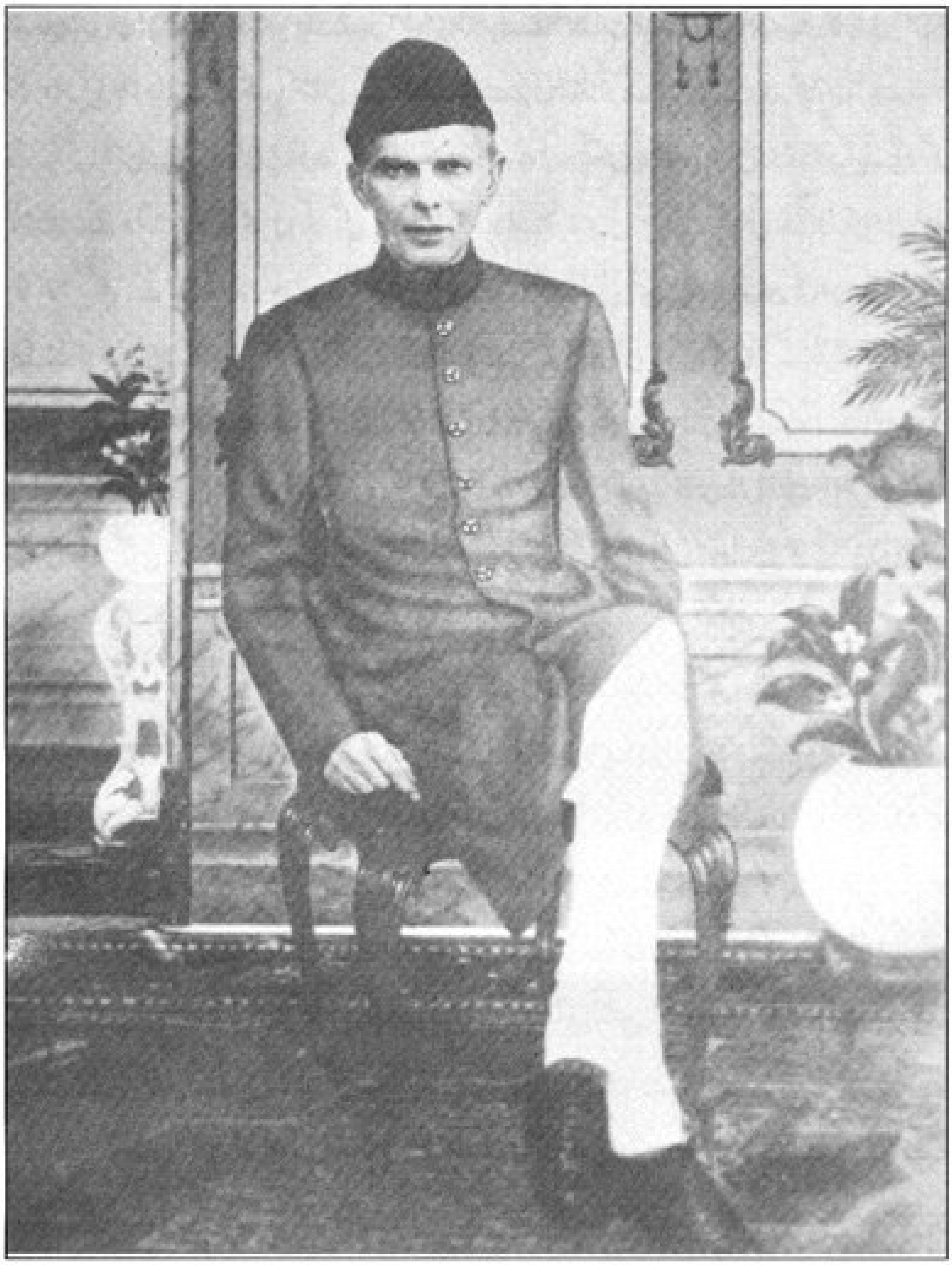

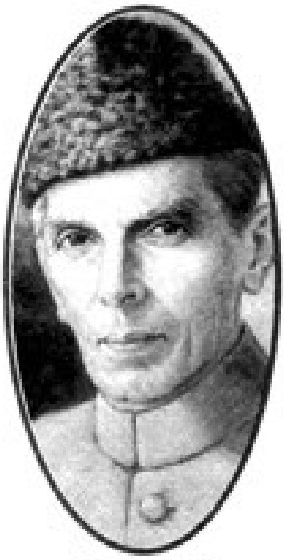

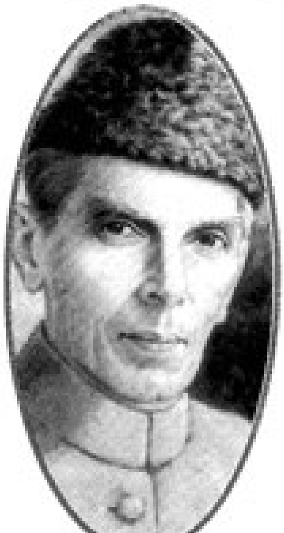

”کسی کا حق نہ چھینو“

قائداعظم کے ڈرائیور اور پاکستان فلم انڈسٹری کے ایک پرانے اداکار محمد حنیف آزاد کہتے ہیں:

”قائداعظم اور مس فاطمہ جناح ایک دفعہ ساحل کے ساتھ ساتھ موٹر کی سواری میں سمندری ہواؤں کا لطف لے رہے تھے۔ میں ان کی موٹر ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس اثناء میں میں نے قائداعظم کا موڈ اچھا دیکھ کر عرض کیا' عالی جاہ! والد کا خط آیا ہے' کچھ پیسے دہلی بھیجنے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ویل! ابھی ہم نے تم کو دو سو روپیہ دیا تھا' کدھر گیا؟“ میں نے عرض کیا' عالی جاہ! وہ تو خرچ ہو گئے۔ آپ نے برجستہ جواب دیا: ”ویل تم ایک دم مسلمان ہو گیا' تھوڑا ہندو بنو۔“

میں سمجھ گیا کہ اس لطیفے سے مجھے وہ کفایت شعاری کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی مجموعی فضول خرچی کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

ایک اور واقعہ عباس احمد عباسی کی زبانی:

”لاہور میں ملک برکت علی ایڈووکیٹ کی طرف سے ایک ٹی پارٹی دی گئی جس میں

قائداعظم کے سامنے وہ کیک رکھا گیا جو ہندوستان کے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا اور اس میں پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کا رنگ سبز تھا۔ جب بابائے قوم نے کیک کاٹا تو بڑی احتیاط سے سبز حصہ الگ کر دیا۔ کسی نے کہا: جناب ذرا سا اور کاٹ لیجئے۔ جواب ملا: ”میں تجاوز پسند نہیں کرتا' نہ کسی کا حق غصب کرو اور نہ اپنا حق چھوڑو۔“

پاکستانی فوج کے جنرل گل حسن قائد کے اے ڈی سی تھے۔ وہ کہتے ہیں:

”میں قائداعظم کا اے ڈی سی تھا کہ ایک بار ان کے ایک بھائی ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا جو میں نے جا کر قائداعظم کو دے دیا۔“

قائداعظم نے پوچھا: ”کون ہیں؟“

میں نے کہا: ”آپ کے بھائی ہیں۔“ وہ بولے: ”انہوں نے پہلے سے وقت لیا تھا؟“

میں کہا: ”جی نہیں۔“ فرمایا: ”انہیں کہو تشریف لے جائیں۔“

میں دروازے کی طرف مڑا قائداعظم نے مجھے دوبارہ بلایا اور کارڈ میرے ہاتھ سے لے کر سرخ پنسل سے اس پر قائداعظم کا لفظ کاٹا پھر ”گورنر جنرل آف پاکستان کے بھائی“ کا لفظ کاٹا اور پھر کارڈ مجھے تھماتے ہوئے کہا:

”ان سے کہو کہ کارڈ پر صرف اپنا نام لکھیں' میرے یا گورنر جنرل کے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔“ میں نے باہر جا کر کارڈ ان کے بھائی کو دے دیا۔ وہ وہاں سے چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

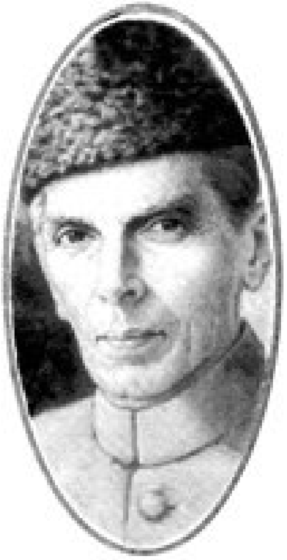

ایک پرانے مسلم لیگی ورکر سعید فاروقی لکھتے ہیں:

”یہ 1946ء کا ذکر ہے میں ان دنوں مسلم لیگ کی مزنگ شاخ کے شعبہ نشرواشاعت سے منسلک تھا۔ میرے چند نوجوان ساتھیوں نے اس وقت تک قائداعظم کو نہیں دیکھا تھا۔ قائداعظم لاہور تشریف لا رہے تھے' اپنے دوستوں کی خواہش پر میں انہیں ساتھ لے کر

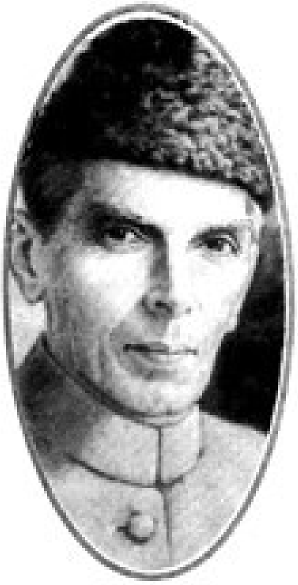

اسمبلی ہال کی طرف چل پڑا۔ اگرچہ یہ بے ضابطگی تھی تاہم مجھے قائداعظم کی اس شفقت پر زعم تھا جو وہ نوجوانوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ اسمبلی ہال کے باہر چبوترے پر تمام مسلم لیگی ارکان اسمبلی نیم دائرے میں قائداعظم کا استقبال کرنے کیلئے جمع تھے۔ ہم پانچ چھ ساتھی بائیں طرف والے آرائشی پیالے والے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ منتظمین میں سے بیشتر میرے شناسا تھے' لہٰذا کوئی مزاحم نہ ہوا۔"

قائداعظم تشریف لائے' گاڑی سے اتر کر انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور ہم اپنی جگہ سے کھسک کر آگے نکل آئے۔ راجہ غضنفر علی خان نے ہمیں ٹوکا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے ذوق و شوق کا ذکر کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ پل بھر کیلئے قائداعظم سے ملنا ہے' اس کے بعد ہم فوراً ہی چلے جائیں گے۔ راجہ صاحب کا استدلال تھا کہ قائداعظم کو یہ حرکت ناگوار گزرے گی کیونکہ وہ اس قسم کی بے قاعدگیوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اتنے میں قائداعظم چبوترے پر پہنچ چکے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت وہ ہماری طرف متوجہ ہوگئے اور راجہ صاحب سے پوچھا:

WHAT IS THE MATTER (کیا قصہ ہے) انہوں نے بوکھلا کر مختصراً ماجرا بیان کر دیا۔ قائداعظم نے میری طرف دیکھا' مجھے ان کی عقابی نگاہیں دل کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی' اچانک انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"YOUNGSTERS FIRST" (پہلے نوجوان آگے بڑھیں)

ہماری جان میں جان آئی۔ جلدی جلدی ہم نے ان سے مصافحہ کیا اور خوش خوش واپس ہونے لگے۔ اچانک انہوں نے ہمیں روک کر فرمایا:

"DISCIPLINE FIRST" (نظم و ضبط کو اولیت دی جائے) اور ہم پر گھڑوں پانی پھر گیا۔ ہم نے فوراً ترتیب سے ملنا شروع کر دیا۔

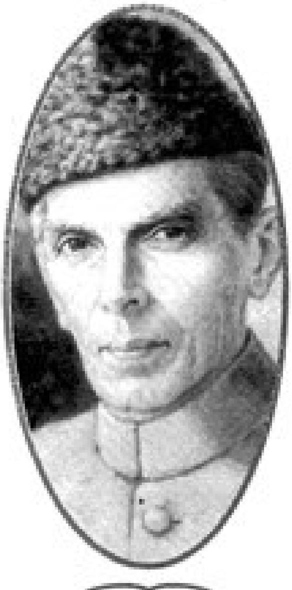

قائداعظمؒ کراچی کے شہریوں کی طرف سے دیئے گئے استقبالیے میں تشریف لارہے ہیں

1947ء

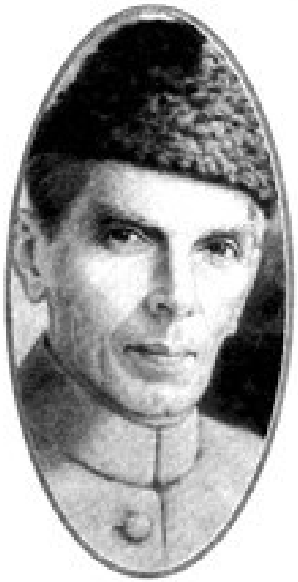

پاکستان آپ کے ہاتھ میں ہے

بانیٔ پاکستان کے چند فرمودات پیش خدمت ہیں جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ پاکستان روانہ ہوتے وقت 7اگست 1947ء کے دن قائداعظم نے فرمایا:

"آج ماضی کی تلخیوں کو دفن کر کے ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کی حیثیت میں ہمیں از سر نو آغاز کرنا ہے۔ ہندوستان کی پرامن خوشحالی کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع"

11اگست 1947ء کو مجلس دستور ساز میں کہا: "میرے خیال میں ہندو مسلم مسئلہ کا تقسیم کے علاوہ اور کوئی حل تھا ہی نہیں مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ کا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہوگا اور اس سے زیادہ یہ کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا عملی تجربہ سے یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل سوائے تقسیم کے اور کچھ نہیں تھا۔ متحدہ ہندوستان کا تخیل ہرگز قابل عمل نہ ہوتا اور میری رائے میں وہ ہمیں زبردست تباہی کی طرف لے جاتا"

پیغام عید 18اگست 1947ء اس روز آپ نے فرمایا "یہ آزاد اور خود مختار پاکستان کی

پہلی عید ہے جو انشاءاللہ خوشحالی کا ایک نیا باب کھولے گی اور جو اسلامی ثقافت و نظریات کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو ہماری گزشتہ اور قابل احترام تاریخ کے شایان شان بنائے اور ہمیں یہ توفیق عطا کرے کہ ہم اپنے پیارے پاکستان کو دنیا کی صحیح معنوں میں عظیم قوم بنا سکیں"

اخباری بیان 24 اگست 1947ء قائد نے کہا: "میں پاکستان کے ہر مسلمان مرد اور عورت سے کہتا ہوں کہ وہ اس ملک کی تعمیر کریں تاکہ ہم اقوام عالم میں اپنے لیے ایک معزز مقام پیدا کر سکیں۔"

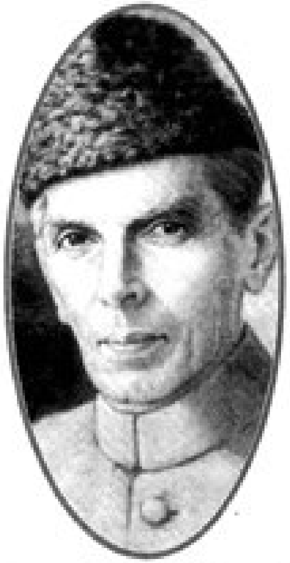

اخباری بیان 24 اگست 1947ء آپ نے کہا: "دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی پاکستان کی جڑیں مضبوط اور گہرائی کے ساتھ قائم کر دی گئی ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تو نے ہی یہ آزاد خود مختار سلطنت ہمیں عطا کی ہے' تو ہی یہاں کے باشندوں کو مصائب و آلام برداشت کرنے کی ہمت دے اور صبر و استقلال عطا فرما اور انہیں صلاحیت بھی دے کہ ہر قسم کے اشتعال کے باوجود پاکستان کی خاطر اس کے امن و امان کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔"

پیغام عید الاضحیٰ 24 اکتوبر 1947ء آپ نے کہا: "ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پاکیزہ' خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ابھریں گے' جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔"

20 اکتوبر 1947ء کو ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا: "آیئے ہم اپنی عظیم قوم اور اپنی خود مختار مملکت پاکستان کی تشکیل و تعمیر کیلئے کچھ تدبیر کریں اب یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کیلئے سنہری موقع ہے اور اس کی خوش قسمتی بھی ہے کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور اور مکمل کردار ادا کرے' بڑی سے بڑی قربانیاں دے اور پاکستانی قوم اور ملک کو دنیا کی عظیم ترین قوم بنانے کیلئے مسلسل انتھک شبانہ روز محنت کرے۔ اب پاکستان' اس کی لاج اور ترقی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بلاشبہ ہم میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔"

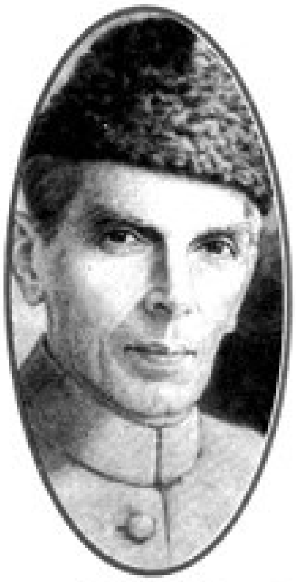

ایک لیڈر‘ ایک انسان

قائداعظم کی ذاتی زندگی کے کچھ اور دلچسپ گوشے۔ بانی پاکستان کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید مرحوم کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قائد عام سیاستدانوں کی سی چال بازی‘ عوام کے ساتھ سازش‘ کسی کو دھوکہ‘ کسی کو لالچ‘ کسی کو دھمکی دینا نہیں چاہتے تھے وہ نہایت بے باک واقع ہوئے تھے اور ہر بات صاف کہہ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم عوام کو جتنا اعتماد محمد علی جناح پر تھا آج تک کسی سیاسی لیڈر پر نہیں رہا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اگر کسی جگہ لیگ کے کارکنوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو محمد علی جناح کسی فریق کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ وہ عوام کو‘ عوام کی خواہشات‘ جماعت اور جماعت کے آئین کو دیکھتے تھے۔ فریقین کو اپنا پورا کیس پیش کرنے کا موقع دیتے اور اس کے بعد ایک نہایت غیر جانبدار جج کی طرح فیصلہ صادر کرتے۔

قائد کو اپنی پوزیشن کی نزاکت کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ کبھی خاص طور پر کسی ایک فرد کی حمایت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ سب کیلئے تھے اور اگر ایک مسلمان کو

قائداعظم سے کوئی رعایت حاصل ہوتی تو دوسرا مسلمان بھی اس کا حقدار ہوتا تھا۔ قائد اس بارے میں نہایت سخت تھے۔ عیدالفطر کے موقع پر نماز کے بعد کراچی عید گاہ میں وہ منبر پر تشریف لائے اور انہوں نے ایک مختصر تقریر کی مگر تقریر کے خاتمہ پر بے شمار مسلمانوں سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ "میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان میں کوئی فرق روا نہیں رکھ سکتا۔ اگر میں یوسف ہارون سے ہاتھ ملاؤں گا تو کسی دوسرے مسلمان کو کیونکر انکار کر سکتا ہوں اور یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں لاکھوں آدمیوں سے مصافحہ کروں"۔

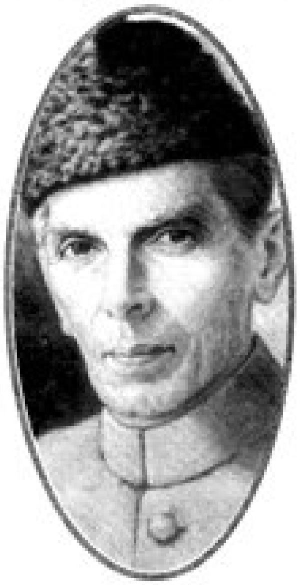

اندازہ لگایئے کہ اتنے بڑے آدمی کیلئے جس کے کروڑوں مداح اور عقیدت مند ہوں' اس قسم کی بندش اپنے اوپر عائد کر لینا کس قدر مشکل ہے لیکن محمد علی جناح اس امتحان میں بھی پورے اترے تھے۔

قائد اپنے دماغی اور جسمانی قویٰ کو تروتازہ کرنے یا انہیں آرام دینے کیلئے کوئی خاص ورزش نہیں کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار مہینے دو مہینے میں ایک بار وہ موٹر میں بیٹھ کر سمندر کی طرف جاتے اور سمندر کے کنارے دس یا پندرہ منٹ چہل قدمی کرتے تھے۔ یہی ان کی ورزش تھی یا جو کچھ بھی آپ سمجھ لیجئے۔ سکون کے لمحوں میں عموماً سگار اور کام کرتے وقت زیادہ تر سگریٹ کا استعمال کرتے۔ محمد علی جناح کو ایک مسلسل تمباکو نوش سمجھنا درست نہیں۔ البتہ وہ سگار' سگریٹ یا پائپ کا استعمال متواتر کرتے تھے لیکن نہایت آہستگی کے ساتھ۔

قائد کو ہندوستانی کھانے بہت مرغوب تھے۔ ان کی طرز رہائش انگریزی تھی اور وہ کھانا انگریزی طرز سے کھاتے تھے لیکن ان کی میز پر اکثر و بیشتر ہندوستانی کھانے ہی چنے جاتے تھے پھلوں میں آم بہت مرغوب تھے۔ نارنگی اور میٹھے کا رس بھی استعمال میں لاتے تھے' چائے نہایت ہلکی اور کافی قدرے تیز رنگ کی پسند کرتے تھے۔

قائد کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن گھر میں بہن بھائی سب انگریزی بولتے تھے۔

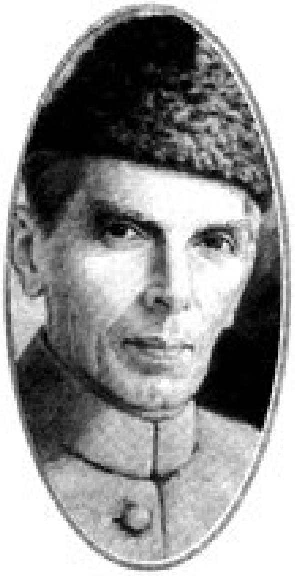

نوکروں سے اردو میں جس قسم کی عام طور پر بمبئی میں بولی جاتی ہے' بات چیت کرتے تھے' بچپن میں فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ اس لئے فارسی رسم الخط سے واقفیت تھی لیکن بعد میں چونکہ اس سے بالکل بے تعلق ہوگئے۔ اس لئے اگرچہ اردو پڑھ سکتے تھے مگر اس میں دقت محسوس کرتے تھے۔ انگریزی زبان کے ماہر تھے اور انگریزی لٹریچر میں شیکسپیئر اور شیلے کا انہوں نے بہت مطالعہ کیا تھا۔ کے ایچ خورشید مزید لکھتے ہیں: لباس کے متعلق کچھ لکھنا لاحاصل ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ان کا لباس ہندوستان بھر میں بہترین اور موزوں ترین گنا جاتا تھا۔ ہندوستانی اور انگریزی لباس ہی زیب تن رہتا تھا۔ ایک بار گرمیوں میں لاہور میں انہوں نے انگرکھے کا استعمال بھی کیا۔ ایک طرح جہاں وہ لباس نہایت قیمتی اور عمدہ سلا ہوا پہنتے تھے' دوسری طرف انہیں ہر قسم کی خوشبو اور سینٹ سے زیادہ رغبت نہیں تھی اور وہ کبھی انکا استعمال نہیں کرتے تھے۔ آپ انہیں دیکھتے تو انکے بالوں کو ہمیشہ خشک پاتے۔

قائد نہایت حاضر جواب واقع ہوئے تھے اور یہ بات غالباً عدالتوں سے انہیں ورثے میں ملی تھی۔ انکی طبیعت میں بھی اور مزاج میں بھی۔ ایک بار گاندھی جناح ملاقات کے دوران میں گاندھی نے ان سے کہا "جناح تم نے تو مسلمانوں پر مسمریزم سا کر دیا ہے" قائد نے فوراً جواب دیا "اور تم نے ہندوؤں پر ہپناٹزم کا عمل کیا ہے"۔

☆......☆......☆

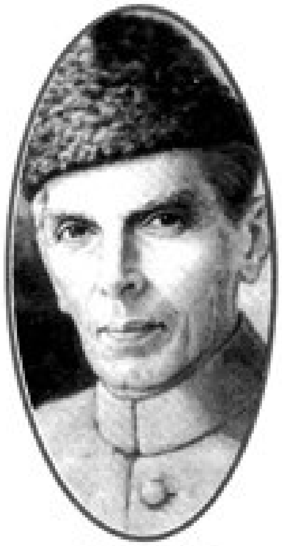

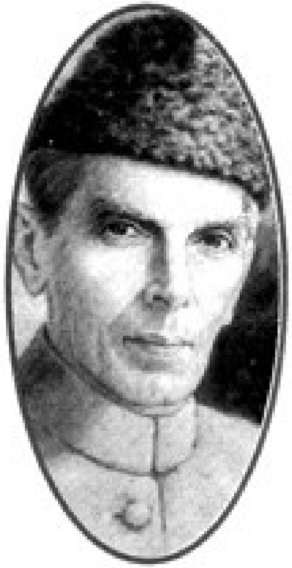

میرٹ' میرٹ اور میرٹ

قائداعظم کی زندگی سے چند اور سبق آموز واقعات۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے ایک روز ان سے کہا کہ مقررہ وقت پر چائے پیش کرنے کیلئے آپ کو کبھی جگانا پڑتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ سوئے ہوئے ہوں تو بہتر ہے آپ کو نہ جگایا جائے۔

قائد نے جواب دیا' صحت کیلئے زندگی بھر کے اصول ترک نہیں کئے جاسکتے۔ میرا اصول ہے کہ کام وقت پر کرو اور میں اسے بدلنے کیلئے تیار نہیں لہذا چائے کیلئے جو وقت مقرر ہے اس وقت پر مجھے جگادیا کریں۔

ایک بار عید کے موقع پر قائداعظم نے عید کی نماز دہلی کی جامع مسجد میں ادا کی۔ مسجد میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگوں نے انہیں پہچانا تو جوش و خروش پھیل گیا۔ اتنے میں دہلی کے ایک سرکردہ لیگی لیڈر آگے بڑھے اور قائداعظم نے انہیں عید کی مبارک دی اور کہا "معاف کیجئے میں آپ سے گلے نہیں مل سکتا۔ یہاں سب مسلمان برابر ہیں اگر میں آپ سے گلے ملوں تو میرا اخلاقی فرض ہوگا کہ میں فرداً فرداً ہر ایک سے معانقہ کروں جو میرے لئے ممکن نہیں اس

لئے میرے لئے محفوظ راستہ یہی ہے کہ میں کسی سے گلے نہ ملوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔

ایک دفعہ قائداعظم ایک مقدمے کے سلسلہ میں آگرہ تشریف لے گئے۔ لیگ کے کارکنوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے قائداعظم سے ملاقات کی اور ایک جلسے کا پروگرام ترتیب دے کر ان سے تقریر کی درخواست کی، مگر قائداعظم نے معذرت کی۔ کارکنوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا ”میں یہاں اپنے مؤکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں، جس کی وہ فیس ادا کر رہا ہے۔ میں خیانت کیسے کروں؟ آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں، ضرور کریں۔ بعد میں بلالیں میں اپنے خرچ پر آجاؤں گا۔“

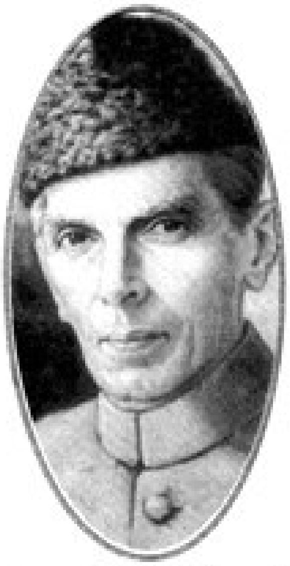

قائداعظم قیام کوئٹہ کے دوران ایجنٹ ٹو گورنر جنرل مسٹر سی اے جی سیویج کے مہمان تھے۔ ان دنوں اے آر خان جوڈیشل کمشنر تھے۔ اے جی سیویج توہین عدالت کے مرتکب ہوئے، جوڈیشل کمشنر نے انہیں نوٹس بھیجا کہ وہ معافی مانگیں ورنہ ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ چلے گا۔ مسٹر سیویج عجیب و غریب صورتحال میں پڑ گئے۔ وہ انتظامیہ کے سربراہ بھی تھے اور قائداعظم کے میزبان بھی۔ قائداعظم کو صورتحال کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا ”مسٹر سیویج قانون کو اپنے تقاضے پورے کرنے چاہئیں اور اس کی بالادستی بھی قائم رہنی چاہئے۔ آپ معافی مانگنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں، یہ ایک اصولی اور اچھی بات ہے۔“

1943ء کے اواخر میں لاہور کے ایک تاجر کتب شیخ محمد اشرف بمبئی آئے اور قائداعظم سے کہا کہ ”میں آپ کی سوانح عمری لکھوانا چاہتا ہوں، اس کیلئے کسی مناسب آدمی کا تعین فرمایا جائے۔“ قائداعظم نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ”کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟“ انہوں نے کہا ”مجھے تو اس کام کیلئے اپنے سے بہتر کوئی آدمی نظر نہیں آتا کیونکہ میں ہر وقت آپ کے ساتھ رہتا ہوں۔“ اس پر قائداعظم نے فرمایا

"اگر آپ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ کا نام لیں، لیکن ایک شرط ہے تمہیں میری ملازمت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک تو ملازمت میں رہتے ہوئے تمہیں وقت نہ ملے گا، دوسرے بعض لوگ کہیں گے کہ یہ کتاب میں نے اپنی نگرانی میں لکھوائی ہے، تیسرے میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے غیر جانبداری سے نہیں لکھ سکو گے۔" واضح رہے کہ مطلوب الحسن سید کے بعد کے ایچ خورشید قائد کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔

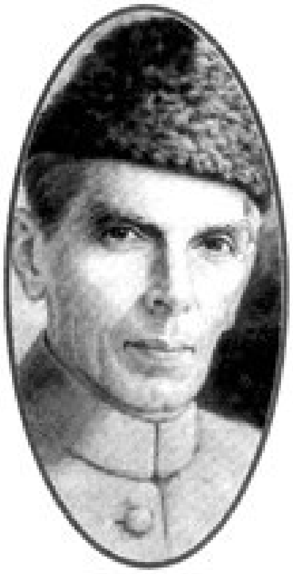

ایک اور واقعہ

قائداعظم 1941ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ جلسے کی صدارت کیلئے لاہور تشریف لائے اور طلبہ کے مہمان کی حیثیت سے لاہور کے ایک ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ ایک روز راجہ غضنفر علی خان ان سے ملنے آئے۔ راجہ صاحب قائداعظم کے پرانے رفیق کار ہونے کے علاوہ مرکزی اسمبلی میں انڈیپینڈنٹ پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ وہ آئے تو قائداعظم موٹر سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ راجہ غضنفر علی خان نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "جناب میں آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہوں۔" قائداعظم نے بلا تامل جواب دیا "میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا مہمان ہوں۔ میرا پروگرام نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، ان سے وقت لے لیجئے۔"

پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس دسمبر 1947ء میں طلب کیا۔ خالق دینا ہال کے صدر دروازے پر مندوبین کے داخلے کے ٹکٹوں کی جانچ پڑتال نیشنل گارڈ کے سالار اعلیٰ نواب صدیق علی خان کر رہے تھے۔ وقت مقررہ پر قائداعظم حسب ضابطہ اپنے داخلے کا ٹکٹ جیب میں ڈالے تشریف لائے۔ سالار اعلیٰ نے ان کا ٹکٹ چیک کرنا سوئے ادب سمجھا اور سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ قائداعظم نے صدیق علی خان سے پوچھا کہ "آپ نے میرا ٹکٹ کیوں نہیں دیکھا۔ یہ تو بے

اصولی ہے' آپ کو پوچھنا چاہئے تھا۔ اس پر نواب صدیق علی خان نے معذرت کی۔

جس زمانے میں قائداعظم گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں قیام پذیر تھے' کبھی کبھی سیر کیلئے ملیر تک جاتے تھے۔ ایک روز آپ کار میں اپنے اے ڈی سی گل حسن جو بعد میں جنرل بنے اور بھٹو صاحب کے دور میں فوج سے الگ ہوئے' کے ساتھ جارہے تھے کہ ریلوے پھاٹک بند ہونے کی وجہ سے کار رک گئی۔ اے ڈی سی گاڑی سے اترے اور پھاٹک والے سے کہا کہ اگر ریل گاڑی دور ہے تو پھاٹک کھول دو کار میں قائداعظم ہیں۔ پھاٹک والے نے پھاٹک کھول دیا اور اے ڈی سی واپس آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ قائداعظم نے ان سے کہا "واپس جاؤ اور پھاٹک بند کرو۔ قانون سب کیلئے قانون ہوتا ہے۔ تم مجھ سے کس طرح بے اصولی کی توقع کرتے ہو۔"

اے ڈی سی نے دوبارہ جا کر پھاٹک بند کروایا اور ریل گزرنے کے بعد پھاٹک کھلنے پر قائداعظم کی کار روانہ ہوئی۔

یہ واقعات بھی قائد کی زندگی کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں جس کو سامنے رکھ کر ہی ہم پاکستان کو مضبوط' خوشحال اور پاکستانی معاشرے کو سربلند کر سکتے ہیں کیونکہ اصولوں اور میرٹ کے نظام کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

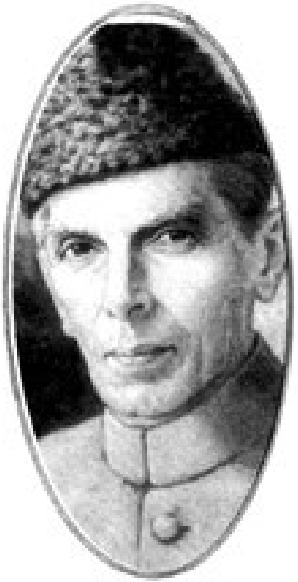

☆......☆......☆

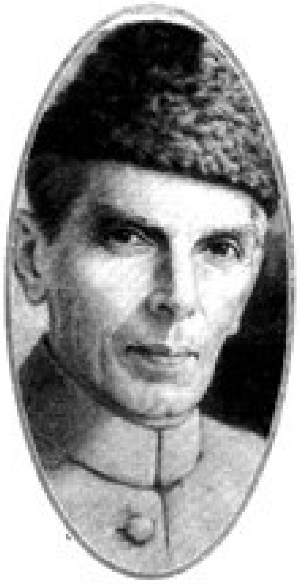

کوئی اسے خرید نہ سکا

مسلمانوں کے لئے ایک ریاست قائم کرنے سے پہلے قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کی بہت کوششیں کیں۔

مشہور مصنفہ مسز سروجنی نائیڈو ہندو مسلم اتحاد کے لئے قائد کی پرخلوص کاوشوں سے اس قدر متاثر تھیں کہ انہوں نے قائد پر ایک کتاب لکھی جس میں انہیں "امن کا سفیر" کے نام سے یاد کیا۔

1913ء میں قائداعظم چھٹیاں گزارنے کے لئے لندن چلے گئے۔ قیام لندن کے دوران قائد نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت کا تاریخی فیصلہ بھی کیا۔ ادھر قائد انگلستان میں تھے اور ادھر ہندوستان میں بی ڈی ولیم صاحب بمبئی کرانیکل میں لکھ رہے تھے۔

"بمبئی ٹاؤن ہال کے جلسے میں انگریزی حکومت کے خلاف جو کچھ ہوا اس کے پیش نظر اگر کسی شخص کی یادگار قائم کی جا سکتی ہے تو وہ مسٹر جناح ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے ہمیں رقم اکٹھی کرنی چاہئے، ان کا ہر چاہنے والا اور پیروکار اس فنڈ میں ایک ایک روپیہ

دے، اگر ہمارے راستہ میں رکاوٹیں نہ کھڑی کی گئیں تو ہم بمبئی کے ٹاؤن ہال میں مسٹر جناح کا مجسمہ نصب کریں گے۔"

اس اپیل پر لوگوں نے بڑے جوش وخروش اور ولولے سے لبیک کہا، بہت جلد قائد کی خدمات کے اعزاز میں جناح پیپلز میموریل ہال تعمیر کیا گیا۔

مسز سروجنی نائیڈو کے قائداعظم سے قدرتی لگاؤ، عقیدت اور چندہ مہم میں ان کی خدمات کے پیش نظر بمبئی کے عوام نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عظیم یادگار کا افتتاح مسز سروجنی نائیڈو کے ہاتھوں سے کروایا جائے۔

جس دن اس یادگار کا افتتاح ہونا تھا اس روز بھی قائداعظم محمد علی جناح انگلستان میں تھے اور واپس نہیں آئے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جناح پیپلز میموریل ہال کا افتتاح کرنے کے بعد ایک بڑی جذباتی اور شاعرانہ تقریر کی اور تقریب کے بعد انگلستان میں مقیم قائد کو ایک تار بھیجا جس میں ان کی خدمات کو ایک جملے میں اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔

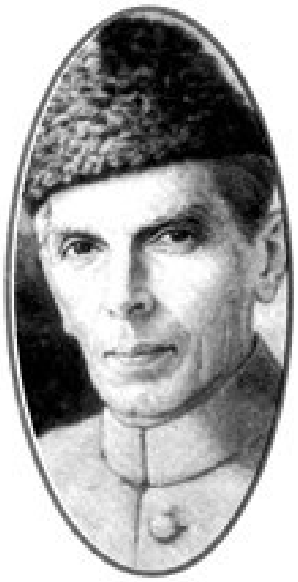

مسٹر جناح آج بمبئی میں "امن کے پیامبر کو اس کے اپنے ملک میں اور اپنی زندگی میں اعزاز مل گیا۔"

دسمبر 1924ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن منعقدہ بمبئی میں ایک مرتبہ پھر یہ کوشش کی کہ ممکن ہو تو ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان 16-1915ء والی برادرانہ جذبے سے بھرپور فضا پیدا کر دی جائے۔ قائداعظم نے اس اجلاس اور کام کی اہمیت کے پیش نظر اس سیشن میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مدن موہن ملاویہ، ایم کے گاندھی اور مسز سروجنی نائیڈو کو بطور خاص مدعو کیا، لیکن قائد اور مسز سروجنی نائیڈو کی انتھک کوشش کے باوجود ہندو لیڈر اپنے نقطہ نظر میں نرمی پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے اس رویہ سے مسز سروجنی نائیڈو کو مایوسی ہوئی اور قائداعظم کو یہ کہنا پڑا

کہ مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے سلسلہ میں ہندو لیڈروں کا رویہ بے جواز ہے اور اب مسلمانوں کے لئے الگ راستہ اختیار کرنا ان کی مجبوری بن گیا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کا خواب پارہ پارہ ہو جانے کے بعد مسز سروجنی نائیڈو اور قائداعظم کے سیاسی راستے الگ الگ ہوگئے اور ان کی ملاقاتیں بھی کم ہوگئیں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے ایک بار پھر اپنے ادبی مشاغل کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کردی۔

ایک مرتبہ وہ تاج محل ہوٹل کے کمرے میں موجود تھیں اور ان کے گرد سیاسی کارکنوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا نہ جانے کس طرح پاکستان کے بارے میں بات چل نکلی۔ حاضرین محفل زیادہ تر ہندو تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے بارے میں مضحکہ خیز باتیں شروع کردیں۔ ایک مسلمان سیاستدان نے جو کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔ قائداعظم کے ساتھیوں کو انگریزوں کا زر خرید کہہ دیا، یہ سنتے ہی مسز سروجنی نائیڈو کے تیور بدل گئے۔

ہنسی مذاق کی جگہ غصے نے لے لی، انہوں نے کانگریسی مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟ جناح اور ان کے ساتھی انگریزوں کے زر خرید ہیں! غور سے میری بات سن لو تم بک سکتے ہو، میں خریدی جاسکتی ہوں، باپو یعنی گاندھی اور جواہر لال نہرو کا سودا بھی شاید ہو سکتا ہے مگر محمد علی جناح انمول ہے، اسے کوئی نہیں خرید سکتا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وہ ہم سے مختلف راستے پر گامزن ہیں۔ لیکن ان کی دیانت ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔"

ایک غیر مسلم خاتون کی زبان سے قائداعظم کی اصولوں کی خاطر کبھی نہ جھکنے اور کبھی نہ بکنے والی شخصیت کے لئے یہ ایک عظیم خراج عقیدت ہے۔ ہمارے قائد واقعی انمول تھے اور مخالف کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

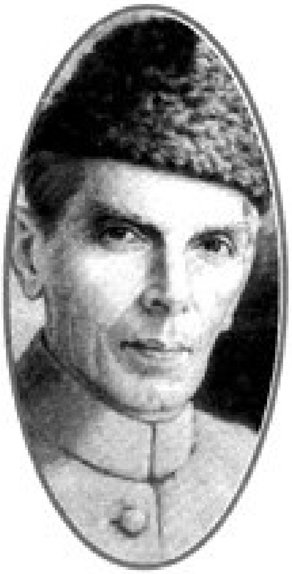

☆......☆......☆

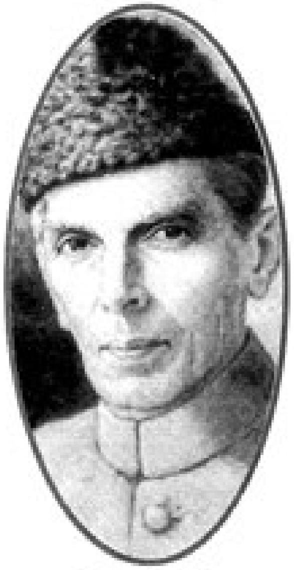

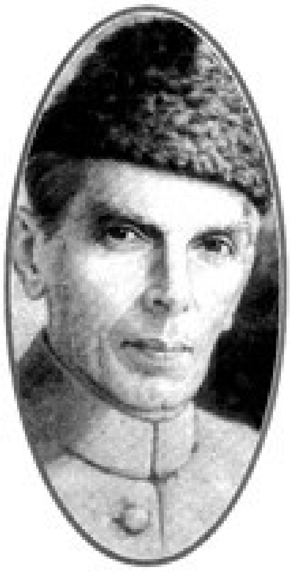

ایک خط ڈاکٹر کے نام

قائداعظم کی خط وکتابت میں سے ایک دلچسپ سلسلہ ستمبر 1944ء کے دو خطوط ہیں جو قائداعظم نے نیچر کیور کلینک اینڈ سینی ٹوریم پونا کے ڈاکٹر ڈی کے مہتہ کے نام لکھے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر مہتہ نے گاندھی کا بھی علاج کیا تھا۔

انہی ڈاکٹر مہتہ نے 5 اکتوبر 1944ء کو پونا سے یہ پہلا خط لکھا:

”مائی ڈیئر ‘مسٹر ایم اے جناح!

میں نے آپ کیلئے اسبغول کا معیاری چھلکا تجویز کیا تھا اور بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ وہ میں نے بذریعہ پارسل آج آپ کو ارسال کر دیا ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے قدرے تاخیر پر معذرت خواہ ہوں۔

اس مختصر سے رابطے کے دوران آپ نے میرے ساتھ جس خوش خلقی اور تپاک کا مظاہرہ کیا اس پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ دو مرتبہ تو آپ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔“

اس خط کے جواب میں قائد 19 اکتوبر 1944ء کو بمبئی سے لکھتے ہیں:۔

"ڈیر ڈاکٹر مہتہ!

آپ کے 5 اکتوبر کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے چھلکے کی بوتل بھیج کر آپ نے دراصل لطف وعنایت کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے چند روز کیلئے میرا جو علاج کیا اس پر میں آپ کا از حد شکر گزار ہوں۔ اس دوران میں مجھے آپ کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے بھی خوشی ہوئی" پھر لکھتے ہیں: "آپ نے اب تک میرا جو علاج کیا ہے میری یادداشت کے مطابق جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسکی فیس اڑھائی سو روپے ہے۔ اس خط کے ساتھ آپ کو اس رقم کا چیک بھی بھیج رہا ہوں۔ شکریہ۔"

آپ کا مخلص ایم اے جناح

ڈاکٹر مہتہ نے چیک واپس کر دیا اور 6 اپریل 1945ء کو بمبئی سے خط لکھا' جس میں فیس قبول نہ کرنے کی وجوہ بیان کیں۔

قائداعظم نے 25 اپریل 1945ء کو اس کا جواب لکھا' جو حسب ذیل ہے۔:

"ڈیر ڈاکٹر مہتہ!

آپ کے 6 اپریل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ میں تقریباً ٹھیک ہوں۔ امید ہے کہ جلد ہی پوری طرح صحت یاب ہو جاؤں گا۔

مجھے آپ کا خط مل گیا تھا جس میں آپ نے میرا ارسال کردہ چیک مجھے لوٹا دیا تھا۔ آپ نے بمبئی میں کمال مہربانی سے میرا جو علاج کیا اس کی فیس قبول کرنے سے آپ انکاری ہیں' اگرچہ میں اس محبت اور احترام کی قدر کرتا ہوں لیکن فیس قبول نہ کرنے پر میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ آپ کو فیس ضرور قبول کر لینی چاہیئے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور مجھے اپنی فیس ادا کرنے دیں۔ اگر آپ فیس قبول کر لیں جو درحقیقت آپ کا حق ہے تو اس سے مجھے بے حد اطمینان حاصل ہو گا۔"

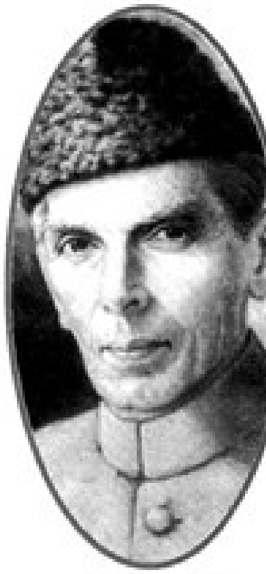

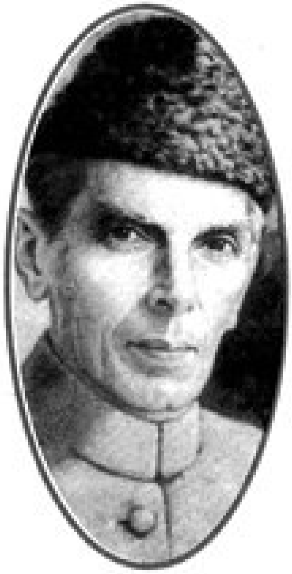

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

ناظرین وسامعین! ڈاکٹر مہتہ کے ساتھ مزید خط وکتابت دستیاب نہیں۔ شاید گاندھی کے معالج سے مزید علاج کرانا قائد کے ساتھیوں یا انہوں نے خود مناسب نہ سمجھا ہو یا کسی دوسرے ڈاکٹر سے رابطہ ہو گیا ہو۔ لیکن خط وکتابت کے اس سلسلے سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے قائد کتنے غیور تھے اور انہیں کسی ڈاکٹر سے علاج تک کروانا کسی طور قابل قبول نہیں تھا جو اپنی فیس وصول نہ کرتا ہو۔

☆......☆......☆

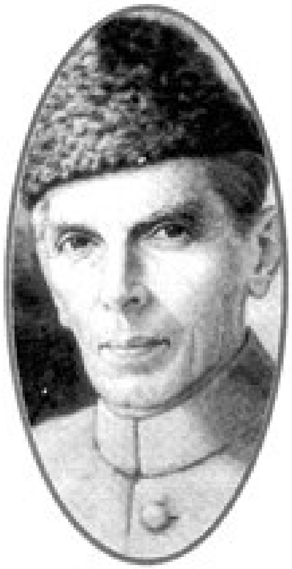

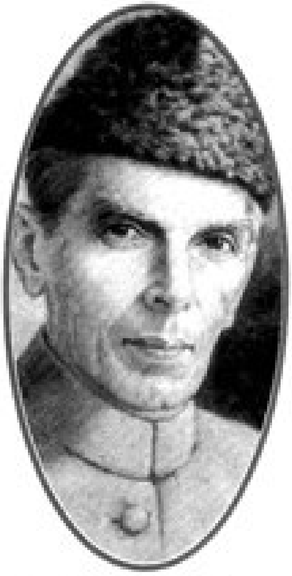

کھلاڑی جو فاؤل نہیں کھیلتا تھا

قائداعظم کی زندگی سے دلچسپ واقعات پر مبنی سلسلہ جاری ہے۔ قائد کے پرائیویٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید لکھتے ہیں۔

”1941ء میں مدراس میں ہوائی سفر کے دوران قائداعظم کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ اجلاس کے بعد آرام کی غرض سے کچھ دن کیلئے اوٹاکمنڈ چلے گئے۔ یہ پہاڑی راستہ انہوں نے موٹر کار کے ذریعے طے کیا۔ لگ بھگ اسی میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں جگہ جگہ انہیں رکنا پڑا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں آبادی مشکل سے سو ہو گی' لوگوں نے چائے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ قائداعظم گاڑی سے اتر کر دیہاتیوں سے خطاب کریں۔ موسم خوشگوار تھا۔ لمبے سفر کی وجہ سے بیٹھے بیٹھے قائداعظم تھک بھی گئے تھے۔ اس لیے وہ راضی ہو گئے۔ چائے پی جا رہی تھی تو اس تقریب سے دور ایک لڑکا جس کی عمر مشکل سے نو سال کی ہو گی' نعرے لگا رہا تھا ”مسلم لیگ زندہ باد' قائداعظم زندہ باد' پاکستان لے کے رہیں گے۔“ اس کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قائداعظم نے دیکھا تو

میزبان سے کہا کہ اس لڑکے کو میرے پاس لائیں۔ لڑکا آیا تو بیچارہ سہم گیا' لیکن جب قائد نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا تو اس کی ہمت بندھی۔ قائداعظم نے پوچھا: "تم نعرہ لگاتے ہو کہ پاکستان لے کے رہیں گے' مگر تمہیں معلوم ہے کہ پاکستان کسے کہتے ہیں؟"

بچے نے کہا "مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم کہ جہاں ہندو زیادہ ہوں وہاں ہندوؤں کی حکومت اور جہاں مسلمان زیادہ ہوں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہئے۔"

قائداعظم نے کہا کہ ویری گڈ قرارداد لاہور کی اس سے بہتر کوئی وضاحت نہیں ہو سکتی۔"

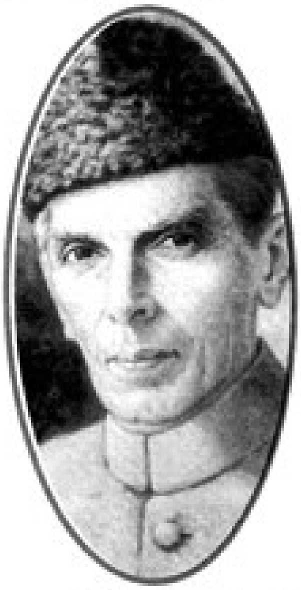

مطلوب الحسن سید لکھتے ہیں کہ جب ہم اس گاؤں سے روانہ ہوئے تو راستے میں قائد نے کہا "تعجب ہے اس جگہ نہ کوئی اخبار آتا ہے' نہ اس گاؤں والوں کے پاس ریڈیو ہے' پھر بھی اس بچے کے ذہن میں پاکستان کی اتنی صحیح تعریف کیسے آئی۔" پھر وہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہوگئے اور کہا "شاید اب پاکستان کو کوئی نہیں روک سکے گا' کیونکہ جب بچہ بچہ سمجھ لے کہ پاکستان کیا ہے تو کوئی اسے بننے سے نہیں روک سکتا۔"

اسی کتاب "ہمارے قائداعظم" ہی میں مطلوب الحسن سید یہ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ لاہور کی قرارداد کے چند ہی ماہ بعد ایک روز میں بمبئی کی ایک سڑک کے کنارے پیدل جا رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک لڑکے نے جس کی عمر شاید چودہ پندرہ سال ہوگی' کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ لڑکے نے سر سے خون پونچھا تو رونے لگا۔ وہاں سے ایک نوجوان گزرا جس نے اس لڑکے کو ملامت کی اور کہا کہ مسلمان کا بچہ ہو کر ذرا سے خون بہہ جانے سے روتا ہے۔ بچے نے کہا کہ میں اس لیے نہیں روتا کہ خون بہہ گیا بلکہ اس لیے روتا ہوں کہ یہ ضائع جا رہا ہے۔ پاکستان بنانے کیلئے ہم آئے دن جلوس نکالتے ہیں' اس جلوس میں پاکستان کیلئے خون بہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔"

جب میں نے یہ واقعہ قائداعظم کو سنایا تو ان پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "اگر ہمارے مخالفوں کو عقل آگئی تو انشاءاللہ ایک قطرہ خون بہنے کی نوبت نہیں آئے گی اور اگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو پھر خون دونوں طرف سے بہے گا۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان کے مخالف بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ خون بہے۔"

اس واقعہ سے لگتا ہے کہ قائداعظم کی دوربین نگاہیں پہچان گئی تھیں کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔

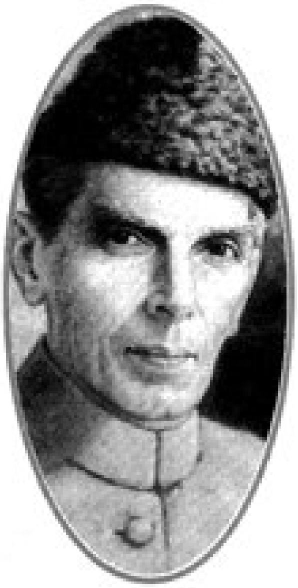

"نقوش قائداعظم" یہ اس کتاب کا نام ہے جسے پروفیسر رحیم بخش شاہین نے مرتب کیا۔ اس کتاب میں سر عبدالقادر کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ درج ہے۔ تحریک پاکستان کے مخالفین چھوٹی موٹی بات پر مسلم لیگ اور قائد کیخلاف کوئی نہ کوئی پراپیگنڈا شروع کر دیتے تھے۔ ایسے ہی ایک واقعہ پر سر عبدالقادر لکھتے ہیں۔

"دہلی میں مرکزی اسمبلی کے اجلاس ہو رہے تھے۔ سر محمد یعقوب مرحوم نے جو اسمبلی کے نائب صدر تھے' جناب محمد علی جناح کے اعزاز میں چند دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں بھی اتفاقاً اس زمانے میں وہاں موجود تھا۔ گفتگو میں قائداعظم نے قدرے دکھی آواز میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

"سیاسیات کی چالیں شطرنج کی چالوں سے ملتی جلتی ہیں۔ میری قوم نے ایک طرف تو یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ان کی جانب سے بطور ایک سیاسی کھلاڑی کے بساط شطرنج بچھاؤں اور چالیں چلوں اور دوسری طرف بعض لوگ اصرار کرتے ہیں کہ میں ساتھ ہی بتاؤں کہ یہ چال کیوں چلی گئی۔ بتاؤ کوئی کھیل اس طرح کھیلا جا سکتا ہے۔ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر انہیں اپنے کھلاڑی پر بھروسہ ہے تو مجھے چال چلنے دیں اور ہر چال کا سبب نہ پوچھیں۔ اللہ نے چاہا تو میں پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

☆......☆......☆

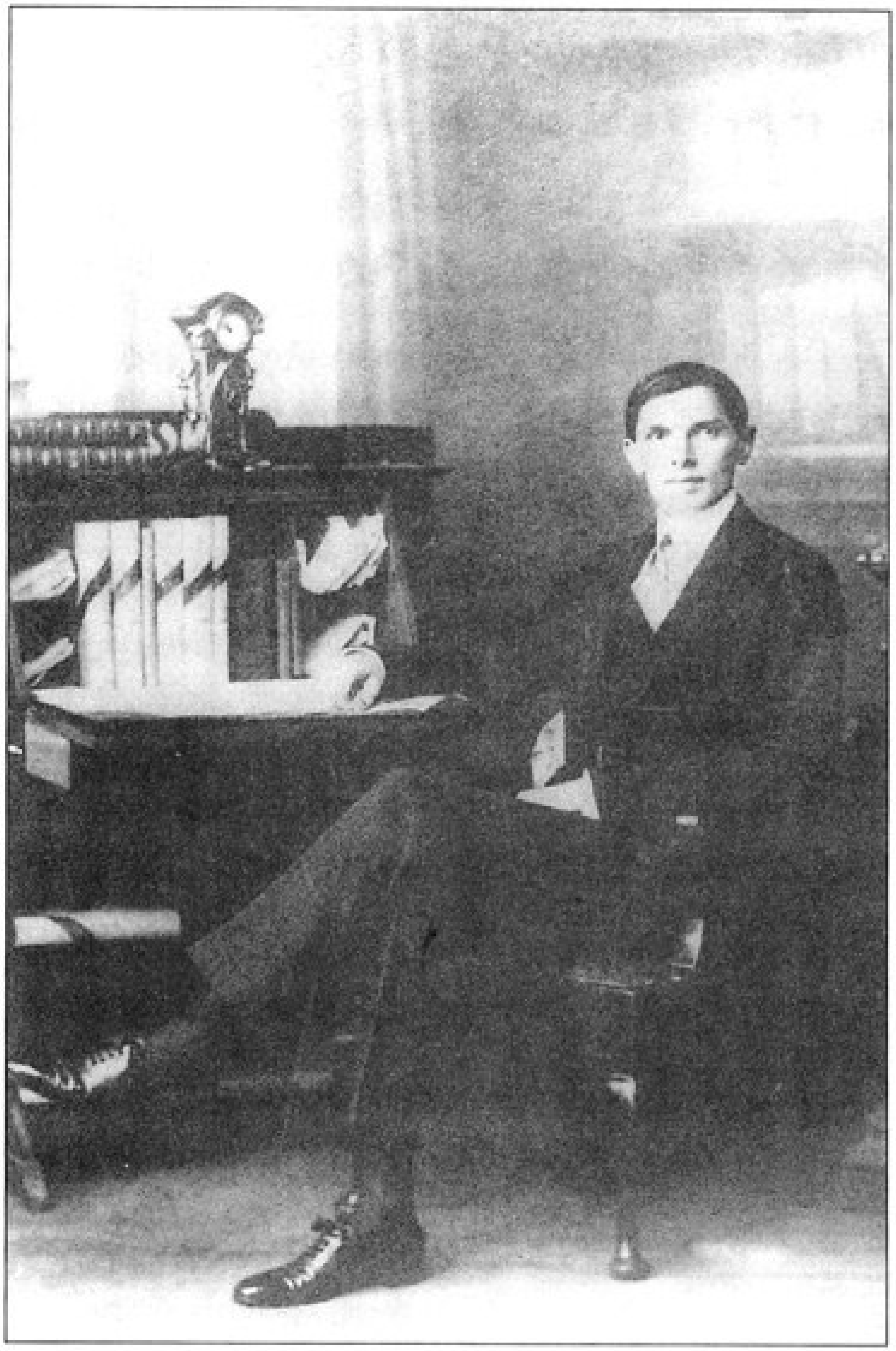

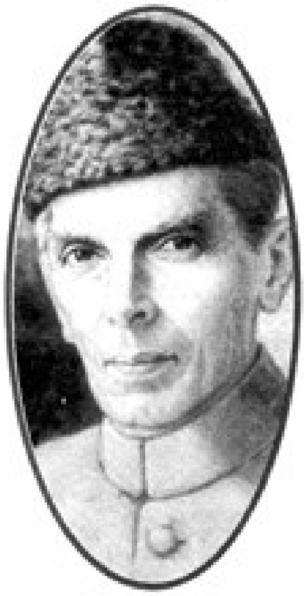

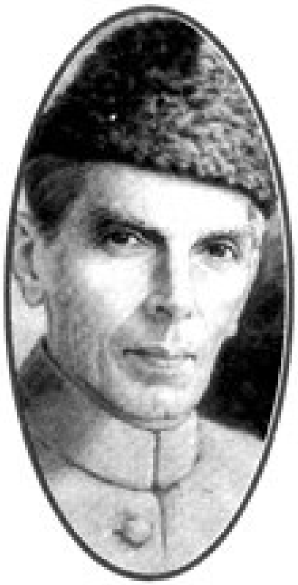

محنتی نوجوان، خوددار وکیل

قائداعظم کے قیام انگلستان کے بارے میں معلومات کم ہیں تاہم کچھ کتابوں میں ان کے چھوٹے چھوٹے واقعات ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر قائداعظم بیرسٹری کر چکے تھے اور ڈگری کے انتظار میں تھے۔ جب بمبئی کے ایک ممتاز پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی نے جو لندن میں مقیم تھے، سنٹرل فنس بری کے حلقے سے دارالعوام یعنی ہاؤس آف کامنز کیلئے الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔

ہندوستان کے دوسرے نوجوان طالب علموں کی طرح قائد نے بھی ان کے ورکر کے طور پر زور و شور سے کام شروع کر دیا۔ انگلستان کے وزیراعظم لارڈ سالسبری نے ایک تقریر میں ہندوستانی امیدوار کو بلیک مین (کالا آدمی) کہہ دیا۔ ان الفاظ سے ہندوستان سے آنے والے نوجوانوں بالخصوص طالب علموں کے جذبات کو بہت ٹھیس پہنچی۔ چنانچہ طلبہ نے جو احتجاج کیا ان میں مسلمان طالب علموں میں محمد علی جناح اور ہندوؤں میں سی آر داس سب سے آگے تھے۔ اس مہم سے دادا بھائی نوروجی کو بہت فائدہ پہنچا اور وہ آسانی کے ساتھ

دار العوام کے رکن بن گئے۔

قائد کی زندگی کا ایک بہت دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اکثر نوجوانوں کی طرح انگریزی ادب کے مطالعہ کے دوران وہ مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیئر سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے ڈرامے دیکھنے کیلئے اولڈ وک جاتے جہاں متعدد تھیٹر موجود تھے۔ ایک مرحلے پر شیکسپیئرین ڈرامیٹک کلب کی طرف سے انہیں پیشکش کی گئی کہ وہ بھی ڈرامے میں کام کریں' لیکن جب انہیں کردار سنایا گیا تو وہ بہت معمولی تھا۔ قائد نے جو نوجوان ہونے کے باوجود اعتماد سے بھرپور شخصیت تھے' شکریئے کے ساتھ ایک ثانوی کردار ادا کرنے سے معذرت کرلی۔ ظاہر ہے جو شخص مستقبل میں ایک نئے ملک کی بنیاد رکھنے والا تھا وہ کوئی چھوٹی بات قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔

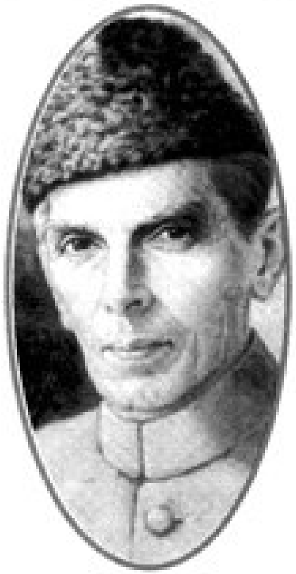

1896ء میں یعنی انگلستان میں چار سال قیام کے بعد محمد علی جناح بحری جہاز سے واپس وطن کی طرف لوٹے تو گھریلو زندگی میں ان کیلئے دنیا بدل چکی تھی انکی اہلیہ اور والدہ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا اور والد کاروبار میں نقصان کی وجہ سے مقروض ہو چکے تھے۔ ان کے والد جناح بھائی پونجا بھائی کی خواہش تھی کہ محمد علی کراچی میں پریکٹس کریں لیکن قائد نے فیصلہ کیا کہ وہ بمبئی جا کر قسمت آزمائیں گے۔

معروف سیاسی اور ادبی شخصیت سروجنی نائیڈو جنہیں بلبل ہند بھی کہا جاتا ہے' نے قائد پر اپنی کتاب "ایمبسڈر آف یونٹی" میں قائد کے فیصلے کے بارے میں لکھا ہے کہ "جناح قسمت کے دھنی تھے لیکن انگلستان سے واپسی پر جب ان کا خاندان غیر متوقع طور پر غربت کا شکار ہو گیا تھا تو جناح اپنی پرکشش جوانی' بے مثال جرأت اور بے پناہ عزم وہمت کے بل پر دنیا کو مسخر کرنے نکل کھڑے ہوئے۔"

یہ 1897ء کا سال ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے قائد نے جو ایک نوجوان ہیں' بمبئی کے ایک ہوٹل میں کرائے پر ایک کمرہ لے کر ہائیکورٹ میں اپنا نام درج کروادیا ہے۔ فورٹ

ایریا میں واقع ایک چھوٹے سے دفتر میں قانون کی کتابوں پر جھکا ہوا محمد علی بظاہر کسی موکل کے انتظار میں نظر آتا ہے' لیکن در حقیقت قدرت اس نگینے کی تراش خراش کر رہی ہے جسے آگے چل کر صرف غیر منقسم ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں چمکنا تھا۔

وکالت کے دور کی ابتدا ہی میں بے شمار مشکلات کے باوجود قائد ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جواثم ایلوا کی ایک کتاب "لیڈرز آف انڈیا" میں قائداعظم کے ان دنوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

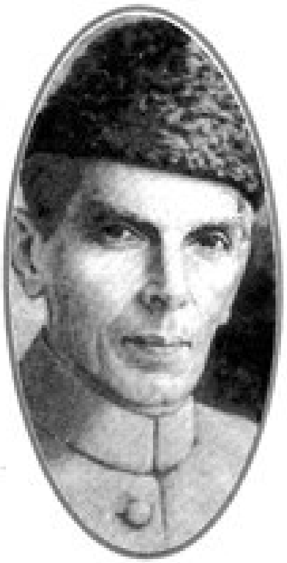

"شروع کے سالوں میں جناح ہر تکلیف برداشت کرتے لیکن منہ سے اُف تک نہ کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی سے اپنا دکھ بیان نہیں کیا۔"

جی الانا لکھتے ہیں کہ "اس دور میں قائد انتہائی پرکشش شخصیت کے مالک تھے' وہ دراز قد تھے' ان کی نظریں مخاطب کے دل میں کھب جاتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے افراد کی طرح وہ غیر معمولی طور پر لمبے ہاتھوں کے مالک تھے۔ البتہ مالی طور پر بہت زیادہ خوشحال نہ ہونے کے باوجود وہ انتہائی نفیس لباس پہنتے اور ہمیشہ دوسروں سے ممتاز نظر آتے۔"

جلد ہی جناح کی محنت رنگ لائی اور بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل میک فرسن نے انہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ انہی دنوں ریذیڈنسی مجسٹریٹ کی ایک عارضی آسامی خالی ہوئی تو نوجوان محمد علی کو اس پر تعینات کر دیا گیا۔ بعد ازاں انہیں پندرہ سو روپے ماہوار کی پیشکش ہوئی جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی مگر انہوں نے ملازمت سے معذرت کی اور وکالت کیلئے اپنا ذاتی دفتر کھولا۔ اب ان کی مالی حالت کچھ سنبھل گئی تھی' لہٰذا انہوں نے اپنے والد کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ جناح بھائی پونجا بھائی کراچی سے بمبئی منتقل ہو گئے۔

سر چمن لال کی کتاب......

Recollections and Reflections میں قائد کے اس دور کی وکیلانہ زندگی کے متعدد واقعات درج ہیں۔ اس زمانے میں بھی قائد کی آزادیِ اظہار اور جرأت وہمت بے مثال سمجھی جاتی تھی۔ جواثم ایلوا کی کتاب "لیڈرز آف انڈیا" میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے کہ حکومت ہند کے ہوم ممبر سر ولیم ونسن نے کہا کہ لوگ ہم آئی سی ایس افسروں پر ہمیشہ نکتہ چینی کرتے ہیں کہ سختی اور درشتی سے پیش آتے ہیں آپ مجھے ایک بھی ایسا سول افسر دکھا دیجئے جو سختی اور درشتی کے علاوہ جنگ جوئی میں مسٹر جناح کا مقابلہ کر سکے۔

☆......☆......☆

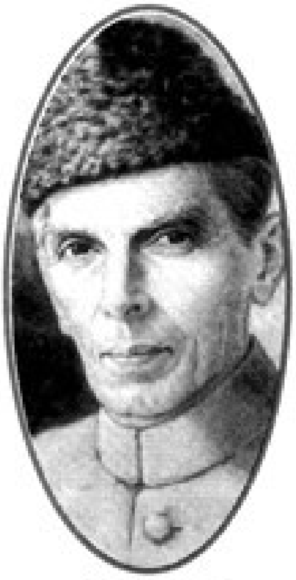

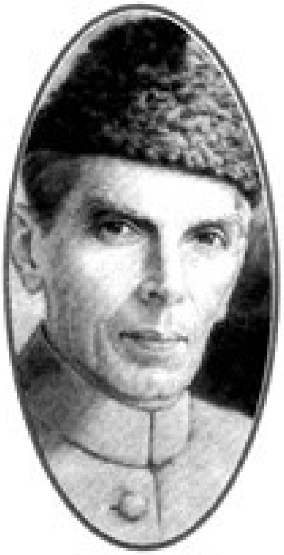

مایوسی اور انگلستان کو واپسی

قائداعظم کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کر ہندوستان سے واپس انگلستان چلے گئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب دوسری گول میز کانفرنس ناکام ہو چکی تھی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ہم آہنگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں علامہ سر محمد اقبال بھی تھے جو اپنے وقت کے سب سے بڑے مسلمان مفکر اور شاعر تھے۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا:

”ہندوستان کا آئندہ آئین ایک قوم کے مفروضے پر مبنی نہیں ہونا چاہیے‘ نہ برطانوی جمہوریت کے اصولوں کو ہندوستان پر مسلط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا کیا گیا تو غیر شعوری طور پر ہندوستان میں خانہ جنگی کے بیج بوئے جائیں گے۔“

اس خطبے میں آگے چل کر علامہ اقبال نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا ”اگر ایسی مملکت کی تشکیل ہو جائے تو یہ اسلام اور ہندوستان دونوں کے حق میں

اچھا ہوگا...... میری رائے ہے کہ پنجاب' سرحدی صوبے' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک الگ مملکت بنادی جائے۔ شمال مغربی ہند میں ایک متحد مسلم مملکت کا قیام' مسلمانوں کی یا کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر کا تقاضا ہے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ لندن میں قائد اور علامہ اقبال کی کئی مرتبہ ملاقات ہوئی' لیکن مسلمانوں سے اپنی مایوسیوں کے باعث قائد اس وقت علامہ اقبال کی سیاسی منطق کے قائل نہ ہوئے۔ کہیں دس برس بعد جاکر قائد نے یہ بات تسلیم کی کہ ہندو مسلم اتحاد کا جو خواب میں نے دیکھا تھا اور جس کیلئے اتنی جدوجہد کی تھی' وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ وہ خود کہتے ہیں:

"ہندوستان کے آئینی مسائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا جس پر اقبال بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔"

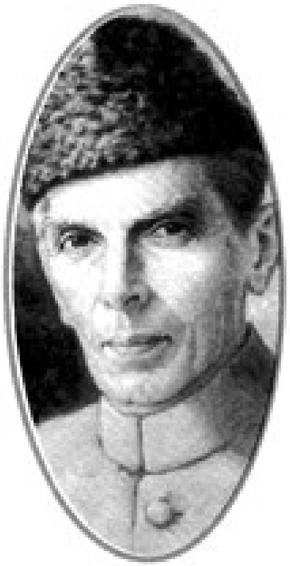

بہر حال قائد اعظم انگلستان میں ٹھہر گئے تھے۔ ان کے سوانح نگار ہیکٹر بولا کھو کہتے ہیں کہ مسلمان ہند کی عمومی بے حسی کے باعث سیاست کے میدان میں ان کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ اپنی شادی کے المناک انجام کی یاد بھی شاید انہیں چین نہ لینے دیتی ہو۔ ہاں' ان ناکامیوں اور صدموں کے ہجوم میں ان کی غیر معمولی قانونی لیاقت نے انہیں سہارا دیا۔ انہوں نے اپنی باقی سب دلچسپیوں سے کنارہ کرلیا اور فیصلہ کیا کہ وہ لندن میں رہ کر وکالت کریں گے۔

کئی برس بعد' 1938ء میں قائد نے علی گڑھ کے طلبہ کو بتایا کہ انہوں نے وطن چھوڑ کر لندن میں سکونت کیوں اختیار کی تھی۔ علی گڑھ میں ان کی تقریر سے اقتباس ملاحظہ ہو' وہ کہتے ہیں:

"گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں ہندوؤں کے رویے سے مجھے سخت صدمہ پہنچا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ ان اجلاسوں میں ہندوؤں کے جذبات و خیالات کو میں نے اصلی روپ میں دیکھا' ان کے ذہن کے تمام گوشے میرے سامنے بے نقاب ہوگئے اور ان کا رویہ

پوری طرح مجھ پر منکشف ہوا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب ہندو مسلم اتحاد کی کوئی امید نہیں۔ میں اپنے ملک کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ مسلمانوں کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی جیسے وہ کسی لاوارث خطہ زمین کے باشندے ہوں۔ ان کے رہنما یا تو انگریزوں کے خوشامدی اور کاسہ لیس تھے یا کانگریس کے حاشیہ بردار۔ جب کبھی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی یہ دونوں عناصر آڑے آئے اور تنظیم کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں ہندوستان کیلئے کچھ کر سکتا ہوں نہ ہندوؤں کی ذہنیت بدل سکتا ہوں' نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا احساس دلا سکتا ہوں۔ میں اتنا مایوس اور دل شکستہ ہوا کہ میں نے لندن میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہندوستان کی محبت میرے دل میں ضرور تھی' لیکن میں بالکل مایوس ہو چکا تھا۔"

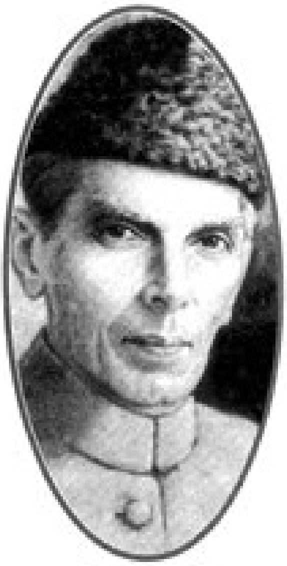

یہ تھی وہ ذہنی کیفیت جس نے قائد کو ترک وطن پر مجبور کیا تھا۔

تاریخ ہمیں دکھاتی ہے کہ جون 1931ء میں ایک دن ہیمپ اسٹیڈ کے علاقے میں سڑک پر چلتے ہوئے محمد علی جناح کو ایک عالی شان مکان دکھائی دیتا ہے۔ یہ ویسٹ ہیتھ ہاؤس تھا۔ قائد مکان کے سامنے ٹھہر جاتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ اس سہ منزلہ کوٹھی میں بہت سے کمرے اور چھتر تھے اور ایک اونچا مینار تھا جس سے گردونواح کے علاقے کا منظر خوب دکھائی دیتا تھا۔ مکان کے ساتھ ایک دربان خانہ' گاڑیوں کیلئے لمبی پارکنگ' سڑک اور اردگرد آٹھ ایکڑ کا باغ اور چراگاہ بھی تھی۔

بولا تھو لکھتے ہیں کہ اس کوٹھی اور اس کے احاطے کا اب کوئی نشان باقی نہیں' ان کی جگہ نئی طرز کے چھوٹے مکانوں نے لے لی ہے' لیکن ان دنوں قریب ہی لیڈی گریم وڈ رہتی تھیں' جن سے 1931ء میں مسٹر جناح نے یہ کوٹھی خریدی تھی۔

☆......☆......☆

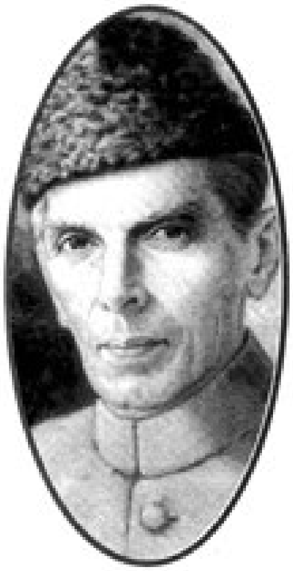

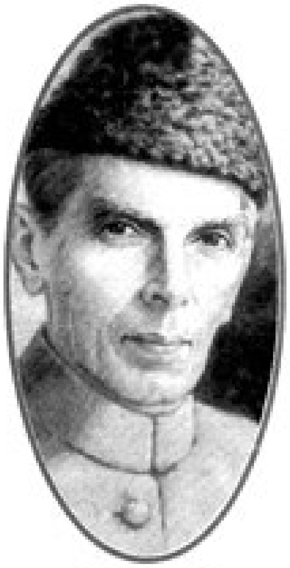

قومی خیالات کا ترجمان

بانیٔ پاکستان قائداعظم کی باتیں اور ان کی یادیں ہر پاکستانی کیلئے مشعل راہ ہو سکتی ہیں۔ چند واقعات اور پیش خدمت ہیں۔ معروف قانون دان سر عبدالقادر لکھتے ہیں۔

1943ء میں مجھے کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا۔ قائداعظم بھی ان دنوں وہاں مقیم تھے۔ ایک دن میں قائداعظم والی میز پر تھا۔ وہاں کچھ ذکر ان ملاقاتوں کا آگیا جو اس سے پہلے قائداعظم اور لارڈ لنلتھکو وائسرائے ہند سے ہوتی رہی تھیں۔ قائد نے بتایا کہ ایک دن وائسرائے نے ان سے یہ کہا کہ اگر وہ ضد چھوڑ دیں کہ پاکستان ضرور بننا چاہیے اور مسلمان علیحدہ قوم تسلیم کیے جائیں تو وہ فریق ثانی یعنی کانگریس کو مائل کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو بہت سی سیاسی مراعات دے۔ قائداعظم نے کہا کہ اس کا جواب میں آئندہ ملاقات میں دوں گا۔

چند روز بعد ان کی دوسری ملاقات کا دن آیا تو قائداعظم کوئی چیز اپنی جیب میں ڈال کر وائسرائے کے ہاں گئے۔ وہ چیز تھی پاکستان کا ایک نقشہ جس میں وہ صوبہ جات جن میں مسلمانوں کی آبادی کثرت سے تھی سبز رنگ کے دکھائے گئے تھے۔ یہ نقشہ گیارہ سال کی ایک لڑکی نے ریشمی رومال پر سوزن کاری سے کاڑھا تھا۔

قائداعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ یہ لڑکی روہیل کھنڈ میں ایک پرانی وضع کے مسلمان گھر میں پیدا ہوئی۔ گھر میں پردہ کی سخت پابندی ہے اس لئے کسی مدرسے میں پڑھنے کیلئے نہیں بھیجی گئی۔ اس نے نہایت محنت سے کپڑے پر یہ نقشہ بنایا اور اس کی آرزو تھی کہ یہ نقشہ خود قائداعظم کی خدمت میں پیش کرے۔ قائد دورہ کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے جہاں یہ لڑکی رہتی تھی تو اس کا باپ قائد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ کچھ وقت نکال کر ان کے گھر چلیں جہاں لڑکی یہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہے کیونکہ خاندانی روایات کے تحت وہ جلسے میں نہیں آسکتی۔

قائداعظم نے باوجود مصروفیات کے اس لڑکی کی درخواست کو منظور کیا' اس کے گھر گئے اور وہاں اس کے ہاتھ سے یہ تحفہ قبول کیا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

جب قائد نے یہ نقشہ وائسرائے کو دکھایا تو وہ بنانے والی کی دستکاری کی تعریف کرنے لگا۔ قائداعظم نے جب اس لڑکی کی عمر بتائی اور اس کی گھریلو زندگی کا حال سنایا تو اسے بہت تعجب ہوا۔

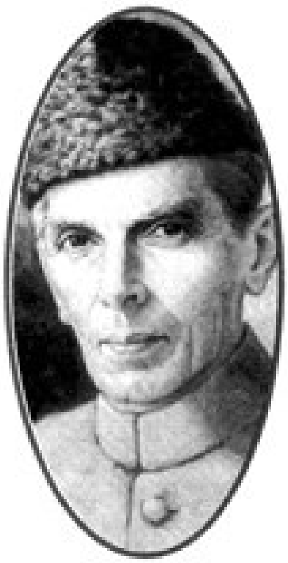

اس پر قائداعظم نے وائسرائے سے کہا کہ "آپ کیا سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو سکھاتا ہوں کہ وہ پاکستان مانگیں' حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ یہ خیال نوجوان طبقے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور میں جب اس پر زور دیتا ہوں تو فقط اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔"

بقول سر عبدالقادر قائداعظم کہتے ہیں کہ "لارڈ لنلتھگو اس نقشے سے بہت متاثر ہوئے اور ان پر واضح ہوگیا کہ پاکستان کا تخیل پردہ کرنے والی گھریلو عورتوں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے دلوں تک پہنچ گیا ہے اور اب یہ خیال بدلا نہیں جاسکتا۔"

ملک برکت علی ایڈووکیٹ بابائے قوم کے جانثار کارکنوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے صاحبزادے ملک افتخار علی نے "ناقابل فراموش یادیں" کے عنوان سے قائد کے ساتھ ملاقاتوں کا حال قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لاہور میں قائد کی آمد پر میرے والد مرحوم کی

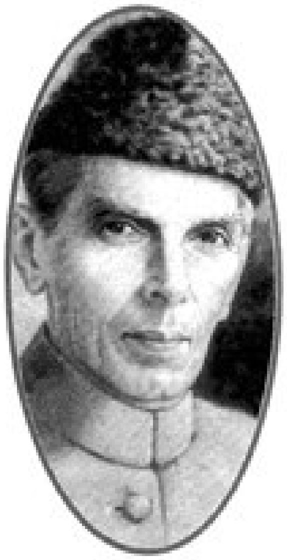

طرف سے ایک ٹی پارٹی دی گئی جس میں قائداعظم کے سامنے وہ کیک رکھا گیا جو ہندوستان کے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا اور اس میں پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کا رنگ سبز تھا۔

جب بابائے قوم نے کیک کاٹا تو بڑی احتیاط سے کیک کا سبز حصہ الگ کر دیا اور اس کام میں کافی وقت لگا کیونکہ وہ مجوزہ سرحد کے عین اوپر چھری رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ کیک کاٹ رہے تھے۔ کسی نے کہا۔

"حضور! ذرا سا اور کاٹ دیجئے۔"

قائد نے کہا "میں اس طرح کا تجاوز ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ہم اپنا ایک انچ چھوڑیں گے نہ دوسروں کا ایک انچ لیں گے۔ یہی ہماری پہچان اور یہی ہمارا ایمان ہے۔"

ملک افتخار علی ہی نے ایک اور واقعہ بھی قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بابائے قوم سے میری ایک ملاقات 1944ء میں سرینگر میں ہوئی جہاں وہ جھیل ڈل میں ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ قائد نے مجھے اگلے دن پونے ایک بجے کا وقت دیا تھا۔

بدقسمتی سے مجھے جھیل ڈل کے دوسرے کنارے پہنچنے کیلئے کشتی بروقت نہ مل سکی اور میں قائد کے ہاؤس بوٹ میں پہنچا تو ایک بج چکا تھا۔

قائد بوٹ کے زینے سے اتر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔ "تم پندرہ منٹ لیٹ ہو گئے ہو۔ مسلمان قوم کو وقت کی پابندی سیکھنی چاہیئے۔"

پھر مجھے اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور بڑے مشفقانہ انداز میں پوچھا کہ "کیا تم نے آج صبح کا اخبار پڑھا ہے؟" میں نے عرض کیا کہ آج کل آرام کر رہا ہوں اس لئے شام کو اخبار پڑھتا ہوں۔ قائد بولے۔

"اخبار ہمیشہ صبح سویرے پڑھا کرو تاکہ تمہیں سب سے پہلے تمام حالات کا علم ہو کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے، شام کو اخبار پڑھنے سے کیا فائدہ۔"

☆......☆......☆

London 25th April 1893.

To:-

The Master of the Bench of
The Honourable society of Lincoln's Inn

Sirs

I most humbly & respectfully beg to inform you that I intend to appear for the preliminary Exam.

Having learnt that I shall be examined in the Latin Language I request you in this petition to grant me dispensation for the following reasons.

I Being a native of India I have never been taught this language.

II I know several of Indian languages which we are required to learn as our Classics or second languages.

III Thus having spent my time in learning other languages which are required there, I have not been able to learn the Latin Language & which if I be compelled to learn will take some years to pass the required exam.

I hope you will kindly comply with my request considering the reasons to be satisfactory

I remain sirs
yours most humble & obedient
servant
Mahomedalli Jinnahbhai
40 Glazbury Road
West Kensington
W.

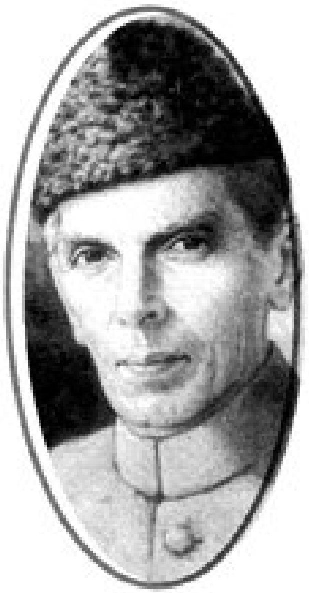

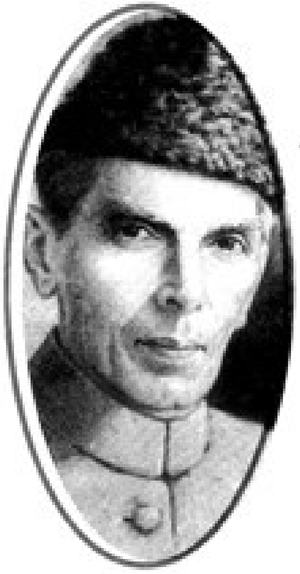

قائد کے ذاتی خطوط

"صرف مسٹر جناح" یہ کتاب کا نام ہے جسے مرزا شمس الحسن نے مرتب کیا۔ اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی ہے کہ یہ قائداعظم کے ان ذاتی خطوط پر مشتمل ہے جو انہوں نے مختلف لوگوں کو لکھے۔ کتاب کا اصل نام "پلین مسٹر جناح" ہے اور اس کا اُردو ترجمہ منیر احمد منیر نے کیا ہے۔

ذاتی خطوط کسی بھی شخص کی حقیقی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں کیونکہ لکھنے والا عام طور پر خط لکھتے وقت اپنے خیال میں کوئی اضافہ یا ترمیم نہیں کرتا کیونکہ یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی کہ اس کا خط شائع کیا جائے گا۔

مرزا شمس الحسن برسوں تک آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری رہے۔ دفتری امور کی دیکھ بھال اور ریکارڈ کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔ 14 اگست 1947ء سے 7 دن پہلے مرزا شمس الحسن کو قائداعظم کی رہائش گاہ اورنگزیب روڈ بلایا گیا۔ ان دنوں قائد دہلی سے کراچی کے لئے پرواز کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مرزا شمس الحسن کے بقول قائداعظم نے

انہیں ٹاٹ کے تھیلوں کے ایک ڈھیر کی طرف متوجہ کیااور کہاکہ ان میں میرے کچھ ذاتی خطوط اور کاغذات ہیں۔ یہ آپ لے جائیں۔

سوال کیا گیا"میں انہیں تلف کردوں یا سنبھالوں؟"

قائد نے کہا"نہیں میں چاہتا ہوں" آپ انہیں دہلی میں ہونے والے اس قتل عام میں تلف ہونے سے بچائیں اور اپنی ذاتی تحویل میں رکھیں۔"

مرزا شمس الحسن لکھتے ہیں کہ میں یہ ریکارڈ اپنے ساتھ پاکستان لایااور 1948ء میں قائد کی آخری بیماری کے دوران ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے خود ہی ان کاغذات کا موضوع چھیڑااور دریافت کیاکہ آپ نے ان کی ترتیب اور چھانٹی مکمل کرلی ہے۔ میں نے بتایاکہ اس ضمن میں کچھ نہیں کیاکیونکہ میں مسلم لیگ کے آفس کی تنظیم میں مصروف رہا ہوں۔

انہوں نے کہاکچھ عرصہ انہیں روکے رکھنا۔ یہی کوئی 20 برس۔ پھرانہیں شائع کر دیناچاہئے تاکہ مسلمانوں کوان مشکلات کا علم ہوجوانہیں منظم کرتے وقت ہمیں پیش آئیں اور ان تفصیلات کا بھی کہ پاکستان کی جنگ کس طرح لڑی اور جیتی گئی۔

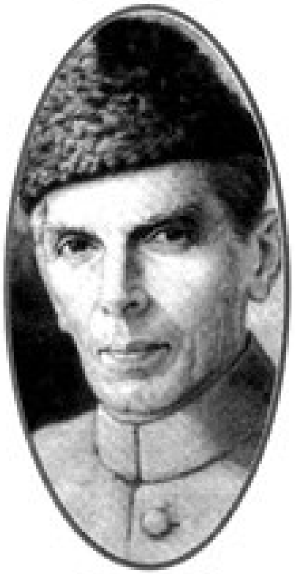

کتاب کا پہلا خط 5 فروری 1945ء کولکھا گیا۔ یہ رسول اکرم ﷺ کے یوم پیدائش کے موقع پر کولمبو پر سری لنکا سے شائع ہونے والے "مسلم ویوز" کے ایڈیٹر کے نام قائد کے پیغام کی شکل میں ہے۔

خط کے الفاظ یہ ہیں۔

"رسول اکرم ﷺ کے یوم پیدائش کے موقع پر آپ نے مجھ سے پیغام مانگا ہے۔ آج میں آپ کواس کے سوااور کوئی پیغام نہیں دے سکتاکہ اسلام کی بہترین روایات ہم تک رسول اکرم ﷺ کے ذریعے پہنچیں'لہٰذادنیابھر کے مسلمانوں کواپنی زندگی اس کے مطابق بسر کرنی چاہئے۔"

اسلام جمہوریت' امن اور انصاف قائم کرنے کیلئے دنیا میں آیا تاکہ مجبوروں اور پسے ہوؤں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ وہ نوع انسان تک امیر اور غریب' ادنیٰ اور اعلیٰ کے درمیان مساوات کا پیغام لے کر آیا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نصب العین کی خاطر جدوجہد میں گزارا۔ اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس عظیم نصب العین اور اسلام کی شاندار روایات کو قائم رکھے۔ بنی آدم میں مساوات کیلئے جدوجہد' انسان کے جائز حقوق کے حصول اور جمہوریت کے قیام کیلئے انتہائی کوشش کرے۔ ہمارا یقین ہے کہ پاکستان کا قیام جمہوری اصولوں اور انصاف سے ہم آہنگ ہے۔ اسی لئے ہم اس کے حصول کیلئے اٹل ہیں۔ انشاءاللہ فتح ہماری ہوگی۔

(ایم اے جناح)

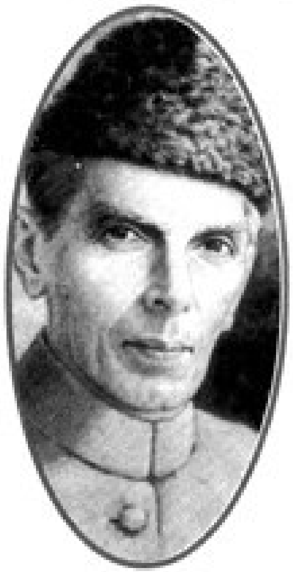

اس خط کے آخری الفاظ "انشاءاللہ فتح ہماری ہوگی" ظاہر کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ سب کچھ کریں گے یعنی ان مقاصد کو اپنائیں گے جو قائد نے تجویز کئے ہیں تو کامیابی اور کامرانی ہمارا مقصد ہوگی اور یہ سارا پروگرام قیام پاکستان کے مقاصد پر مشتمل ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائد کے ذہن میں اسلام کا کیا تصور تھا۔

☆......☆......☆

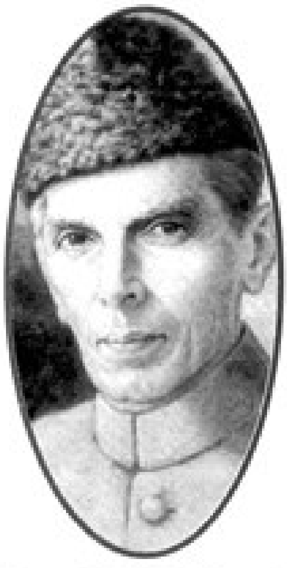

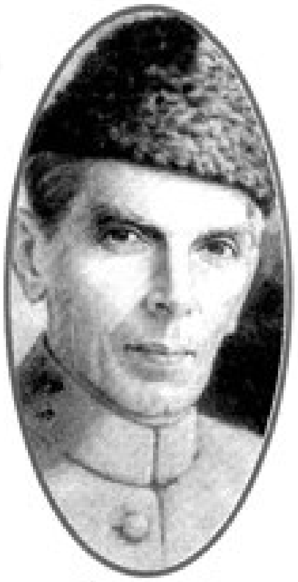

خطاب یا اعزاز نہیں چاہئے

قائداعظم کے خطوط کی بات ہو رہی ہے تو ایک اور بہت دلچسپ خط مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے 12 اپریل 1942ء کو لکھا گیا جس پر وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے دستخط ہیں۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:۔

"مائی ڈیئر مسٹر جناح!

اس یونیورسٹی کے کورٹ میں 12 اپریل 1942ء کی میٹنگ میں مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں کسی ایسی تاریخ کو جسے آپ موزوں سمجھیں آپ کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے مناسب اقدامات کروں۔

کیا آپ ازراہ عنایت مجھے مطلع فرمائیں گے کہ آپ کے لیے کون سا موقع مناسب رہے گا تاکہ آپ کے لیے ضروری اقدامات کیے جا سکیں۔"

آپ کا مخلص

ضیاء الدین احمد

اس خط کے جواب میں قائداعظم نے 4 اکتوبر 1942ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کی شاندار خدمات کے باوجود کسی قسم کے خطاب یا اعزاز کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کے لیے خط لکھا، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ڈیئر ڈاکٹر سر ضیاء الدین!

آپ کا 30 ستمبر کا خط ملا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کا فیصلہ کیا، اگرچہ میں اس جذبے کی بے حد قدر کرتا ہوں جو کورٹ کے اس فیصلے کا محرک بنا لیکن میں بادل نخواستہ یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے زندگی صرف مسٹر جناح کی حیثیت سے بسر کی ہے اور صرف مسٹر جناح کی حیثیت سے مرنے کی آس رکھتا ہوں۔ میں کسی قسم کے خطاب یا اعزاز کا سخت مخالف ہوں، مجھے بہت مسرت ہوگی اگر میرا نام کسی قسم کے سابقے سے بے نیاز رہے۔"

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

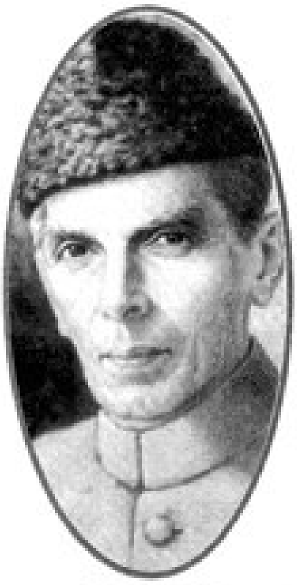

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے 3 دسمبر 1942ء کو قائداعظم کو پھر لکھا:

"مائی ڈیئر مسٹر جناح!

میں نے آپ کا 4 اکتوبر 1942ء کا خط ایگزیکٹو کونسل کے سامنے رکھا۔ کونسل نے متفقہ طور پر کہا کہ میں آپ سے فیصلے پر نظر ثانی کی گزارش کروں۔ آپ کی طرف سے اس کی نامنظوری بڑی مایوسی کا باعث ہوگی۔ اعزازی ڈگریاں پانیوالوں میں آپ کے نام کی شمولیت یونیورسٹی کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوگی۔"

آپ کا مخلص

ضیاء الدین احمد

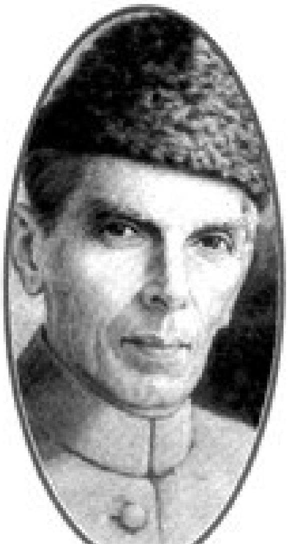

6 جنوری 1943ء کو دہلی سے اس کا جواب دیتے ہوئے "قائد" نے ایک بار پھر یہ ڈگری قبول کرنے سے انکار کیا۔ خط کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

"ڈیئر سر ضیاءالدین احمد!

آپ کے 3 دسمبر 1942ء کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ جیسا کہ آپ نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کی طرف سے مجھ سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی ہے میں نے آپ کی خواہش کے پیش نظر معاملے پر دوبارہ غور کیا ہے۔ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کونسل نے جو غیر معمولی اعزاز مجھے عطا کرنے کا ارادہ کیا ہے میں اسے قبول کرنے سے قاصر ہوں۔"

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم اعزازات کو کس قدر ناپسند کرتے تھے اور ان کا ہمیشہ سے موقف تھا کہ وہ کسی رسمی تقریب یا رسمی اعزاز کے حق میں نہیں ہیں۔ اپنی پوری زندگی میں صرف ایک خطاب "قائداعظم" ایسا ہے جسے ان کی طرف سے منع نہیں کیا گیا اور مرزا شمس الحسن کا کہنا ہے کہ یہ بات بھی تاریخی اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ شروع میں یہ خطاب مولانا مظہر الدین نے 1938ء میں اپنے سہ روزہ اخبار "الامان" دہلی میں شائع کیا جو جلد ہی مقبول ہو گیا۔ مولانا مظہر الدین بہت بے باک صحافی تھے اور انہیں بے باکی اور حق گوئی کی پاداش میں 13 مارچ 1939ء کو دہلی میں شہید کر دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

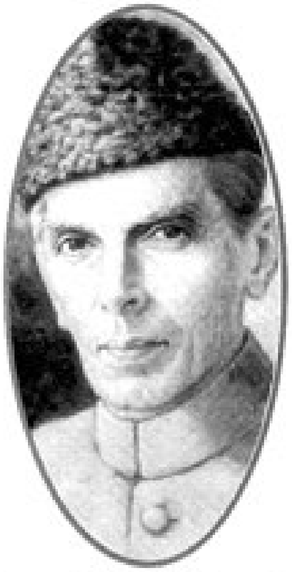

قائداعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کوئٹہ کے اجلاس کی صدارت کی۔(1943ء)

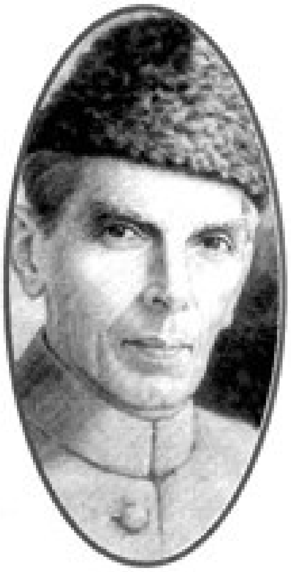

کارکنوں سے محبت

معروف قانون دان اور مسلم لیگی لیڈر حسن اے شیخ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے' وہ لکھتے ہیں۔

"عثمان بھائی' رحیم بھائی سپاہی جو بمبئی کے معمولی سے بزنس مین تھے' پرائمری مسلم لیگ وارڈ نمبر 3 بمبئی کے صدر تھے۔ قائداعظم بھی اسی پرائمری مسلم لیگ کے رکن تھے۔ 1942ء میں قائداعظم بیمار پڑ گئے۔ نواب بہادر یار جنگ ان کی عیادت کیلئے حیدر آباد سے بمبئی آئے۔ صوبائی مسلم لیگ کے دفتر سے انہوں نے ٹیلیفون پر قائداعظم سے رابطہ قائم کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ قائداعظم نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر نے انہیں دو ایک دن کیلئے ملاقات سے منع کر رکھا ہے۔ نواب صاحب کو انکار ہوا تو عثمان بھائی نے کہا نواب صاحب قائداعظم نے آپ کو تو وقت نہیں دیا' دیکھنا مجھے ملیں گے۔ میں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں اور وہ مجھے فوراً بلائیں گے۔ نواب بہادر یار جنگ ہنسنے لگے۔ عثمان بھائی نے فون ملایا اور کہا کہ عثمان بھائی رحیم بھائی سپاہی صدر پرائمری مسلم لیگ وارڈ نمبر 3 بول رہا ہوں۔ میں پرائمری مسلم لیگ کے سلسلے

میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں ضروری بات کرنی ہے"

قائداعظم نے بیماری اور ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود اپنے صدر کو وقت دیدیا۔ دراصل وہ اپنی پرائمری مسلم لیگ کے عہدیداروں کو ان کا مقام دیتے تھے۔ چنانچہ جب بھی بمبئی میں انہیں پرائمری مسلم لیگ کے جلسہ عام میں شرکت کا موقع ملتا تو وہ پرائمری مسلم لیگ کے صدر کو کرسی صدارت پر بٹھاتے۔"

جسٹس یعقوب علی خان ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

1944ء کا واقعہ ہے۔ قائداعظم ریل میں سفر کرتے ہوئے نصف شب علی گڑھ سے گزرے۔ ریلوے سٹیشن پر طلبہ کے ہجوم نے ان سے ملاقات پر اصرار کیا۔ ان کے سیکرٹری نے لاکھ منع کیا کیونکہ اس وقت قائداعظم سوئے ہوئے تھے' لیکن طلبہ نہ مانے۔ قائداعظم نے کھڑکی کھولی تو طلبہ نے کہا ہمارے لئے کوئی پیغام دیجئے۔ قائداعظم نے گرجدار آواز میں جواب دیا "جاؤ جس طرح تم نے مجھے گہری نیند سے جگایا ہے' اسی طرح قوم کو اس کی گہری نیند سے جگاؤ۔" پلیٹ فارم اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

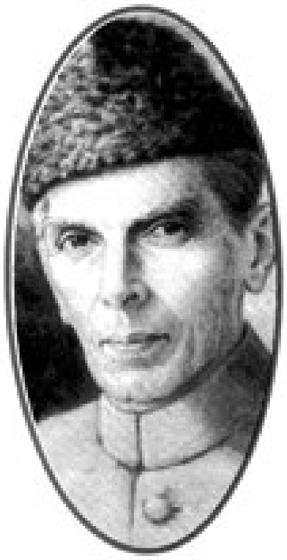

وفاقی وزیر محمود علی کہتے ہیں:

"ان دنوں آسام کی کافی زمین خالی پڑی تھی اور لوگ دوسرے علاقوں سے آکر اس زمین پر آباد ہو رہے تھے اور اسے قابل کاشت بنا رہے تھے۔ کانگریس کی حکومت تھی۔ اس نے ان نئے آباد کاروں پر بے پناہ مظالم ڈھانے شروع کر دیئے اور ایک تصوراتی لائن کھینچ کر کہا کہ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔"

بے چارے لوگوں نے محنت کی' دھان اگایا' کپاس اگائی اور ہندوؤں نے انہیں مار بھگایا۔ ہم نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور قائداعظم کے دورہ آسام کے موقع پر یہ مسئلہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں پیش کیا۔

قائداعظم نے کہا" خالی زمین پر آباد ہونا اور اسے زیر کاشت لانا ہر انسان کا حق ہے' اگر کوئی قانون اس حق کی نفی کرتا ہے تو وہ سرے سے قانون ہی نہیں۔ ایسے قانون کو ہرگز اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ انہوں نے خود ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جو مجلس عاملہ نے منظور کر لیا اور قائداعظم نے فرمایا پھیل جاؤ اور جہاں جہاں خالی زمین نظر آئے کاشت کرو۔"

ایک واقعہ حسین امام کی زبانی' وہ کہتے ہیں:

"دلی میں قائداعظم کا گھر سڑک کے عین اوپر تھا' لیکن گھر کا رخ سڑک کی دوسری جانب تھا۔ اس رخ پر گھر کے بالکل سامنے محکمہ پی ڈبلیو ڈی کے کچھ کوارٹر تھے۔ محکمہ والوں نے ان کے گھر کے سامنے بیت الخلاء بنانے شروع کر دیئے۔ قائداعظم کے دوستوں نے ان سے کہا" آپ پی ڈبلیو ڈی والوں سے بات کریں وہ کبھی آپ کی بات رد نہیں کر سکتے' لیکن قائداعظم نے کہا کہ میں ذاتی کام کیلئے کسی سرکاری محکمے کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا۔"

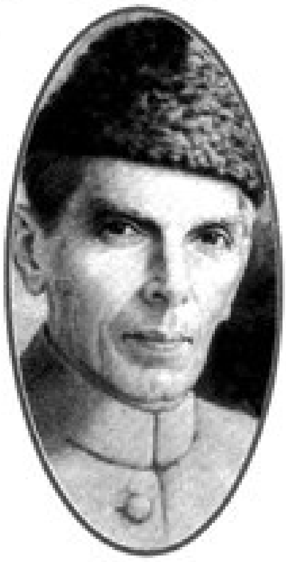

اس کے تھوڑے دن بعد ایک موقع پر قائداعظم نے اپنا دایاں ہاتھ میز پر گھماتے ہوئے کہا......

LIKE THIS TURNED MY HOUSE

(میں نے اپنے گھر کا رخ یوں بدل دیا) انہوں نے گھر کو گرا کر اس کا رخ تبدیل کر لیا' محکمے والوں سے بات نہ کی۔

☆......☆......☆

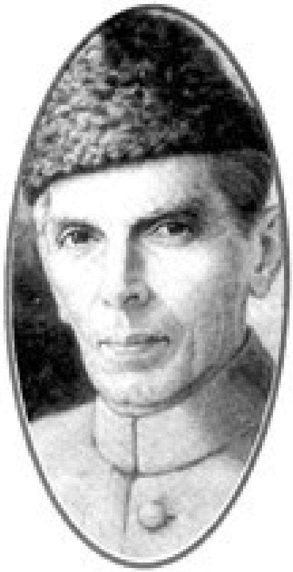

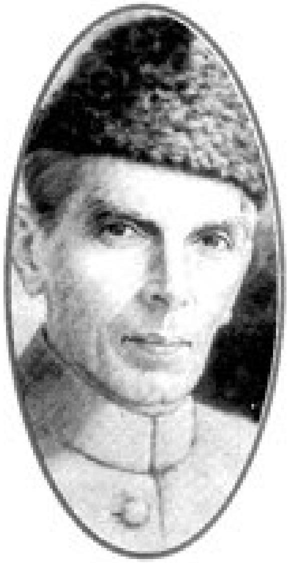

نوجوانوں کے ہیرو

قائداعظم کی زندگی سے دلچسپ واقعات۔

جسٹس شمیم حسین قادری لکھتے ہیں۔

مجھے زندگی میں کئی بار قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک چل رہی تھی اور یہاں کے حالات بڑے مخدوش تھے۔ اکثر لیڈر جیل میں تھے۔ آئے دن کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ خضر حیات کا دورِ وزارت تھا ان دنوں راجہ سید اکبر عنقریب جیل جانے والے تھے اور میں بھی ان کے بعد اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے پاس فنڈز بھی ختم ہو چکے تھے۔ کراچی میں مسلم لیگ کانفرنس ہو رہی تھی اور قائداعظم بھی اسی کانفرنس میں تھے۔ راجہ غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے چیف منسٹر تھے۔ حسین شہید سہروردی بھی بنگال سے آئے تھے جو وہاں چیف منسٹر تھے۔ یہ فیصلہ ہوا کہ ان سے پیسے مانگے جائیں۔ میرے پاس ایک خط تھا جس کے متعلق مجھے یاد نہیں کہ یہ خط بیگم شاہنواز کا تھا یا نواب ممدوٹ مرحوم کا۔ یہ خط حسین شہید سہروردی کے نام تھا۔ قائداعظم سندھ گورنمنٹ ہاؤس

یعنی موجودہ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ناشتے کی میز پر بیٹھ چکے تھے۔

جب میں ان کے پاس پہنچا انہوں نے کہا "پیسے ہمارے پاس نہیں ہیں۔ پنجاب کو اپنی لڑائی خود لڑنی چاہئے تم لوگ کوشش کرو اور ہمت سے کام لو۔" میں نے سب حالات عرض کئے۔ انہوں نے غور سے میری باتیں سنیں' پھر بڑی شفقت سے کہنے لگے۔

"اچھا تمہارے مشن کیلئے کوشش کرتے ہیں کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ پھر میری ملاقات حسین شہید سہروردی مرحوم اور راجہ غلام حسین ہدایت اللہ سے کرائی۔ ان لوگوں نے مدد کا وعدہ فرمایا۔

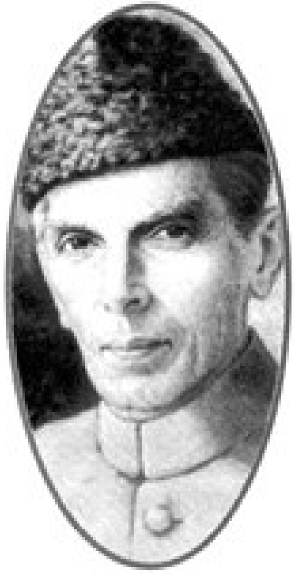

قیام پاکستان کے بعد لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں قائد اعظم سے میری دوسری ملاقات ہوئی۔ قائد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تھا۔ راجہ غضنفر علی خان مرحوم نے قائد سے میری ملاقات کرائی اور کہا کہ یہ مسلم لیگ کا بڑا سرگرم کارکن رہا ہے۔ قائد اعظم نے محبت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور فرمایا۔

WELDONE YOUNG BOY BUK UP YOUNG BOY.

(بہت خوب جوان' شاباش جوان)

وہ نوجوانوں سے مل کر اتنا خوش ہوتے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔

معروف قلمکار صادق الخیری لکھتے ہیں۔

قائد اعظم کے آٹوگراف کیلئے میرا دل مچلتا تھا مگر جب بھی خیال آتا عجب حالت ہوتی۔ ایک تو وہ بڑے آدمی تھے اور ان کی نازک مزاجی دنیا بھر میں مشہور تھی۔ قاعدہ قانون کے خلاف کوئی بات پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے ان کا ہر لمحہ اس قدر قیمتی تھا کہ محض آٹوگراف کی خاطر ان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ 1940ء میں بڑا مبارک سال آیا کہ عربک کالج دہلی میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا اور قائد اعظم وہاں تشریف لائے۔ میں تقریباً پانچ سال پہلے

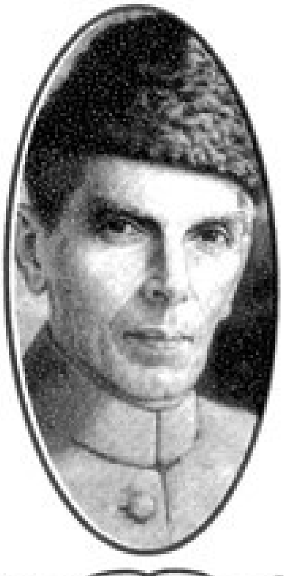

یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر رخصت ہوا تھا۔ اس لئے طالب علموں کی طرح گھس گھسا کر ان کے پاس پہنچ جانا میرے بس میں نہ تھا۔ یہ بھی اچھا نہ سمجھا کہ جب وہ اکابر کے ساتھ مصروف گفتگو ہوں تو میں دخل در معقولات کروں۔ اتنے میں مجھے اپنے بھتیجے سعدی خیری جو بعد میں ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے کا خیال آیا جو سٹوڈنٹ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے اور اس وجہ سے قائداعظم تک ان کی رسائی تھی۔

یہ میرے منشا کیخلاف تھا کہ کسی کے ذریعہ آٹوگراف حاصل کروں مگر بے حد مجبور ہو کر میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور اپنی البم انہیں تھما دی۔ سعدی دھن کے پکے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی طرح میرے مطلب کا آٹوگراف حاصل کر لیں گے۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ جب قائداعظم نے دستخط کرنا شروع کیے تو پین نے لکھنا روک دیا اور اس کی سیاہی خشک ہو گئی۔ آج بھی میں اس لمحے کا تصور کر سکتا ہوں۔ جو قلم کے یوں اٹکنے سے قائداعظم کے مزاج پر گراں گزرا ہو گا لیکن سعدی نے نہایت پھرتی سے قلم جھٹک کر سیاہی رواں کر دی اور قائداعظم نے دستخط فرما دیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پین کی رکاوٹ نے ان کی طبیعت میں ناگواری پیدا کر دی جس کی بنا پر قائداعظم نے صرف انگریزی میں دستخط کیے اور تاریخ نہ لکھی۔ قائداعظم کا آٹوگراف حاصل کر کے میں بہت خوش ہوا مگر افسوس بھی ہوا کہ انہوں نے کوئی تحریر نہ دی۔ یہ آٹوگراف قائداعظم نے جنوری 1940ء میں دیا تھا اور میرے لئے یہ بہت قیمتی ہے۔

☆......☆......☆

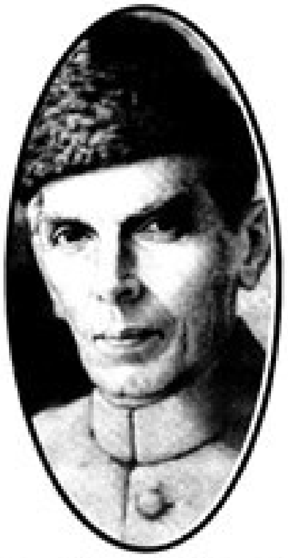

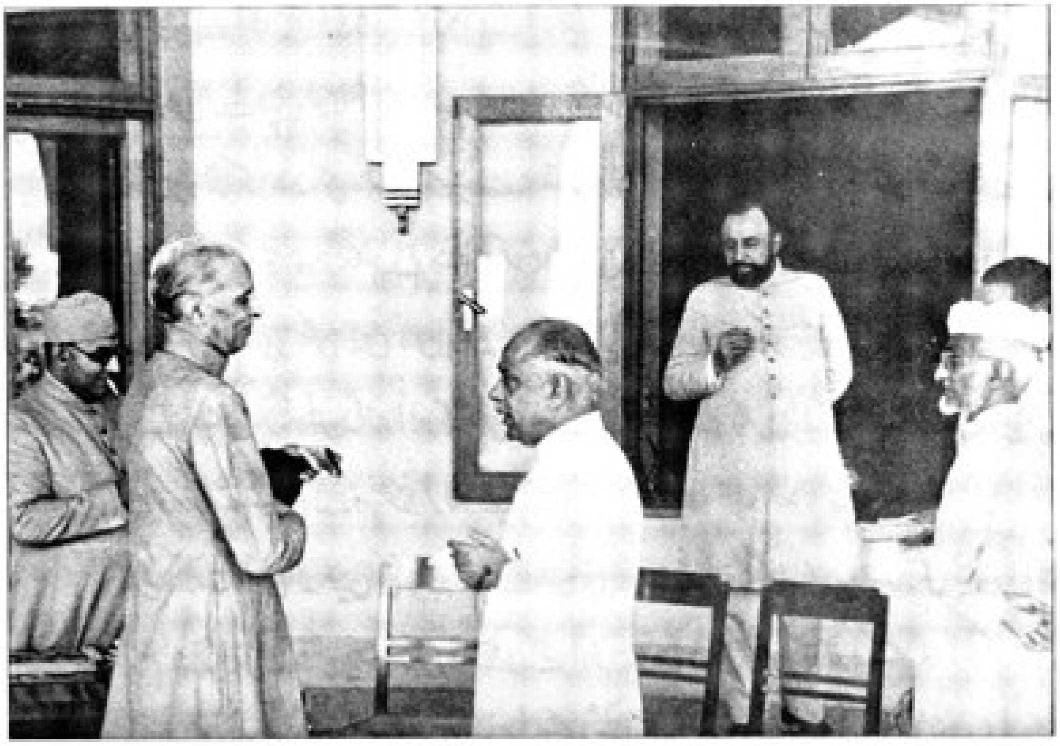

قائداعظمؒ نواب محمد اسماعیل خاں سے گفتگو کر رہے ہیں، تصویر میں نوابزادہ لیاقت علی خاں اور
حاجی عبداللہ ہارون بھی نظر آرہے ہیں۔

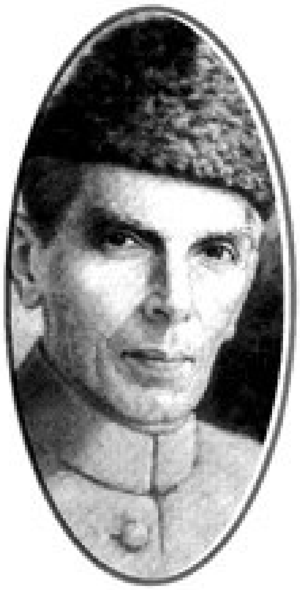

بے لوث اور بے خوف

قائداعظم کے ذاتی دوست ایم اے اصفہانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد 15 اکتوبر سے 18 اکتوبر تک لکھنؤ میں مسلم لیگ کا عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کی شان اور پر تکلف انتظامات کا سہرا راجہ صاحب محمود آباد کے سر رہا۔ راجہ صاحب نے شرکائے اجلاس کی میزبانی ایسے طریقے سے کی جسے ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے والے ابھی تک نہیں بھولے۔ محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے سر کردہ رہنماؤں کی تقاریر سننے کیلئے پچاس ہزار سے زائد افراد جمع تھے۔

جلسہ عام شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے راجہ صاحب محمود آباد' چودھری خلیق الزمان' مسٹر جناح کی عارضی قیام گاہ (محمود آباد ہاؤس قیصر باغ) پر اس دن کے پروگرام پر نظر ڈالنے کی غرض سے جمع تھے کہ نواب اسماعیل خان بھی اس دیوان خانے میں آگئے۔ اس وقت وہ ایک سیاہ سموری ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ مسٹر جناح نواب صاحب کی ٹوپی کی طرف متوجہ

ہوئے اور کہا کیا آپ یہ ٹوپی تھوڑی دیر کیلئے مجھے دے سکتے ہیں؟"

نواب اسماعیل خان نے اپنی روایتی خوش خلقی کے تحت ٹوپی جناح صاحب کو دیدی اور درخواست کی کہ آپ اسے اوڑھے رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ مسٹر جناح نے ٹوپی اوڑھ لی اور انہوں نے دیکھا کہ ہم سب اس کی تعریف کر رہے ہیں' تو وہ اٹھ کر ملحقہ خواب گاہ میں چلے گئے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہماری رائے کا محاسبہ کرنے لگے۔ ہم میں سے کسی نے پھر کہا کہ قائداعظم یہ ٹوپی اوڑھے رہیں اور اسی طرح اجلاس میں شریک ہوں۔ انہوں نے یہ تجویز مان لی۔

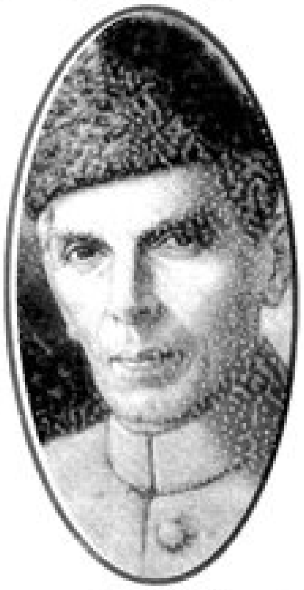

ہم سب مسٹر جناح کے ساتھ پنڈال میں داخل ہوئے تو لوگوں نے زوردار تالیوں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے قائداعظم کو خوش آمدید کہا۔ ڈائس' کرسیوں اور دریوں پر جتنے لوگ بیٹھے تھے وہ سب آہستہ یا بلند آواز میں اس ٹوپی اور شیروانی کی تعریف کرنے لگے جو مسٹر جناح اس تقریب میں پہلی مرتبہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ مسٹر جناح اتنے خوش تھے جتنے کہ وہاں پر موجود سب لوگ۔ لکھنؤ کے اجلاس کے بعد شہر کے بہت سے نوجوانوں اور معمر افراد نے یہ ٹوپی اوڑھنا شروع کر دی جو قائداعظم کی بدولت' راتوں رات مقبول ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بہت قلیل مدت میں یہ ٹوپی اپنا لی' چنانچہ ملک بھر کے مسلمانوں میں بھی یہ ٹوپی اتنی ہی پسند کی جانے لگی اور اسے جناح کیپ کہا جانے لگا۔

قائد پر اپنی کتاب میں ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں:

"انسانیت کی خدمت کا جذبہ قائد میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی صحت کی پروا کئے بغیر کام کام اور بس کام کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ ایک رات تقریباً دو بجے محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی سے کہا کہ سو جایئے' بہت رات گزر گئی ہے۔

آپ نے فرمایا جب قوم سو رہی ہو تو کوئی تو جاگنے والا بھی ہو۔"

آپ نے بے لوث ' بے خوف اور جذبہ ایمانی سے بھرپور قیادت کا مظاہرہ کیا۔ فرہاد کو شیریں سے 'مجنوں کو لیلیٰ سے رانجھا کو ہیر سے اتنا پیار نہیں ہو گا' جتنی محبت حضرت قائداعظم کو برصغیر کے مسلمانوں سے تھی۔ کیونکہ آپ کا جاگنا' آپ کا سونا اور آپ کا کام کرنا سب کچھ لوگوں کیلئے تھا۔

کراچی کے حاجی عبداللہ ہارون 'معروف سیاستدان یوسف ہارون اور محمود ہارون کے والد اور قائد کے ذاتی دوستوں میں سے تھے 'ان کی بیگم نصرت عبداللہ ہارون کہتی ہیں۔

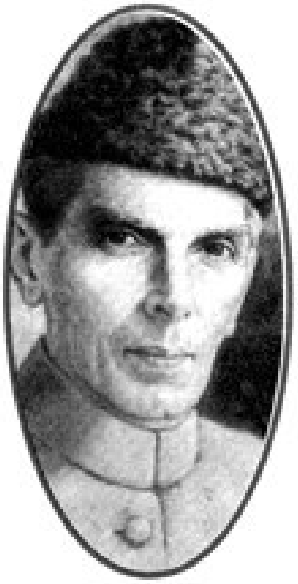

قائداعظم جب بھی بمبئی سے آتے ہمارے پاس ٹھہرتے اور فرصت کے اوقات میں اپنے اس دور کے واقعات سناتے جب وہ انگلستان میں تھے۔ انہوں نے ہمیں یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کرسمس کے موقع پر طلبہ وطالبات میں ایک کھیل کھیلا جارہا تھا جس میں جیتنے والے لڑکے یا لڑکی کو دوسرے ساتھیوں کی ایک فرمائش پوری کرنا ہوتی تھی۔ قائداعظم جیت گئے تو ساتھیوں نے فرمائش کی کہ آپ فلاں لڑکی کا ہاتھ تھام کر رقص کریں 'مگر قائداعظم نے اس کے جواب میں یہ کہہ کر انکار کر دیا میں اپنی ہونے والی بیوی کے سوا کسی اور لڑکی کا ہاتھ نہیں تھاموں گا۔"

وہ زندگی بھر اس اصول پر عمل پیرا رہے۔

☆......☆......☆

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین کا گروپ فوٹو۔1944ء

(کرسیوں پر دائیں سے بائیں) عبدالحمید' صبیح الدین طور' ڈاکٹر ضیاء الاسلام' قائداعظم' میاں محمد شفیع' قاسم رضوی' آفتاب قرشی

(کھڑے ہوئے) محمد الیاس' سید احمد سعید کرمانی' مولا بخش منہاس' خواجہ محمد اشرف' ریاض پراچہ' اور نگزیب خان

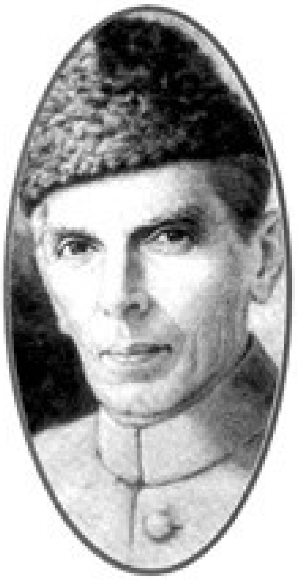

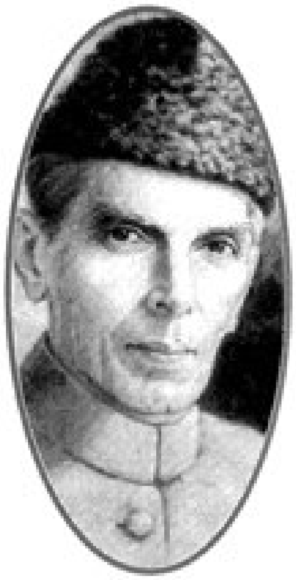

ایک خدا، ایک قرآن، ایک رسولؐ

قائداعظم کے فرمودات کے عنوان سے آیئے ہم چند تقریروں کے نمونے دیکھیں:

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس 2مارچ 1941ء میں انہوں نے کہا:

"جو لوگ طاقتور اور مضبوط ہوں اور جنہوں نے خود پر اعتماد کرنا سیکھ لیا ہو، انہیں فالتو قسم کی دھمکیاں اور غیر ضروری جوشیلی زبان استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہندوستان کے انتہائی پیچیدہ مسئلے کا واحد اور بہترین حل قیامِ پاکستان ہے۔"

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن 2مارچ 1941ء کو کہا:

"ہم اقلیت نہیں ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو رہنے کیلئے ایک علاقہ چاہئے۔ محض یہ کہنے کا فائدہ ہی کیا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں۔ قوم ہوا میں نہیں رہ سکتی۔ وہ زمین پر رہتی ہے اور اس زمین پر اس کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ قوم کو مخصوص علاقے میں آزاد مملکت چاہئے اور آپ یہی تو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 2نومبر 1941ء قائد نے کہا:

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال سے ہندوؤں نے ملک کے کسی قابل ذکر حصے پر حکومت نہیں کی۔ تجویز کی رو سے 3 چوتھائی ہندوستان ہندوؤں کو دیا جا رہا ہے۔ جہاں وہ اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ حریص نہ بنیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیرا پھیری سے سارے ملک کو ہتھیا لینا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں تم تین چوتھائی لے لو اور ہماری ایک چوتھائی پر حسد نہ کرو۔ ہمیں اسلامی تاریخ کی روشنی میں اپنی روایات، اپنی ثقافت اور اپنی زبان کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے دو اور تم بھی اپنے صوبوں میں ایسا ہی کرو۔"

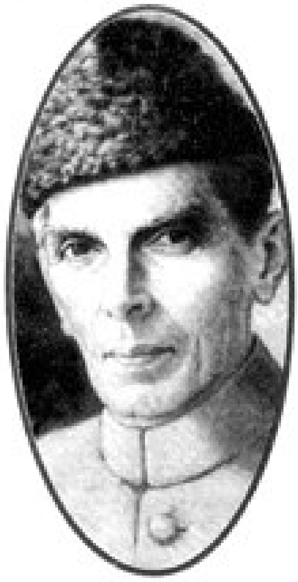

اجلاس مسلم لیگ، کراچی 1934ء اس تقریب میں آپ نے فرمایا:

"وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہو گئے۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ ایک کتاب، ایک امت، یہی ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہئے۔"

جلسہ عام، دہلی 6 نومبر 1946ء میں قائد نے کہا:

"ہمیں پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے۔ کیا آپ نے اپنے گھر کی حالت درست کر لی ہے؟ میں جہاں جاتا ہوں، یہی سنتا ہوں: "اے قائداعظم" ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ "میں کہتا ہوں قائداعظم ہرگز ہرگز حکم دینے کیلئے تیار نہیں، جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ مسلمانوں کا جو خون بہے گا وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ اگر میں یہ یقین کیے بغیر مسلمانوں کو حکم دے دوں تو میں آپ کے لشکر کا جنرل نہیں ہوں گا بلکہ مجرم ہوں گا۔"

مسلمانوں سے پرامن رہنے کی اپیل کرتے ہوئے 11 نومبر 1946ء، قائد نے کہا:

”ہمیں بتادینا چاہئے کہ ہم اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے والے بہادر، ایماندار اور سچے مسلمان ہیں۔ پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان ومال اور عزت کی حفاظت خود مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو ظلم توڑے گئے ہیں جو بے گناہ مسلمان شہید کیے گئے ہیں یا زخمی ہوگئے ہیں یا جن کا مال واسباب لوٹا گیا ہے، ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگ آزادی اور پاکستان کیلئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔“

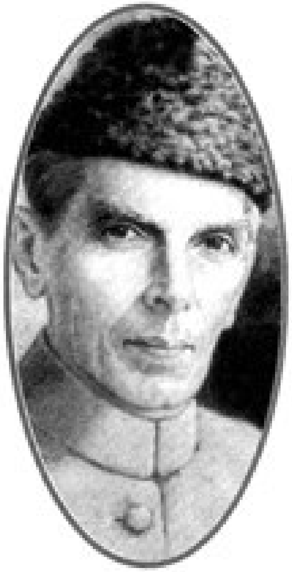

☆......☆......☆

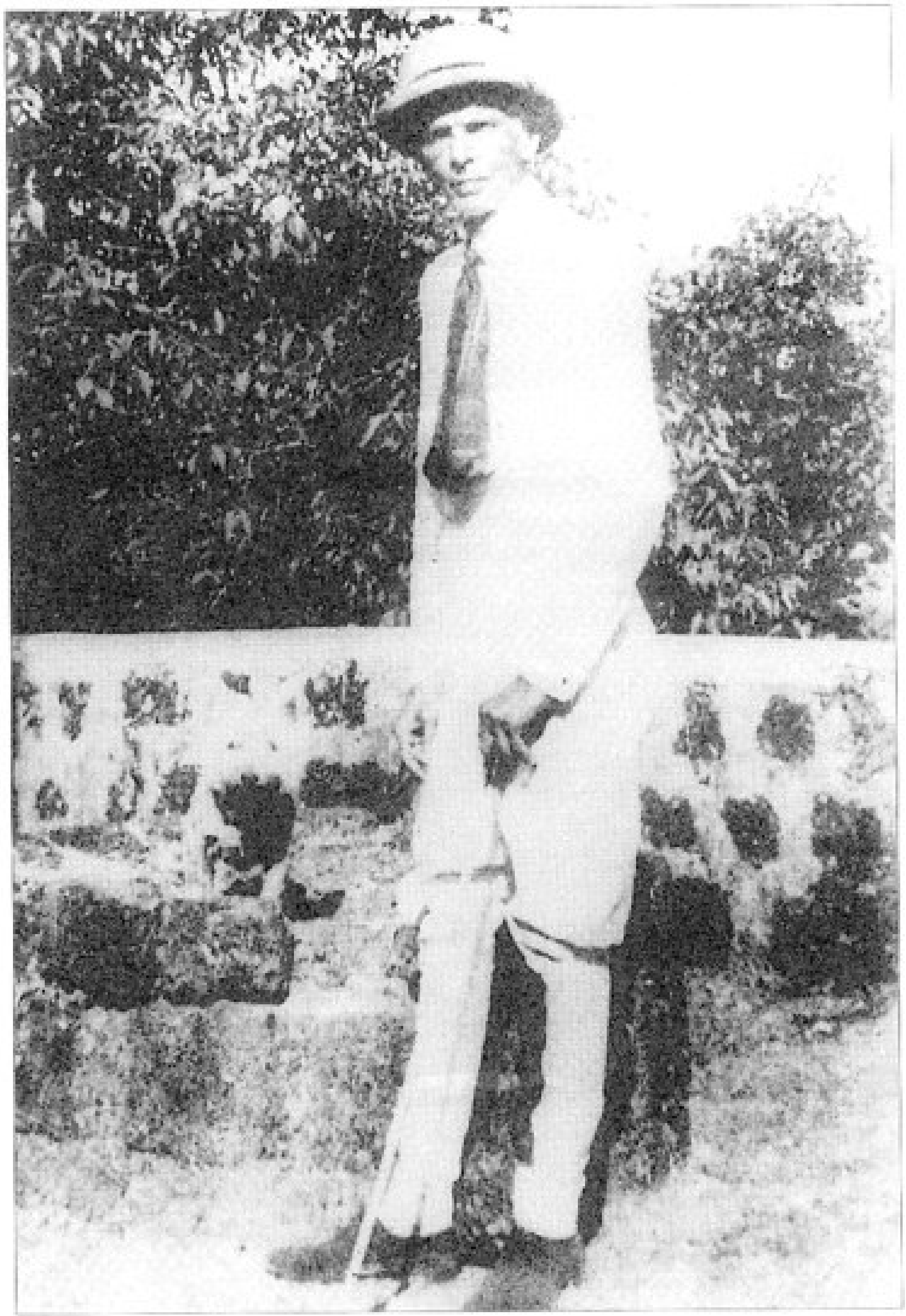

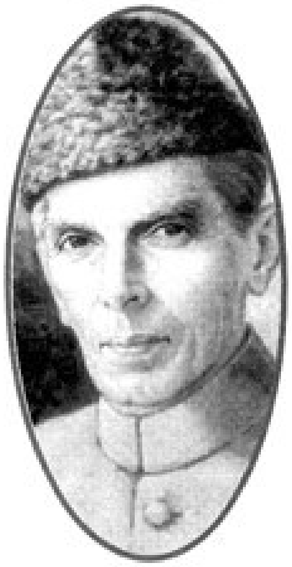

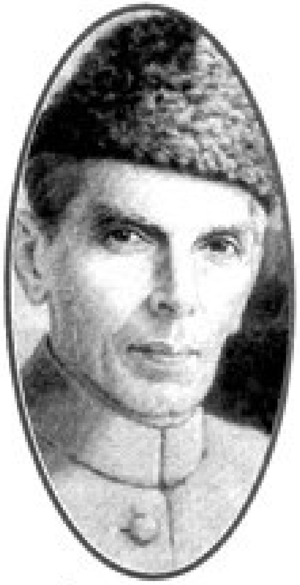

ہندو الگ، مسلم الگ

ہم قائداعظم کے فرمودات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ چند اور فرمودات ملاحظہ کیجئے:
اجلاس مسلم لیگ لاہور 23 مارچ 1940ء میں تقریر کرتے ہوئے حضرت قائداعظم نے کہا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ در حقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب وخیال ہی کہنا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، نہ ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی نہ صرف ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کیلئے مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے

تاریخی ماخذ مختلف ہیں۔ ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے سرکردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا رہنما دوسری قوم کی بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔

ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بننے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائیگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہو اور دوسری کو اکثریت حاصل ہو۔ ایسی ریاست کے آئین کا عمل خاک میں مل کر رہے گا۔“

23 مارچ 1940ء ہی کو قومیت کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

”قومیت کی تعریف چاہے جس طرح کی جائے، مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس لیے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خود مختار ریاست ہو اور اسے کامیاب بنایا جائے۔“

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 10 مارچ 1941ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا:

”مسلم اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمان خوددار اور بلند حوصلہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں رہنے والے بھائیوں کی نجات و آزادی کی خاطر ہم ہر قسم کے ایثار و قربانی کیلئے تیار ہیں۔ اپنے بھائیوں کے راستے میں مزاحم ہونے اور انہیں ایک متحدہ ہندوستان میں گھسیٹنے سے ہم کسی طرح اپنی حالت بہتر نہیں بنا سکتے بلکہ الٹا ہم ان کی حیثیت کو بھی گھٹا کر ایک اقلیت بنا دیں گے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے ہم اپنے بھائیوں کو ہندو اکثریت کا حلقہ بگوش نہیں بننے دیں گے۔“

نومبر 1940ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن دہلی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

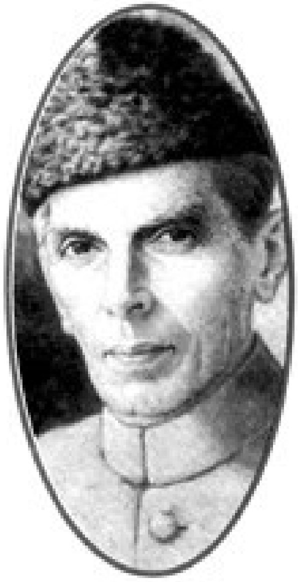

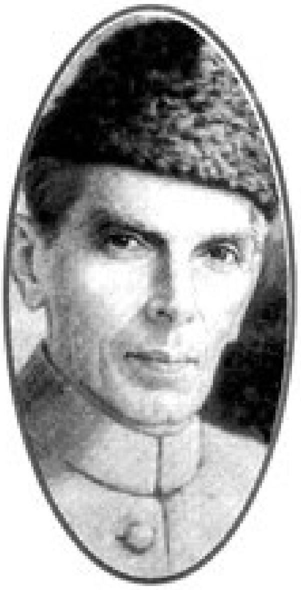

”ہندوؤں کو چاہئے کہ ہندو راج کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ اور ہندوستان کو مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں تقسیم کرنے پر راضی ہو جائیں۔“

ایم ایس ایف کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے ہوئے قائداعظم نے ایک اور بات کہی، انہوں نے فرمایا:

”کسی قوم کو ایک مملکت کا حکمران اور ملک چلانے کے قابل بنانے کیلئے کم از کم تین بڑے ستونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا ستون تعلیم، تعلیم کے بغیر آپ بالکل ویسی ہی حالت میں ہونگے جیسی کہ رات کے وقت اس پنڈال کے اندھیرے میں تھی۔ تعلیم کے ساتھ آپ اس حالت میں ہونگے جیسے کہ اب دن کے اس چکا چوند اُجالے میں ہیں۔ دوسرے کوئی قوم، کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی جب تک وہ کاروبار، تجارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں معاشی طور پر مستحکم نہ ہو اور تیسرے جب آپ تعلیم کے ذریعے علم کی روشنی حاصل کر لیں اور جب آپ معاشی، تجارتی اور صنعتی اعتبار سے خود کو مضبوط اور مستحکم کر لیں تو آپ کو اپنے دفاع کیلئے تیار ہونا چاہئے، یعنی بیرونی جارحیت سے بچاؤ اور اندرونی امن وامان برقرار رکھنے کیلئے کوشش۔“

☆......☆......☆

قائداعظمؒ کراچی کے استقبالیے میں سپاسنامے کا جواب دے رہے ہیں۔

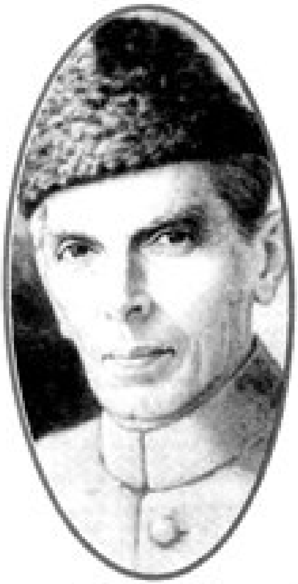

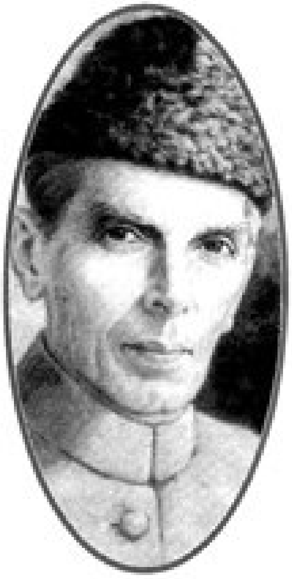

اپنا کام کریں اور بس!

قائداعظم کے فرمودات پیش خدمت ہیں۔ ان فرمودات کی روشنی میں ہم پاکستان کو مضبوط اور سربلند بنا سکتے ہیں۔

جلسۂ عام لاہور 30 اکتوبر 1947ء آپ نے فرمایا۔

"تاریخ میں ایسی نئی اقوام کی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے محض قوت ارادی اور بلند کرداری سے خود کو بنایا اور عظیم کیا۔ آپ کا خمیر فولاد کی قوتوں سے اٹھا ہے۔ آپ ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بلند کردار، بلند حوصلہ، شجاع اور اولوالعزم ہستیوں سے بھری پڑی ہے اپنی روایات کی رسی مضبوطی سے تھام لیجئے اور اپنی تاریخ میں شان و شوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔"

افسران حکومت سے سبی میں خطاب 14 فروری 1948ء:

"ایمانداری اور خلوص دل سے کام کیجئے۔ کام اور زیادہ کام آپ کے ضمیر سے بڑی کوئی قوت روئے زمین پر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ خدا کے روبرو پیش ہوں تو پورے اعتماد

سے کہہ سکیں کہ میں نے اپنا فرض انتہائی ایمانداری' وفاداری اور صمیم قلب سے انجام دیا تھا۔''

نشری بیان ڈھاکہ 21مارچ1948ء آپ نے فرمایا:

پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی نئی مملکت کو اتنے سنگین اور گمبھیر مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو ہمیں درپیش ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی نئی مملکت نے ان مسائل کا مقابلہ کرنے میں اتنی پامردی اور عزم واستقلال کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا مظاہرہ ہم نے کیا ہے۔ ہمارے دشمنوں کو امید تھی کہ پاکستان اپنی ولادت کے ساتھ ہی ختم ہو جائیگا۔ ان کی امیدوں کے برعکس پاکستان ان مسائل کے ہجوم سے مردانہ وار کامیاب وکامران نکلا اور اس شان سے کہ پہلے سے بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ پاکستان قائم رہنے کیلئے بنا ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور اپنا عظیم کردار ادا کرتا رہے گا۔ جو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔''

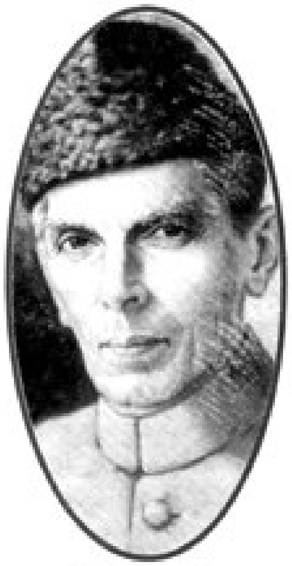

ڈھاکہ یونیورسٹی 26مارچ1948ء میں قائداعظم نے طلبہ سے کہا:

''آزادی کا مطلب بے لگام ہو جانا نہیں آزادی سے آپ پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آپ ایک منظم ومنضبط قوم کی طرح کام کریں۔''

26مارچ1948ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے قائد نے کہا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا تھا، اس کی خاطر اس لیے جدوجہد کی تھی اور اسے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے میں جسمانی اور روحانی طور پر قطعاً آزاد ہوں۔ اخوت، مساوات اور رواداری، یہ ہیں ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نکات۔ ہم نے ان عظیم تصورات کیلئے جدوجہد کی۔ اسی لیے پاکستان اور اس کی جدوجہد کی کہانی عظیم انسانی خیالات وتصورات کو عملی جامہ پہنانے کی داستان ہے۔''

اسی جلسۂ عام میں آگے چل کر کہا:

''اسلامی اقدار کو اپنانا ترقی کی معراج پر پہنچنے کیلئے ناگزیر ہے۔ یہ ایک طرف قیام

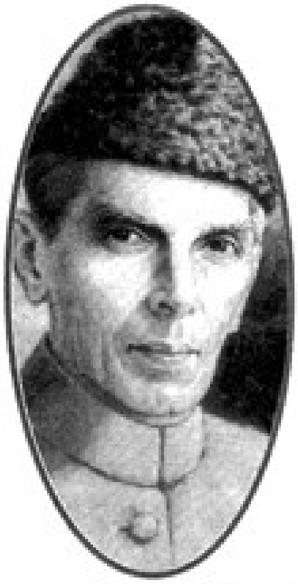

پاکستان کا جواز ہیں اور دوسری طرف ایک مثالی معاشرے کی تخلیق کی ذمہ دار ہیں۔ آج جبکہ ہماری اجتماعی روح اونچ نیچ کی تمام زنجیروں کو توڑ چکی ہے، ہمیں چاہئے کہ آگے بڑھیں اور نہ صرف اپنی ریاست بلکہ اپنی قوم کے ہر شعبے اور ہر پہلو کو روشن کردیں۔"

جلسۂ عام ڈھاکہ 28مارچ 1948ء کے یہ الفاظ بھی سن لیں:

"پاکستان کے سامنے بڑا شاندار مستقبل ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ قدرت نے ہمیں جن فیاضیوں سے نوازا ہے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ایک مضبوط و شاندار پاکستان کی تعمیر کریں۔

☆......☆......☆

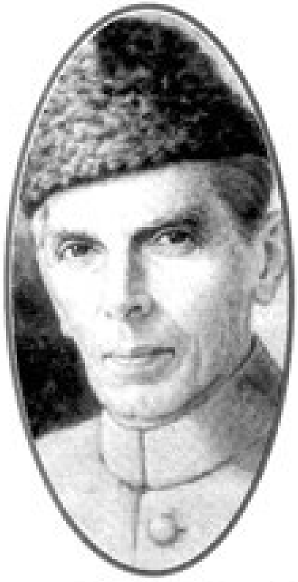

خیبر ایجنسی میں قبائلی رہنما اپنی روایت کے مطابق قائداعظمؒ کو روٹی کا ٹکڑا پیش کر رہے ہیں۔

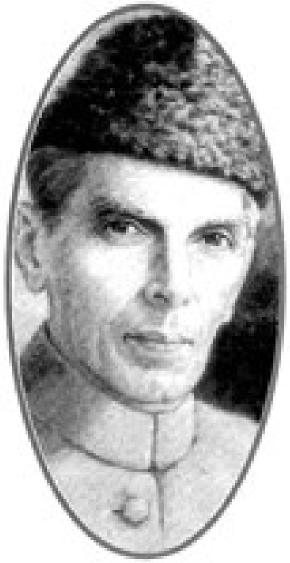

کے ایچ خورشید کی یادداشتیں

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری، آزاد کشمیر کے سابق صدر اور جموں و کشمیر لبریشن لیگ کے سربراہ مرحوم کے ایچ خورشید کی ایک کتاب حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے، جس کا نام ہے "کشمیر، قائداعظم اور کے ایچ خورشید"...... آیئے اس کتاب سے چند اقتباسات دیکھیں، جن سے قائد کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں کہ میں نے قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں تو پوری دنیا جنگ عظیم کی وجہ سے ایک انقلاب انگیز دور سے گزر رہی تھی۔ برصغیر میں تحریک آزادی زوروں پر تھی اور تحریک پاکستان بھی جو تحریک آزادی ہند کا حصہ تھی اور قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ ڈرائنگ روم اور اندرون خانہ سیاست سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی تھی۔

جناب خورشید کہتے ہیں:

"قائداعظم کی کشمیر آمد سے چند ہفتے قبل پنجاب میں ملک خضر حیات خان ٹوانہ کی مسلم

لیگ کی رکنیت ختم کردی گئی تھی۔ میں نے اور میرے کچھ کشمیری رفقاء نے مسلم سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی تھی' جو برصغیر میں انگریزی سامراج کیخلاف اور قیام پاکستان کی حمایت میں سرگرم عمل تھی۔ میں بنیادی طور پر ایک صحافی ہوں اس لیے ان دنوں بھی صحافی کے طور پر ہی کام کررہا تھا۔ چنانچہ ایک صحافی اور سٹوڈنٹس یونین کے عہدیدار کی حیثیت سے میری قائداعظم سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ کشمیر میں قائداعظم کا یہ طویل قیام تھا۔ڈاکٹروں نے خرابی صحت کی بنا پر انہیں آرام کرنے اور تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا تھا' چنانچہ وہ اڑھائی ماہ کشمیر میں رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ غالباً 25 جون 1944ء کو حیدر آباد میں نواب بہادر یار جنگ کا انتقال ہوا۔ان کے انتقال کی خبر دوسرے روز آل انڈیا ریڈیو نے اپنے ہندوستانی بلیٹن میں دی۔ میں یہ خبر لے کر قائد کا تعزیتی پیغام لینے کیلئے ان کے پاس گیا۔"

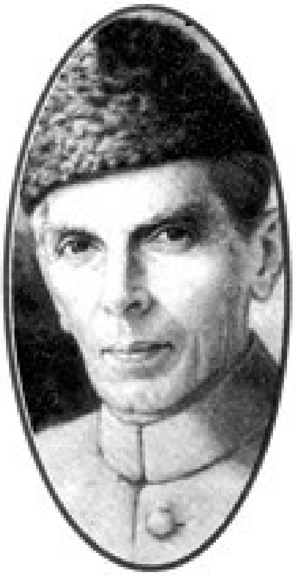

جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں:"ان دنوں قائداعظم کے معمولات عام زندگی کی مصروفیات سے ہٹ کر تھے' عموماً ناشتہ کے بعد وہ اپنی ڈاک دیکھتے' اخبارات کا مطالعہ کرتے اور ضروری خطوط کے جواب لکھواتے تھے۔ صبح کے وقت چہل قدمی کرتے یا پھر کشتی کے ذریعے دریا کی سیر کرتے۔ کبھی کبھی سہ پہر کو دریا کے کنارے پر بند کی سیر کرتے ہوئے بھی نظر آتے تھے۔ کشمیر میں قیام کے دوران پہلے وہ نشاط باغ کے قریب سر مراتب علی کی کوٹھی میں مقیم رہے' بعد ازاں وہ ایک ہاؤس بوٹ میں منتقل ہوگئے۔"

پرائیویٹ سیکرٹری منتخب کیے جانے کے بارے میں کے ایچ خورشید مرحوم کہتے ہیں:

"یہ 1944ء کا ذکر ہے' پریس کے نمائندے کی حیثیت سے قائداعظم سے اس تمام عرصے میں میری بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ تو مسلم سٹوڈنٹس یونین کی وساطت سے اور کچھ اورینٹ پریس آف انڈیا کے نمائندے کی حیثیت سے' جو مسلمانوں کی واحد نیوز ایجنسی تھی۔ سرینگر میں اس کے نمائندے اسماعیل ساغر تھے جو بہت پرجوش کارکن تھے اور پیشے کے

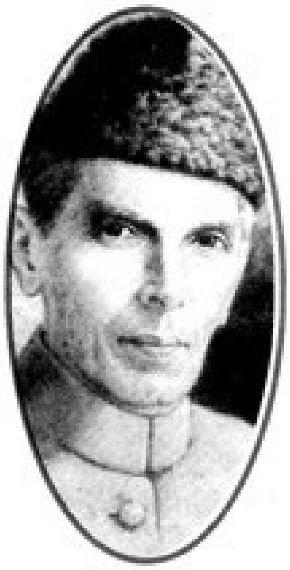

اعتبار سے دکاندار، مگر مسئلہ یہ تھا کہ انہیں انگریزی نہیں آتی تھی۔ اورینٹ پریس آف انڈیا والے معاوضہ نہیں دیتے تھے، اس لیے انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اس کام میں دلچسپی بھی نہ رکھتے تھے۔ اسماعیل ساغر نے مجھ سے کہا قائداعظم بیانات انگریزی میں دیتے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ سرینگر میں ہیں تم اورینٹ پریس آف انڈیا کی نمائندگی کرو۔ میں نے حامی بھرلی اور پریس کے نمائندے کی حیثیت سے قائداعظم کو وقتاً فوقتاً ملتا رہا۔“

”ان دنوں قائداعظم کے پاس جو سیکرٹری تھا اس کا نام مسٹر لوبو تھا۔ وہ بمبئی کا عیسائی تھا، جسے کشمیری تو ایک طرف رہی، اردو تک نہ آتی تھی۔ وہ محض ملازم تھا، قومی خدمت اس کے پیش نظر نہ تھی۔ اس لیے وہ جانفشانی سے کام بھی نہ کر سکتا تھا، جس جانفشانی سے ہم رضاکار کرتے تھے۔ قائداعظم کو بعض خطوط اردو میں لکھوانا ہوتے تو مجھے بلوا لیتے۔ بعدازاں حکم ہوا کہ روزانہ آجایا کرو، میں روزانہ جانے لگا۔ اس دورے میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

یکم جولائی 1944ء کے لگ بھگ ایک روز فرمانے لگے کہ خورشید تم میرے پاس آجاؤ اور میرے ساتھ کام کرو۔ میں نے عرض کیا: جناب ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور بی اے کا امتحان دینا ہے، والدین سے مشورہ کرنے کے بعد کل سوچ کر جواب دوں گا۔

چند روز اسی ادھیڑ بُن میں گزرے، پھر جی میں آئی کہ تعلیم تو پھر بھی حاصل کی جاسکتی ہے، مگر مسلمانوں کے اس عظیم قائد کی صحبت شاید پھر میسر نہ آئے اور مسلم لیگ کیلئے کام کرنے کا موقع پھر نہ مل سکے، لہٰذا حامی بھرلی۔ پہلے مجھے مسٹر لوبو کے ساتھ اسسٹنٹ بنایا گیا اور کچھ عرصے میں سارا کام سمجھ لیا تو قائداعظم نے مجھے اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس عہدے پر میں اصولی طور پر ان کی وفات تک فائز رہا۔“

☆......☆......☆

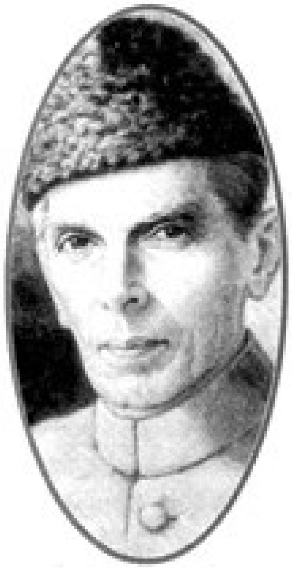

قائداعظمؒ جالندھر ریلوے سٹیشن پر جہاں آپ مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس میں
شرکت کے لیے تشریف لائے۔

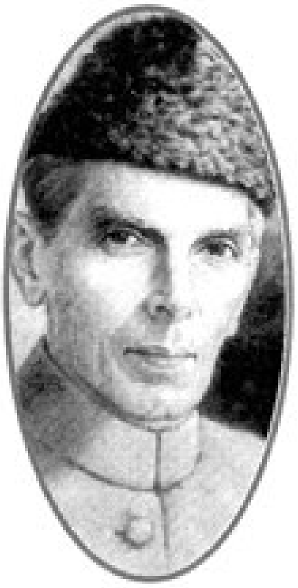

فرقہ پرستی کے خلاف

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب سے کچھ مزید اقتباسات ملاحظہ ہوں: "قائد کی مسلم لیگ پر بعض حلقوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی لیڈرشپ بڑے زمینداروں اور امیروں کے ہاتھ میں تھی اور وہی لوگ پاکستان کے قیام کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس لئے وہ نہ صرف عوام سے الگ تھلگ رہے بلکہ ان کے مسائل کو بھی نہ سمجھ سکے۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے' تاہم اس سوال کے جواب کیلئے آپ کو اسی ماحول میں جانا ہوگا' جس میں قائداعظم نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے پاکستان کا مطالبہ کیا۔"

"مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں کم تھی' پھر مسلمانوں کی اکثریت بھی یا تو سرکاری تھی یا فوج یا پولیس میں کام کر رہی تھی کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ہی ملازمتوں کا حصول تھا۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سیاسی شعور نسبتاً پڑھے لکھے لوگوں ہی میں مل سکتا ہے اور کسی تحریک کو چلانے کیلئے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت

ہوتی ہے۔ لے دے کر چار ہی طبقے ایسے رہ جاتے تھے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی پابندی سے آزاد تھے۔"

طلبہ، وکیل، صنعتکار اور زمیندار۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک بنیادی حقیقت ہے کہ سیاسی کاموں کیلئے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان تھوڑا بہت فارغ البال بھی ہو۔ جو انسان صبح سے شام تک محنت کرنے کے بعد بمشکل اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتا ہو وہ کیونکر سیاسی عمل میں حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ قائداعظم بھی انہی چار طبقوں میں اپنے ساتھی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کھل کر آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔

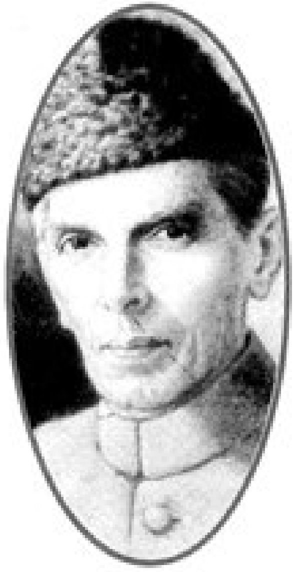

جناب خورشید لکھتے ہیں:

"ان میں سے بھی آپ زیادہ سے زیادہ دو طبقوں کو ہی دولت مند قرار دے سکتے ہیں، یعنی زمینداروں اور صنعتکاروں کو۔ صنعت کار کا مفاد چونکہ حکومت وقت کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ کسی بھی حکومت کیخلاف تحریک میں کم ہی حصہ لیتے ہیں، زمیندار البتہ اس قید سے آزاد ہوتے ہیں، اس کے علاوہ قائداعظم نے کبھی دولت مندوں کو اپنے گرد جمع نہیں کیا۔ اصفہانی کلکتہ کے تاجر تھے تو چودھری خلیق الزمان وکیل، سردار نشتر بھی درمیانے درجے کے وکیل تھے اور قاضی عیسیٰ کا شمار متوسط طبقے سے ہوتا تھا۔ پنجاب میں ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی بھی کچھ لکھ پتی نہ تھے، بعض بڑے زمیندار ضرور مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن کسی شخص کو محض اس بنیاد پر تحریک میں شامل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ دولت مند ہے یا بڑا جاگیردار ہے، جو شخص بھی اس تحریک کے بنیادی مقاصد سے متفق تھا اس میں شامل ہو سکتا تھا۔"

جناب خورشید کہتے ہیں: "قائداعظم کی زبردست خواہش تھی کہ وہ ایک سیکرٹریٹ بنائیں، جس میں پڑھے لکھے اور مستعد نوجوانوں کی ایک کھیپ رکھی جائے۔ سیکرٹریٹ قیام

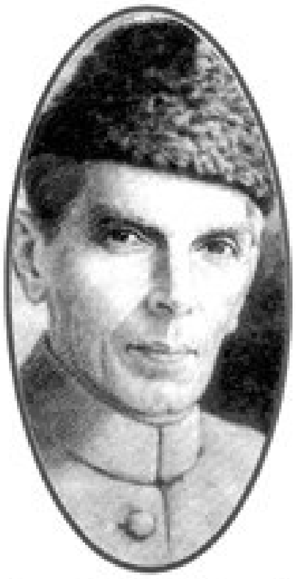

پاکستان کیلئے کی جانے والی جدوجہد کا مکمل ریکارڈ رکھے اور ان سوالات کا جو مختلف حلقوں سے تحریک پاکستان پر کئے جا رہے تھے، علمی انداز میں جواب دے۔ کئی بار انہوں نے مجھ سے اس کا خاکہ تیار کرنے کو کہا، مگر حالت یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے پاکستان کے قیام تک وہ اس قدر مصروف رہے کہ مجھ سے اس چھوٹے سے منصوبے کی جزئیات بھی نہ طے کر سکے، چنانچہ یہ کام نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں اگر یہ کام ہو جاتا تو آگے چل کر نوزائیدہ مملکت کیلئے بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔"

جناب خورشید قائد کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"قائداعظم کے مذہبی نظریات کے بارے میں ایک بات واضح ہے وہ ایک سیدھے سادے مسلمان تھے اور فرقہ پرستی میں الجھنا پسند نہ کرتے تھے۔ پاکستان کے آئین کے بارے میں انہوں نے دورہ مصر کے دوران میں شیپرڈ ہوٹل میں ایک اخباری نمائندے کے سوال کے جواب میں جو بیان دیا وہ اس پر ہمیشہ کاربند رہے۔" انہوں نے کہا تھا:

"آئین کے ضمن میں ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہمارے لئے آئین تیرہ سو برس پہلے ہی بنا دیا گیا تھا۔"

جناب کے ایچ خورشید نے ایک بہت اہم مسئلے کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یہ بحث کہ قائد کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے اور مملکت میں مذہب کی کتنی اہمیت کو درست سمجھتے تھے۔ جناب خورشید کا کہنا ہے کہ:

"پاکستان جس نظریے کی بنیاد پر بنا تھا اسے مدنظر رکھیں تو اسے دنیا بھر کے مسلمانوں کی آزادی پسند تحریکوں کا مرکز تو ہونا ہی چاہئے تھا، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ جو ملک حق خودارادیت کی بنیاد پر قائم ہوا ہو، اسے غیر مسلم دنیا میں بھی ان ریاستوں اور قوموں کی مدد کرنا چاہئے تھی جو آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے نیشنلزم کا تصور یہ تھا

کہ کوئی قوم رنگ، نسل، زبان، شکل و شباہت کے اعتبار سے ایک وحدت میں ہو، لیکن پاکستان کا قیام اس بات کا ثبوت ہے کہ نیشنلزم کے معنی یہ نہیں اور نیشنلزم جغرافیائی حدود کے بجائے نظریاتی حدود کے تابع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر واہگہ کے بارڈر کے پار رہنے والے رنگ، زبان اور شکل میں ہم سے مختلف نہیں، لیکن نظریئے میں اختلاف کے سبب ہم اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم سمجھتے ہیں اور وہ دوسری قوم۔ یہی وہ نظریاتی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے، جو لوگ مختلف وقتوں میں بھارت سے فیڈریشن کی باتیں کرتے رہے ہیں وہ دراصل ان سرحدوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے اور ان کے ذہنوں میں نیشنلزم کا وہی پرانا تصور ہے جس کی بنیاد جغرافیائی سرحدوں پر ہوتی تھی۔"

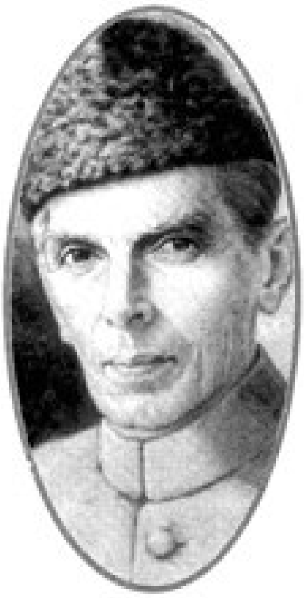

☆......☆......☆

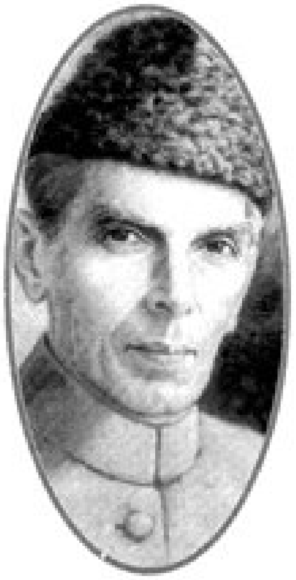

پاکستان...... مذہبی رواداری کی ضرورت

ہم بانیٔ پاکستان کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید کی کتاب کے حوالے سے قائد کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے۔ جناب خورشید مذہبی رواداری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی سے مسلم لیگ کے بعض رہنماؤں اور پاکستان کے سرکاری عہدیداروں نے ایسی باتیں کہنا شروع کر دی تھیں جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ تقسیم صرف مذہب کی بنا پر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک تو قائداعظم نے بعض تقریریں ایسی کیں جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ پاکستان کوئی متعصب مذہبی سٹیٹ نہیں ہے۔ تاہم ان تقریروں کا پس منظر جاننا ضروری ہے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

بھارت میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہو رہا تھا فکری سطح پر اس کے لیے جو جواز مہیا کیا جا رہا تھا کہ پاکستان مذہبی دیوانوں کی ریاست ہے اور وہاں سب کے سب ہندو اور سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا' اس لیے یہاں بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو ذبح کرنا

ضروری ہے۔

قائداعظم بار بار اس پراپیگنڈے کا جواب دیتے کہ ہم اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے اور پاکستان دیوانوں کی ریاست نہیں۔ یہاں ہر مذہب کے لوگوں کو مکمل آزادی ہے۔ یہ تقریریں وقت کی ایک اہم ضرورت تھیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت ان کی ازحد ضرورت تھی۔

تاہم بعض لیڈروں یا سرکاری افسروں کی ایک کھیپ ایسی تھی جس نے بھارت کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایک شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ غیر شعوری طور پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان مذہبی ریاست نہیں اور اس میں وہ سزائیں نہیں دی جائیں گی جنہیں جدید تہذیب برا سمجھتی ہے۔ اس کھیپ میں بعض مغرب زدہ پاکستانی سفیر خاص طور پر شامل تھے' کیونکہ انہیں بین الاقوامی سطح پر پریس کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور پریس بھارت کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان سے ایسے سوالات ضرور پوچھتا تھا' چنانچہ اکثر سفیروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوا۔ یہ صورتحال پاکستان کے حق میں انتہائی مضر تھی' کیونکہ دوسرے ممالک پر ہم پاکستان کے قیام کا مقصد ہی ثابت نہ کر سکے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر سفیر بنا کر بھیجا جاتا جو نظریۂ پاکستان سے بخوبی آگاہ ہوتے اور علمی سطح پر مخالفین کے اعتراضات کے جواب دے سکتے اور حالات کا تجزیہ کر کے ثابت کرتے کہ پاکستان مذہب کی بنیادوں پر قائم ہونے کے باوجود دوسرے مذاہب کی اقلیتوں سے کس قدر بہتر سلوک کرتا ہے اور بھارت سیکولر ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود برہمنی فسطائیت کا کس حد تک شکار ہے۔ پھر یہی کہوں گا کہ صرف پاکستان کا حصول ہماری منزل نہیں تھا' ہمیں صرف مٹی ملی تھی' اس مٹی کو بہتر بنانا' اس کی زرخیزی کیلئے کوشش کرنا' اس میں بیج ڈالنا اور فصل پیدا کرنا ہمارا کام تھا۔

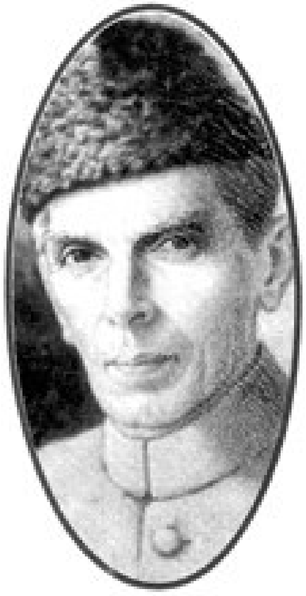

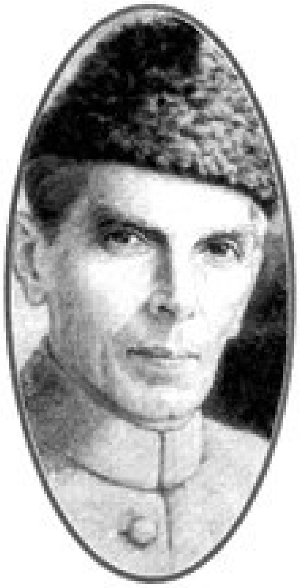

قائد کی شخصیت کے حوالے سے کتاب لکھنے کے مسئلے پر مرحوم کے ایچ خورشید کہتے ہیں یہ کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ بھارت میں گاندھی انسٹیٹیوٹ بنا اور اس نے خاصی ریسرچ کے بعد گاندھی پر کتابیں شائع کیں' اس طرز پر پاکستان میں ایک انسٹیٹیوٹ بننا چاہئے تھا' جو اس موضوع پر سارے کاغذات اور دستاویز جمع کر کے انہیں مرتب کرتا۔

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا بھی اور میں نے انہیں ایک پروگرام مرتب کر کے دیا جس میں مجوزہ کمیٹی کے ارکان کے نام بھی تھے۔ تاہم مادر ملت کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کمیٹی بن ہی نہ سکی۔ لیاقت علی خاں نے البتہ اپنے دور اقتدار میں ہیکٹر بولائتھو کو قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کا کام ضرور سپرد کیا۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے' مگر صحافتی انداز میں لکھی گئی ہے۔

جب کے ایچ خورشید مرحوم سے یہ سوال کیا گیا کہ قائداعظم کی وفات پر ایک افواہ یہ بھی پھیلی تھی کہ یہ موت طبعی نہیں تھی۔ بعد میں ان کی میت کو کراچی لے جانے کی تفصیلات منظر عام پر آئیں' تو جس لاپروائی کا مظاہرہ کیا گیا اس سے ان افواہوں کو تقویت ملی تھی۔ تو جناب کے ایچ خورشید نے کہا:

''میں اس وقت مقبوضہ کشمیر میں قید تھا۔ تاہم یہ سب افواہیں ہیں جو بعض شکی مزاج لوگوں نے وضع کیں۔ قائداعظم کی صحت تقسیم کے فوراً بعد خراب رہنے لگی تھی' لیکن ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ وہ آرام کرنے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر یہ اعصابی دباؤ انہیں بستر مرگ پر لے گیا۔

☆......☆......☆

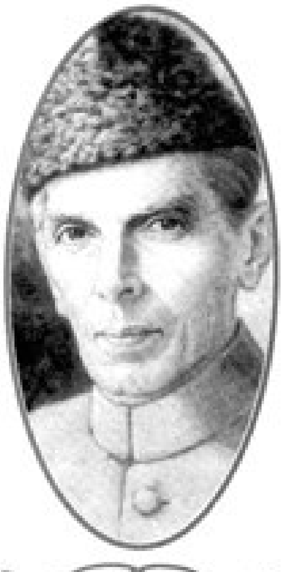

قائداعظمؒ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے ساتھ خوشگوار موڈ میں۔

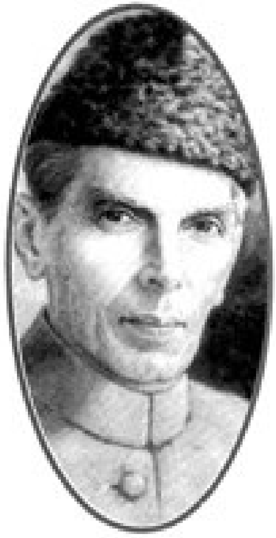

مسلم لیگ کے اندر جمہوریت

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید صاحب قائداعظم کی بیماری کے بارے میں لکھتے ہیں "رہا یہ سوال کہ قائداعظم کو علاج کیلئے باہر کیوں نہ بھیجا گیا تو یہ خیال میرے ذہن میں بھی پیدا ہوا تھا چنانچہ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ خان لیاقت علی خاں نے ایک مرتبہ قائد کی خدمت میں عرض کی کہ باہر سے ڈاکٹر بلوا لئے جائیں۔ قائد نے کہا: "نہیں" خیال ہے کہ قائداعظم نے یہ بات محض پاکستان دوستی اور پاکستان کے ہنرمندوں اور معالجوں پر اعتماد کے طور پر کہی ہو گی۔ لیاقت علی خاں نے اسے ان کا حکم سمجھا۔"

جناب خورشید کہتے ہیں: قائد کا مزاج ہرگز آمرانہ نہیں تھا' البتہ وہ کام میں کوتاہی یا بے اصولی برداشت نہیں کرتے تھے اور جس شخص سے بھی ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی اس کا نوٹس بہت سختی سے لیتے تھے۔ لیاقت علی خاں ان کے معتمد ترین ساتھی تھے۔ بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ قائداعظم تیار ہو جاتے اور لیاقت علی خاں پہنچ نہ پاتے 'فون پر معلوم کیا جاتا تو پتہ چلتا

ابھی غسل خانے میں ہیں یا تیار ہو رہے ہیں ایسے وقتوں پر قائداعظم کی ناراضگی بجا ہوتی تھی۔ وہ سستی، فرض سے غفلت یا بے اصولی کسی طور پر گوارا نہ کرتے تھے اور اپنے معتمد ترین ساتھی کے دیر سے آنے کا بھی سختی سے نوٹس لیتے تھے۔

قائداعظم خالص جمہوری انداز میں سوچتے تھے اور انہیں آمریت سے شدید نفرت تھی۔ ایک مرتبہ جلسے میں کسی نے پاکستان زندہ باد کے نعرے کے بعد شہنشاہ پاکستان کا نعرہ لگا دیا۔ قائداعظم نے اس رضاکار کو بلا کر سختی سے باز پرس کی اور بھرے جلسے میں کہا کہ میں نہ شہنشاہ ہوں اور نہ بننا چاہتا ہوں۔

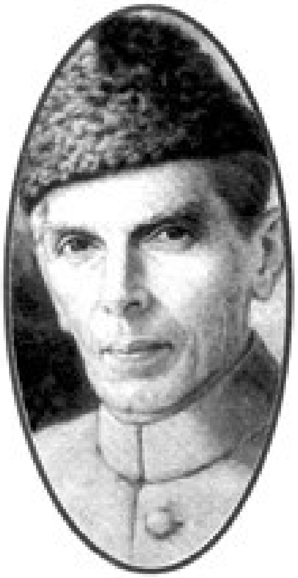

ویسے لیاقت علی خاں قائداعظم کے قدیمی ساتھیوں میں سے تھے اور قائداعظم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ برس ہا برس سے لیاقت علی خاں مسلم لیگ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے اور دونوں رہنما ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لیاقت علی خاں انتہائی دیانتدار لیڈر تھے۔

عام طور پر لیڈروں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کے سامنے جو بیانات دیتے ہیں نجی محفلوں میں ان کی رائے اس سے بہت مختلف ہوتی ہے مگر قائداعظم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان کی ہر بات واضح اور دوٹوک ہوتی تھی۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ ان کی جو بھی ذاتی رائے ہوتی تھی پبلک میں بھی ویسا ہی انداز اختیار کرتے تھے۔

قائداعظم کا مزاج بہت جمہوری تھا۔ 1939ء میں قائداعظم نے یوم نجات منانے کا اعلان کیا تھا جبکہ کانگریس کی وزارتیں بھی مستعفی ہو چکی تھیں تو اس وقت عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کلکتہ والے جو کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، انہوں نے اس بات پر استعفیٰ دے دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ غلط فیصلہ ہے اس لئے میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں ہر معاملے پر باقاعدہ اجلاس ہوا

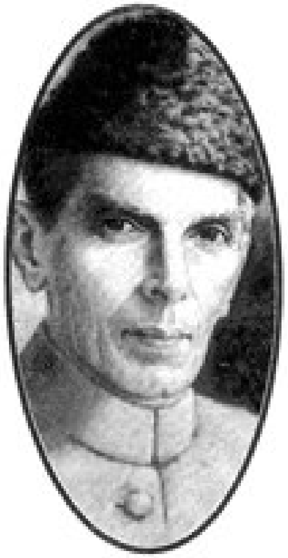

کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لیگ کی ساڑھے چار سو ارکان پر مشتمل ایک کونسل بھی تھی جس میں تمام صوبوں کے نمائندے موجود ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد مجلس عاملہ جسے خود قائداعظم نامزد کیا کرتے تھے اس کے اکیس ممبران ہوتے تھے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ مسلم لیگ میں بعض ارکان ایسے بھی شامل تھے جو عموماً خاموش رہا کرتے تھے۔ مثلاً پنجاب سے نواب ممدوٹ صاحب تھے یا میاں بشیر احمد وغیرہ۔ یہ سب خاموش طبع لوگ تھے اسی طرح مدراس سے حاجی سیٹھ صاحب بھی عموماً خاموش رہتے تھے مگر جو سینئر تھے مثلاً چودھری خلیق الزمان، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ وہ بھی اپنی رائے بیباکی سے دیا کرتے تھے۔ جی ایم سید بھی جب تک مسلم لیگ میں رہے ہر معاملے میں کھل کر اپنی رائے دیتے رہے۔ جونیئر ممبران میں سے قاضی عیسیٰ، حسن اصفہانی اور راجہ صاحب محمود آباد بھی لیگ کے معاملات پر اپنی بے لاگ رائے دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی مسئلے پر اس قدر اختلاف ہوا کہ تین روز تک بحث چلتی رہی جس کے نتیجے میں جی ایم سید صاحب ناراض ہو گئے اور میاں بشیر احمد صاحب ان کو منا کر لائے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ پر صرف قائداعظم کا حکم چلتا تھا غلط ہے۔ قائداعظم انتہائی جمہوری انداز میں مسلم لیگ کو چلاتے تھے۔ خلیق الزماں صاحب زیادہ تر معاملات میں اپنی الگ رائے رکھتے تھے اور ان کا طرز استدلال بھی خاصا موثر ہوتا تھا۔ قائداعظم کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر بات پر ہر ممبر کی رائے لے کر بات کو آگے چلایا جائے۔ بالخصوص ورکنگ کمیٹی میں وہ متفقہ فیصلے کے قائل تھے۔

جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں: ہماری کونسل کے سامنے کیبنٹ مشن کی 1946ء والی تجویز پیش کی گئی تھی تو وہ تجویز بھی متفقہ طور پر پاس نہیں ہوئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے باضابطہ طور پر اس کی مخالفت میں تقریر کی اور جہاں تک مجھے یاد ہے تقریباً تیس کے قریب ووٹ اس کے خلاف آئے تھے۔ اسی طرح جب 3 جون 1947ء کا پلان آیا جسے ”ماؤنٹ بیٹن

پلان" بھی کہتے ہیں تو اس پر بھی اختلاف ہوا اور اس کے حق اور مخالفت میں اراکین نے کھلم کھلا تقاریر کیں' البتہ اتنا ضرور ہے کہ بے شمار مسلمان تو عقیدت مندی کے جذبے سے ہی مسلم لیگ کی طرف جاتے تھے۔ قائد اعظم کی شخصیت کا ایک سحر تھا۔ دوسری بات یہ کہ بعض لوگوں کو قائد اعظم کی ذات پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائد ہمارے وقار اور عزت کے منافی کبھی کوئی فیصلہ نہیں کریں گے' یہ درست بھی ہے کہ قائد اعظم کی رائے بڑی صائب ہوتی تھی اور ان کا ہر فیصلہ بڑا جرأت مندانہ اور حالات کے مطابق ہوا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

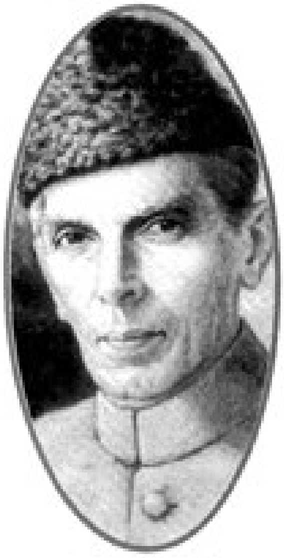

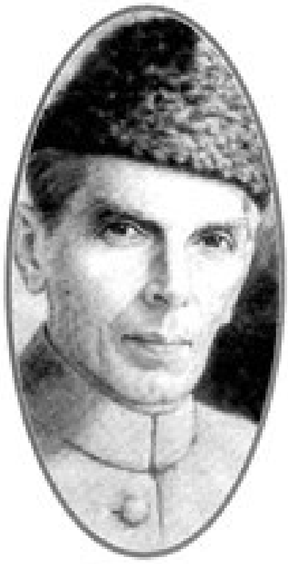

گاندھی اور نہرو سے سینئر

برصغیر کے سیاستدانوں کا موازنہ کرتے ہوئے جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم شروع سے ہی ہندوستان کی سیاست پر حاوی تھے بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ برصغیر کی تحریک آزادی میں جتنا بڑا کردار قائداعظم کا ہے ویسا کردار نہ گاندھی کا ہے اور نہ نہرو کا کیونکہ قائداعظم نے 1907ء میں سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا تھا جبکہ گاندھی تو 1915ء تک جنوبی افریقہ میں مقیم تھے اور 10 سال بعد بھارت آئے۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو بھی اپنے والد کے بعد ہی میدان میں آئے اور وہ قائداعظم سے عمر اور تجربے دونوں میں جونیئر تھے۔ لہٰذا قائداعظم کا جو تجربہ اور بالغ نظری تھی وہ کسی اور میں نہیں تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہندو لیڈروں نے کبھی زیادہ غور و فکر کیا ہی نہیں۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ ہم اکثریت میں ہیں اس لئے ہمیں آسانی سے حکومت مل جائے گی۔ مگر قائداعظم نے نہ صرف اس مسئلے کا حل پیش کیا بلکہ اسے آہستہ آہستہ آگے بھی بڑھایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے تو مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنایا اور پھر انگریزوں سے بھی اپنے مؤقف کو منوایا۔

میں نے ایک بار پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قائداعظم سیاست کے میدان میں جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر سیاسی پہلو کو سائنٹفک طریقے سے دیکھتے تھے۔ قائداعظم نے جب محسوس کیا کہ ایک طرف انگریز آہستہ آہستہ ہندو کی طرف مائل ہو رہا ہے اور دوسری طرف کانگریس اس بات پر اکڑ رہی ہے کہ مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کیا ہے جبکہ ان کے ساتھ اکثریت ہے' ان کے پاس طاقت ہے اور انگریز بھی ان کے ساتھ ہے تو قائد نے سوچا کہ اب ہندو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کتنے لوگ ہیں اور ان کی کتنی طاقت ہے۔ لہٰذا اب اگر گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے بات طے نہیں ہوتی تو یہی طریقہ ہے کہ ان سے لڑا جائے۔ چنانچہ قائد نے منطقی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے جبکہ کانگریس کے پاس گورنمنٹ کا ہتھیار ہے۔ برطانیہ کے پاس فوج ہے۔ حکومت اور اقتدار بھی اس کے پاس ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف نظریات' قراردادیں' جلسے جلوس' تقاریر اور مظاہرے ہیں۔ ان تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کی بات کی اور کہا کہ مسلمانوں کو براہ راست حکومت سے ٹکرا کر اپنا آپ منوانا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد ہی انگریزوں کو مسلمانوں کی طاقت کا احساس ہوا۔ اس زمانے میں کسی نے یہ کہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے تحریک شروع کی تو وہ کانگریس کی تحریک سے پانچ سو گنا زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس جلسے میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ ہوا تھا۔ قائداعظم نے فردوسی کے ایک فارسی شعر کا ترجمہ کچھ یوں کیا تھا:

If you want peace, I do not want war,

If you want war, I accept it unhesitantingly,

جناب خورشید کہتے ہیں: ''دراصل جب آپ آزادی کی بات کرتے ہیں تو جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ ذرا سا بھی جھک گئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی آزادی گئی۔ جیسا

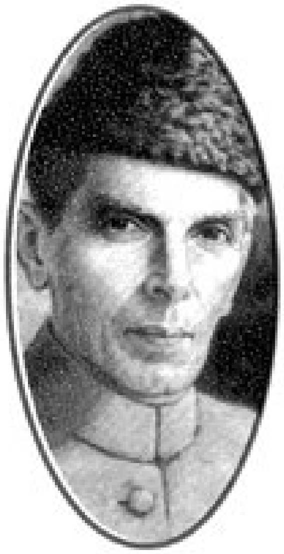

یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر رخصت ہوا تھا۔ اس لئے طالب علموں کی طرح گھس گھسا کر ان کے پاس پہنچ جانا میرے بس میں نہ تھا۔ یہ بھی اچھا نہ سمجھا کہ جب وہ اکابر کے ساتھ مصروف گفتگو ہوں تو میں دخل در معقولات کروں۔ اتنے میں مجھے اپنے بھتیجے سعدی خیری جو بعد میں ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے کا خیال آیا جو سٹوڈنٹ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے اور اس وجہ سے قائداعظم تک ان کی رسائی تھی۔

یہ میرے منشا کےخلاف تھا کہ کسی کے ذریعہ آٹوگراف حاصل کروں مگر بے حد مجبور ہو کر میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور اپنی البم انہیں تھمادی۔ سعدی دھن کے پکے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی طرح میرے مطلب کا آٹوگراف حاصل کرلیں گے۔ میری بد قسمتی دیکھئے کہ جب قائداعظم نے دستخط کرنا شروع کیے تو پین نے لکھنا روک دیا اور اس کی سیاہی خشک ہوگئی۔ آج بھی میں اس لمحے کا تصور کر سکتا ہوں۔ جو قلم کے یوں اٹکنے سے قائداعظم کے مزاج پر گراں گزرا ہوگا لیکن سعدی نے نہایت پھرتی سے قلم جھٹک کر سیاہی رواں کردی اور قائداعظم نے دستخط فرمادیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پین کی رکاوٹ نے ان کی طبیعت میں ناگواری پیدا کردی جس کی بنا پر قائداعظم نے صرف انگریزی میں دستخط کیے اور تاریخ نہ لکھی۔ قائداعظم کا آٹوگراف حاصل کر کے میں بہت خوش ہوا مگر افسوس بھی ہوا کہ انہوں نے کوئی تحریر نہ دی۔ یہ آٹوگراف قائداعظم نے جنوری 1940ء میں دیا تھا اور میرے لئے یہ بہت قیمتی ہے۔

☆……☆……☆

کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قائداعظم کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ جو بات انہوں نے ایک دفعہ طے کر لی وہ اسی پر قائم رہے۔ مجھے یہاں میاں بشیر احمد کا ایک بہت اچھا شعر یاد آیا

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کمان ہے محمد علی جناح

واقعی قائداعظم کڑی کمان کی طرح کام کرتے تھے۔ اگر وہ اس قسم کی مستقل مزاجی کا ثبوت نہ دیتے تو آپ یقین کریں کہ کبھی بھی مقصد حاصل نہ ہو پاتا۔

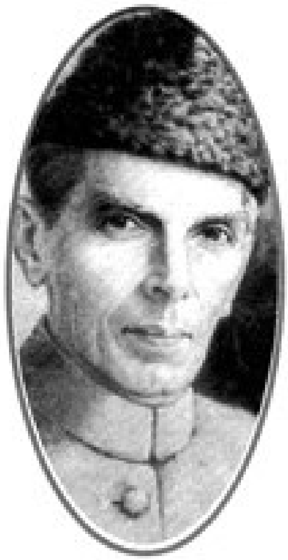

”میں پورے سوا تین سال قائد کے ساتھ رہا۔ ایسا تو نہیں تھا کہ جب دوسرے لیڈر آئیں تو قائداعظم کو جھک جھک کر سلام کریں جیسا کہ آج کل سیاست میں بہت سے پیر آگئے ہیں جن کے پیروکار لیڈر کے گھٹنوں اور پیروں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ قائداعظم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی، وہ خواہ مخواہ کی خوشامد پسندی، عاجزی یا انکساری کو پسند بھی نہیں فرماتے تھے، البتہ قائد کیلئے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی عزت اور احترام ضرور تھا بلکہ قائد کی شخصیت کے رعب سے بعض لوگ گھبرا بھی جایا کرتے تھے مگر قائد چھوٹے بڑے ہر شخص کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ملتے تھے اور کچھ دیر گفتگو کے بعد نوجوانوں تک میں اتنا حوصلہ پیدا ہو جاتا تھا کہ وہ کھل کر اپنے لیڈر سے بات کر سکیں۔

☆......☆......☆

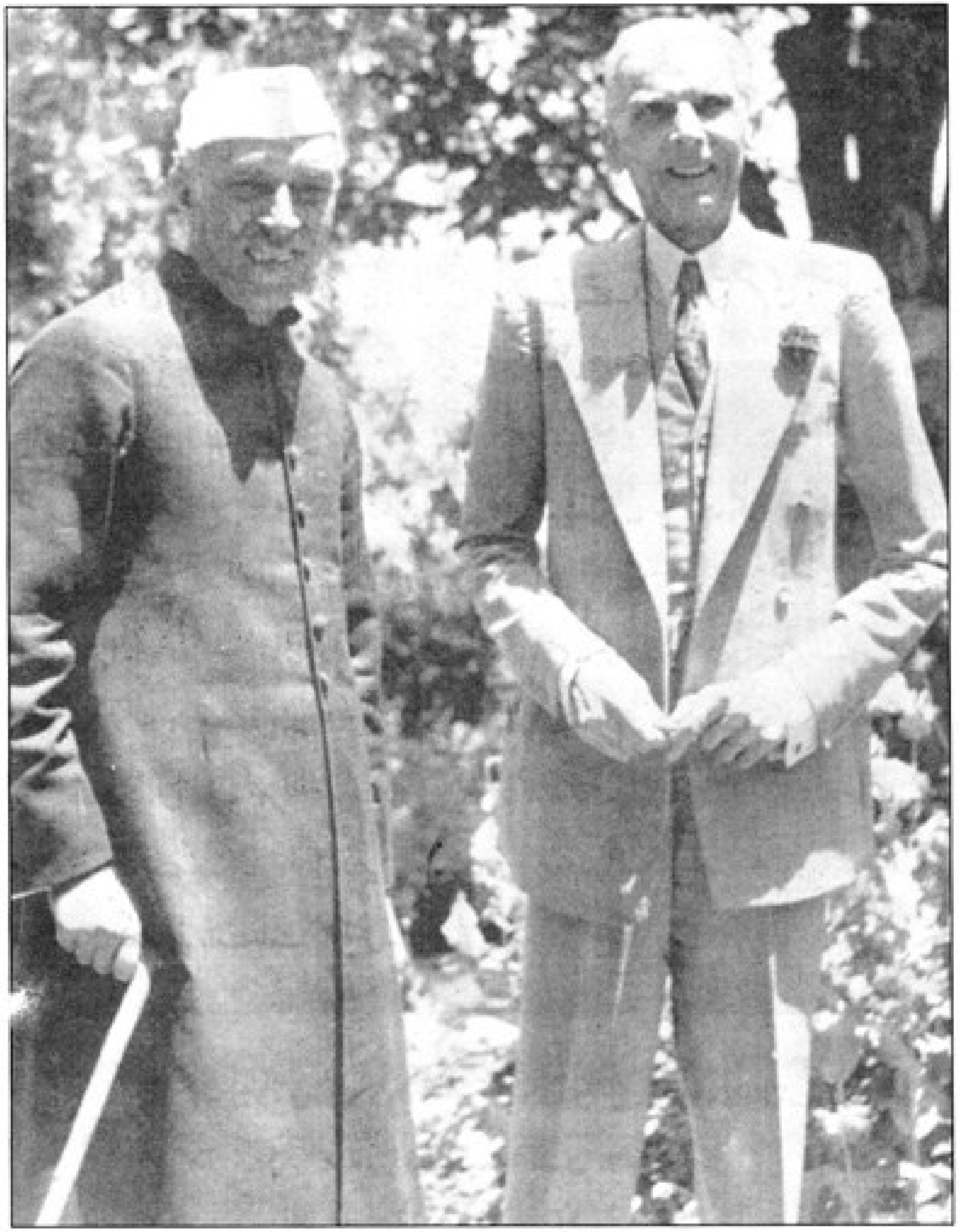

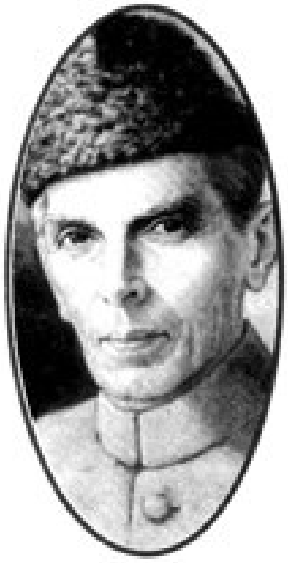

قائداعظمؒ اور پنڈت جواہر لعل نہرو۔

شملہ کانفرنس 1945ء

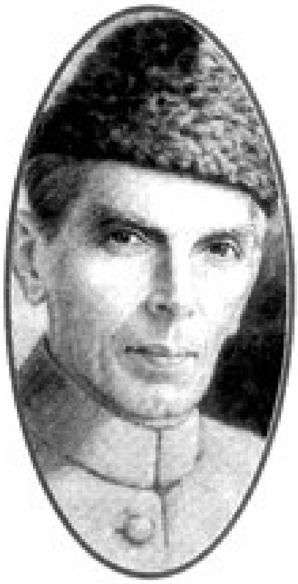

بیماری اور تھکاوٹ کے باوجود

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید لکھتے ہیں:

"قائد کی بیماری کا ساری دنیا کو علم تھا۔ 1945ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا ہی نہیں تھا کہ قائداعظم پر بمبئی سے دہلی آتے ہوئے راستے میں دل کا دورہ پڑا اور وہ بیمار پڑ گئے۔ انہیں نمونیہ ہو گیا۔ اس سے پہلے 1942ء میں وہ مدراس کے اجلاس میں شرکت کرنے گئے تھے تو بھی بیمار ہو گئے تھے۔ وقتاً فوقتاً انہیں یہ تکلیف ہوتی رہتی تھی۔ وہ کشمیر بھی اس لیے گئے تھے کہ ڈاکٹروں نے انہیں صحت افزا مقام پر جا کر آرام کا مشورہ دیا تھا۔ میرے خیال میں کانگریس والوں اور برطانوی حکومت کی انٹیلی جنس کو قائداعظم کی بیماری کے بارے میں مکمل طور پر معلومات تھیں۔ اس کے علاوہ قائداعظم کے ڈاکٹروں میں ایک مسلمان، ایک انگریز اور ایک پارسی شامل تھے۔ مسلمان ڈاکٹر تھے۔ کرنل رحمٰن بہاولپور والے، انگریز ڈاکٹر کا نام پیٹی تھا جو دہلی کے تھے اور پارسی ڈاکٹر کا نام کمانڈر جارج پٹیل تھا۔ کوئی یہ کہے کہ صاحب، قائداعظم کا ڈاکٹر مسلمان تھا اور اس نے اس بات کو خفیہ رکھا تو میرا نہیں خیال کہ انگریز اور پارسی ڈاکٹر کی

وساطت سے بات دوسروں تک نہ پہنچتی۔

عمر کے لحاظ سے قائد کی صحت مجھے نارمل لگتی تھی' یعنی آپ اندازہ لگائیں کہ 1946ء میں ان کی عمر 76 برس کی تھی جبکہ ایشیا بالخصوص برصغیر میں 60 برس کے بعد بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے مگر قائداعظم کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ ان کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ان کی چال میں ایک توانائی اور تیزی تھی۔ ان کی آواز میں ایک رعب تھا۔ وہ زمانہ قائداعظم کے لیے انتہائی مصروفیت کا تھا اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ ہر کام وقت پر کریں۔ اسی لیے قائداعظم کی زندگی میں ایک باقاعدگی تھی' لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ سیاست میں بعض اوقات معمولات سے ہٹ کر بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ جلسے اور تقریریں وغیرہ کرنے میں رات کے دو تین بج جاتے ہیں۔ اخباری بیانات دینا ہوتے ہیں' خطوط وغیرہ لکھنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کئی مرتبہ قائداعظم کا شیڈول اور معمولات بگڑ جاتے تھے اور عمر کے اس مرحلے میں اگر معمول بگڑے تو انسان تھک بھی جاتا ہے۔

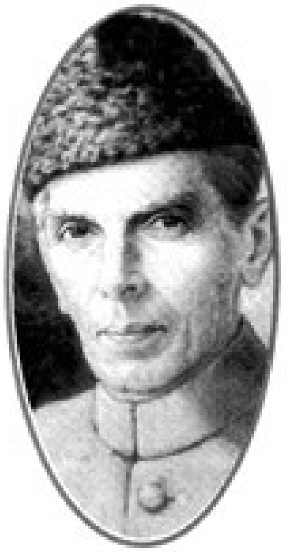

بعض اوقات قائداعظم کو تھکاوٹ وغیرہ محسوس ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جب ہم بنگال میں گئے اور وہاں 1945-46ء کا الیکشن ہوا تو ٹرین کو کلکتہ سے گوہاٹی جاتے ہوئے 72 گھنٹے لگے جبکہ اس کے معمول کا وقت 48 گھنٹے تھا۔ اس تمام عرصہ میں ہم لوگ جاگتے ہی رہے کیونکہ وہاں قائداعظم کافی عرصہ کے بعد گئے اور عوام کے بڑے بڑے ہجوم ہر جگہ اکٹھے ہو جاتے تھے جس کے باعث ٹرین ہر 10 منٹ کے بعد رکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں آدمی کو تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے۔

جناب کے ایچ خورشید نے کہا: ''قائداعظم کو لیاقت علی خاں پر پورا پورا اعتماد تھا۔ لیاقت علی خاں کا مزاج بہت دھیما تھا' جسے ہم انگریزی میں (COOL MIND) آدمی کہتے ہیں جو بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ میرے علم کے مطابق قائداعظم ہر اہم مسئلہ پر ان

سے مشورہ کرتے تھے' البتہ ایک واقعہ ہوا تھا جب لیاقت ڈیسائی پیکٹ ہوا۔ اس کے مطابق بہت کوشش کی جارہی تھی کہ مرکز میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جو جنگ کے ختم ہونے تک انگریز کے ماتحت ہو اور پھر جنگ کے بعد حکومت کوئی فارمولا بنا کر برطانیہ سے اقتدار حاصل کر لے۔ اس وقت قائداعظم بمبئی میں تھے اور لیاقت علی خاں دلی میں تھے۔ وہ بھی اسمبلی کے ممبر تھے اور بھولا بھائی ڈیسائی بھی اسمبلی کے ممبر تھے۔ بھولا بھائی ڈیسائی ویسے بھی بہت اہل علم' مدبر' تعلیم یافتہ' بہت اچھے فارسی دان اور وسیع القلب قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ کانگریس کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ 1942ء میں انہوں نے جو ایجی ٹیشن شروع کیا تھا اس کی وجہ سے کانگریس کو نقصان پہنچا اور اسے اقتدار میں آنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے جو فارمولا پیش کیا وہ ایک لحاظ سے مسلم لیگ کے مؤقف کو تسلیم کرتا تھا۔ اس میں بنیادی اصول یہ تھا کہ Parity ہو یعنی مسلم لیگ اور کانگریس سے برابر کے نمائندے لیے جائیں۔ لیاقت علی خاں نے اس کی ہامی بھر لی مگر جب قائداعظم کے نوٹس میں یہ بات آئی تو انہوں نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور کہا کہ میں اس قسم کا کوئی فارمولا قبول نہیں کر سکتا اور مکمل آزادی کے بغیر مجھے کوئی شکل منظور نہیں۔ ظاہر ہے کہ قائداعظم اور گاندھی جی کی منظوری کے بغیر فارمولے کو عملی شکل نہیں دی جا سکتی تھی' لہٰذا یہ منصوبہ ڈراپ ہو گیا۔"

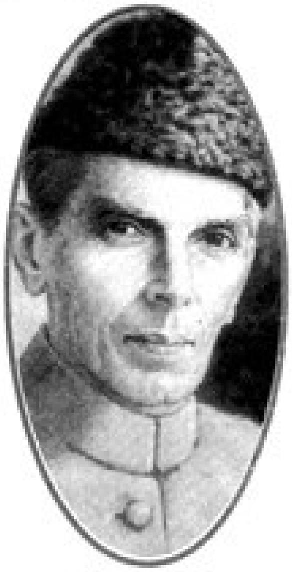

☆......☆......☆

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

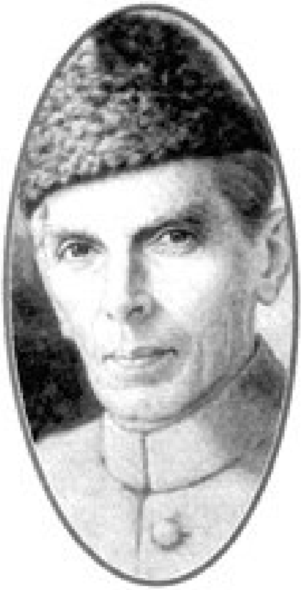

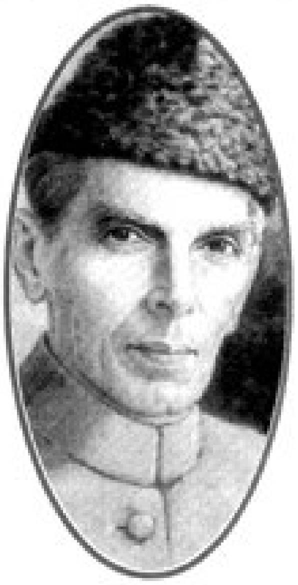

انگریز تو پاکستان کا مخالف تھا

قائد اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید کی کتاب سے یادداشتوں کا سلسلہ جاری ہے' وہ کہتے ہیں:

"جہاں تک مسلم لیگ کی تنظیم نو کا تعلق تھا تو اس بارے میں قیام پاکستان سے پہلے بھی ہم لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ تنظیم ایسی نہیں جیسی کہ ہونی چاہئے۔ ایک بار قائد اعظم نے مجھے خود کہا تھا کہ وہ ایک اچھی قسم کا سیکرٹریٹ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں درجن کے قریب تعلیم یافتہ اور جواں ہمت' جواں جذبے والے نوجوانوں کو بھرتی کیا جائے تاکہ مسلم لیگ آگے چل کر سیاسی بنیادوں پر ایک صحیح فعال اور مضبوط جماعت بن سکے۔ یہ 1946ء کی بات ہے لیکن اس وقت حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے تھے کہ قائد کو اس کام کی مہلت نہ ملی۔ لیاقت علی خان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ مسلم لیگ کے سیکرٹریٹ میں بھی کام اس قدر بڑھ گیا تھا اور واقعات اس تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے کہ لیاقت علی خان کے لئے مسلم لیگ کے تنظیمی کاموں کو تسلی بخش طریقے سے چلانا بہت مشکل ہو گیا تھا' لیکن جہاں

تک ان کی قابلیت اور وفاداری کا تعلق تھا' وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔"

جناب کے ایچ خورشید نے ایک سوال کے جواب میں کہا:

"بعض مخالفین یہ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان کو قائداعظم نے نہیں انگریز نے بنایا تھا حالانکہ اگر انگریز حکومت کے بیانات اور ان کے اعمال دیکھے جائیں تو وہ تمام کے تمام پاکستان کے خلاف تھے' بالخصوص لیبر پارٹی جو اس وقت برسراقتدار تھی' پاکستان کی سخت مخالف تھی۔ اس کے علاوہ لارڈ ویول' چرچل اور اٹیلی وغیرہ یہ تمام انگریز ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی ایڈمنسٹریشن پر بہت گھمنڈ تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہم نے ایک شاندار سول سروس قائم کی ہے۔ عمدہ قسم کا ڈیفنس سسٹم بنایا ہے اور اگر اتنی بڑی فورس کو توڑ دیا گیا تو نقصان ہو گا۔ ہم نے بڑا شاندار ریلوے اور نہروں کا سسٹم بنایا ہے اور اگر اس کی تقسیم ہو گئی تو بہت نقصان ہو گا یعنی وہ ایڈمنسٹریٹو قسم کے دلائل رکھتے تھے جن کا تعلق انتظامی امور اور ملکی حالات کے ساتھ تھا۔ انگریز مقامی سیاسی حالات اور مقامی لوگوں کے جذبات و احساسات کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس وقت انگریزوں نے ایک تھیوری بھی پیش کی یعنی (Defence in Depth) جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ دفاعی طور پر مستحکم نہیں رہ سکے گا کیونکہ اس میں کوئی گہرائی اور وسعت نہیں ہے' تاہم مسلم لیگی مسلمان بالخصوص قائداعظم اس دلیل کے حق میں نہ تھے اور اسے لایعنی قرار دیتے تھے۔ ان کا مؤقف تھا کہ انگریزوں کا سارا برطانیہ صوبہ پنجاب کے برابر ہے۔ ان کے پاس کون سا (Defence in Depth) تھا۔

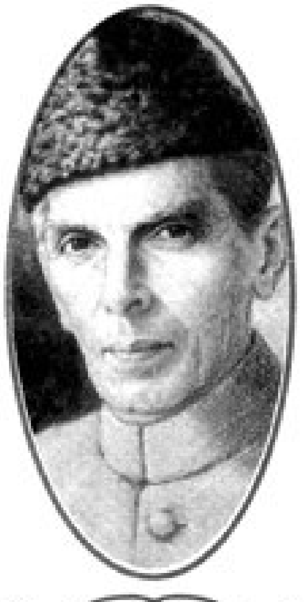

انگریزوں کو قطعی یہ بات پسند نہیں تھی کہ پاکستان علیحدہ ہو جائے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا' اگر قائداعظم 1946ء میں ڈائریکٹ ایکشن کی بات نہ کرتے تو شاید ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر انگریز کو یہ ملک بنانا ہوتا تو قائداعظم کو اتنی مصیبت کیوں کرنا پڑتی' وہ تو پہلے ہی کہہ دیتے کہ بھئی تم پاکستان لے لو۔ انگریز نے پہلے کیبنٹ مشن پلان کیوں بنایا جس کی وجہ سے مسلم لیگ گہرے امتحان اور آزمائش میں

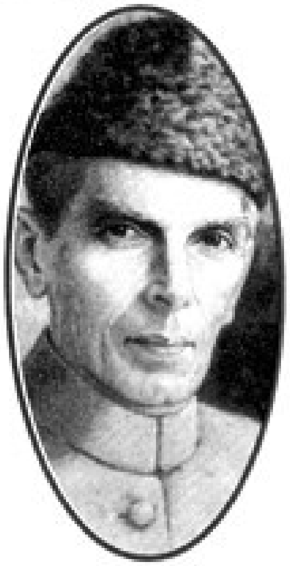

پڑ گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم نے اس وقت بالکل صحیح چال چلی کہ اسے پہلے قبول کر لیا۔ اس طرح کانگریس چکر میں پڑ گئی' حالانکہ کانگریس کا خیال تھا کہ قائد ضدی آدمی ہیں' وہ کیبنٹ مشن کو بھی مسترد کر دیں گے اور پھر میدان ان کے ہاتھ میں رہے گا اور وہ لوگ من مانی کرتے رہیں گے مگر قائداعظم نے مکمل غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ بہتری اسی میں ہے کہ اس پلان کو قبول کر لیا جائے۔

جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں کہ میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں کہ ماؤنٹ بیٹن یہاں آتے ہی دونوں ملکوں کا جوائنٹ گورنر جنرل بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ اب اگر ایک ہی گورنر جنرل اور ایک ہی کمانڈر انچیف رہتا تو دنیا کو کیسے پتہ چلتا کہ دو ملک بنے ہیں اور پاکستان آزاد ہوا یا نہیں ہوا؟ اس لئے یہ بہت ضروری تھا کہ پاکستان کا گورنر جنرل علیحدہ ہو تاکہ دنیا کو یقین آجائے کہ واقعی برصغیر کے دو حصے ہو گئے ہیں اور ان کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہو گئی ہیں۔ دراصل ماؤنٹ بیٹن کو یہ ذاتی صدمہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن کا رول کوئی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ جتنا اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن تو ایک قاصد تھا جسے کہا گیا کہ تمہیں جا کر یہ پروانہ دینا ہے اور اگر وہ نہیں مانتے تو اس خطے کے دو حصے کر دینا۔

میرے خیال میں تو ماؤنٹ بیٹن ایک کھوکھلی قسم کی شخصیت تھا۔ اسے خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ کئی مرتبہ اس نے قائداعظم کے اس بیان کو دلیل سے پیش کیا کہ صوبوں کو بطور یونٹ رہنا چاہئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خود برطانوی حکومت نے 1942ء میں یہ کہا تھا کہ صوبوں کو بطور یونٹ قائم رکھا جائے گا۔ اسی لئے قائداعظم نے بھی کہا تھا کہ جب تقسیم کرنی ہے تو پھر صوبے ہی کو یونٹ رکھو۔ سوال یہ تھا کہ اگر تقسیم ہوتی ہے تو پھر یونٹ کون سا ہو۔ وہ صوبہ ہو' ضلع ہو یا ڈویژن ہو' مگر ماؤنٹ بیٹن نے صرف پاکستان کی ضد میں آ کر اور پنجاب اور بنگال کی حد تک مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے دونوں صوبوں کو نہ صرف تحصیل حتیٰ کہ پٹوار تک کو تقسیم کر دیا۔

☆......☆......☆

لیڈی ماؤنٹ بیٹن ' قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن

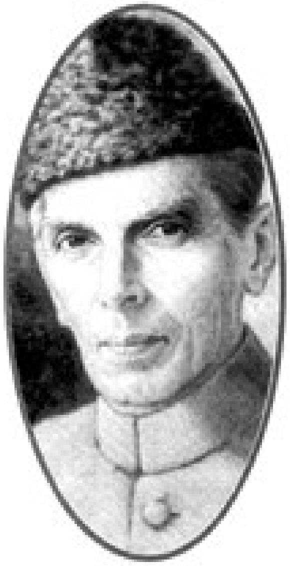

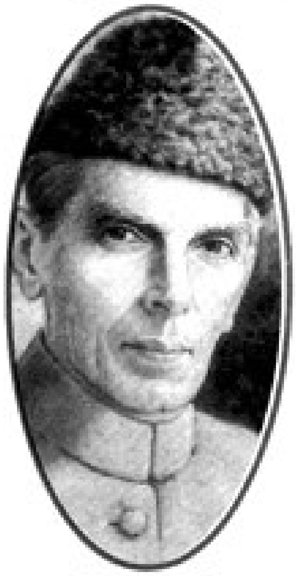

دو الگ قومیں

ہم جناب کے ایچ خورشید کی زبانی قائد کے سیاسی سفر اور ماؤنٹ بیٹن کے کردار کا حال بیان کر رہے تھے۔ جناب خورشید کہتے ہیں:

"ماؤنٹ بیٹن کی ضد اور عناد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی گئی تو اس نے امرتسر کے مسلمانوں کی اکثریتی تحصیلوں، فیروزپور کے مسلمانوں کی اکثریتی تحصیلوں اور گورداسپور کے علاقے کو ریڈ کلف ایوارڈ کے منافی اور برعکس پاکستان سے نکال کر ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ دراصل یہ بات ماؤنٹ بیٹن کے عناد کی وجہ سے ہوئی ورنہ اول الذکر بات ہوتی تو سکھوں کا مسئلہ ہی نہ پیدا ہوتا اور اگر پورا پنجاب پاکستان میں آجاتا تو سکھ برادری کو کسی قسم کی مشکلات پیش نہ آتیں لیکن کانگریس کو یہ بات قبول نہ تھی۔ اگر پورا بنگال چلا جاتا تو پھر کانگریس کو آسام میں بھی خطرہ نظر آتا۔ دوسری طرف کانگریس نے سکھوں کو بھی بھڑکایا ہوا تھا کیونکہ انگریزوں اور کانگریس کی یہ ملی جلی سوچ تھی کہ پاکستان زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کو پہلے ہی اتنا کاٹو کہ وہ اور زیادہ کمزور ہو جائے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و

کرم سے ان کی یہ ناپاک کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔"

جناب خورشید کہتے ہیں کہ آخر ماؤنٹ بیٹن کی بات میں وزن کیا تھا؟ قائداعظم کی کامیابی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے پہلے تو اپنے مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے منوایا کہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں اور جب ان کے نظریے کی ایک فلسفیانہ بنیاد پڑ گئی تو پھر کہا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت قوم کیلئے ایک وطن ہونا بہت ضروری ہے' کوئی بھی قوم بے وطن نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول میں وطن وہی ہوگا جہاں تمہاری اکثریت ہوگی۔

اس طرح قائداعظم نے ان تین اصولوں کو مدنظر رکھا اور قوم' وطن اور جمہوریت کی بنیاد پر انہوں نے برطانیہ کے تمام بڑے بڑے قانون دانوں کو لاجواب کر دیا مگر ماؤنٹ بیٹن نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چوہے کی طرح کتر کر پاکستان کے نقشے میں بددیانتی کر دی۔

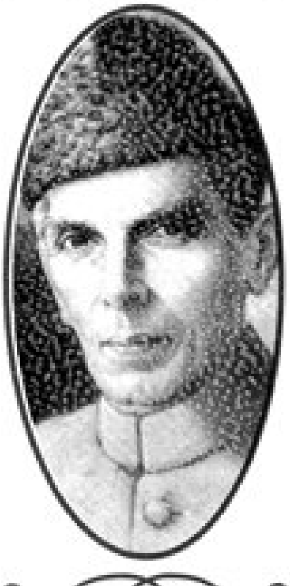

جناب کے ایچ خورشید نے اپنی کتاب میں مسئلہ کشمیر پر شیخ عبداللہ اور قائداعظم کی ملاقاتوں کے حوالے سے ایک بہت اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے جو آج مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بھی اہم ہے' وہ کہتے ہیں:

"شیخ عبداللہ نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں پاکستان کے ساتھ ہوں۔ یا تو وہ قائداعظم سے یہ کہتے کہ صاحب میں مسلمانوں کو واقعی ایک قوم کے طور پر قبول کرتا ہوں اور کشمیر کو پاکستان میں آنا چاہئے' جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم اگر شیخ صاحب کو تھوڑا سا لالچ دیتے تو وہ ادھر آ جاتے' میری نظر میں وہ شیخ عبداللہ کو نہیں جانتے۔ شیخ صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ وہ کانگریس میں تھے اور خود کو نیشنلسٹ مسلمان کہتے تھے۔ بات یہ تھی کہ مسلمان انگریزوں کے زمانے میں اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ہم علیحدہ قوم ہیں۔ ہمارا ایک وجود' حیثیت اور ہیئت ہے اور ہمارا جو ایک تشخص ہے اسے کس طرح سے قائم کیا

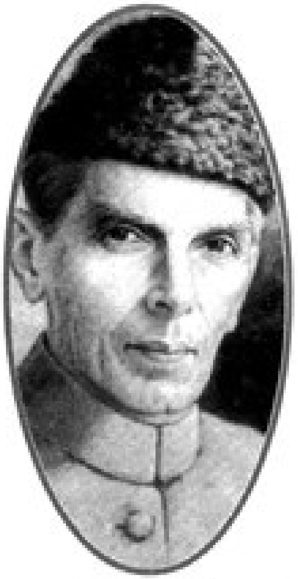

جائے لیکن چونکہ سب کے سب بطور ہندوستانی مانے جاتے تھے۔ اس لئے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ہم کیا کریں۔

جب قیام پاکستان کا خیال سامنے آیا تو مسلمانوں میں 2 طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ کہتا تھا کہ مسلمانوں کا تشخص اسی طرح محفوظ رہ سکتا ہے جب ان کا ایک علیحدہ وطن قائم ہو جائے۔ دوسرا طبقہ یہ مؤقف پیش کرتا تھا کہ صاحب ہندو ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے' ہم مسلمان اور دلیر لوگ ہیں۔ کیا ہم ہندوؤں سے ڈر جائیں گے' لہٰذا گھبرانے والی کوئی بات نہیں' ہم اچھی طرح سے ان کا مقابلہ کر لیں گے۔

شیخ عبداللہ کا خیال یہ تھا کہ پاکستان بن ہی نہ سکے گا۔ اس زمانے میں یہ زبردست پراپیگنڈا تھا کہ پاکستان ایک دیوانے کا خواب ہے۔ خود مسلم لیگ کے اندر بعض لوگ ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ شاید پاکستان کا نعرہ محض سودے بازی کیلئے ہے۔"

میں آپ سے عرض کروں کہ قائداعظم 1944ء میں شیخ عبداللہ کی دعوت پر بھی کشمیر میں گئے تھے اور وہاں ان کی چھ سات ملاقاتیں بڑی تفصیل کے ساتھ ہوئی تھیں۔ اس موقع پر قائداعظم نے شیخ صاحب سے کہا دیکھو! شیخ عبداللہ جتنی تمہاری زندگی ہے اس سے زیادہ عمر میں نے سیاست میں گزاری ہے۔ میں بہت عرصہ ہندوؤں کے ساتھ گزار چکا ہوں' تم ان لوگوں کو نہیں جانتے' یہ لوگ تمہیں تنگ کریں گے' مگر شیخ عبداللہ کا نظریہ کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جناب میری سیاست الگ ہے اور آپ کی سیاست الگ۔ چنانچہ 1944ء کے بعد شیخ عبداللہ نے خود ہی انکار کر دیا تو اس کے بعد کوئی موقع ہی نہیں آیا کہ شیخ صاحب کو اپنے ساتھ ملایا جاسکے۔

جناب خورشید کہتے ہیں: "ایک مدت تک یہ پوزیشن رہی کہ اگر آپ مقبوضہ کشمیر میں جائیں تو وہاں 14 اگست کو لوگ پاکستانی جھنڈے لے کر میدان میں آجاتے ہیں۔ اگر پاکستان

ہاکی‘فٹ بال یا کرکٹ کے میچ میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں‘وہاں کے لوگوں کا جذباتی لگاؤ آج بھی پاکستان کے ساتھ ہے اور شیخ عبداللہ کے ساتھ کانگریس حکومت نے جو برتاؤ کیا‘یعنی پہلے اس سے یہ معاہدہ کیا گیا تھا کہ کشمیر کو آزاد رکھا جائے گا اور وہاں پر ایک ریاستی صدر اور وزیراعظم ہوگا۔ نیز یہ کہ وہاں پر ہندوستان کا آئین لاگو نہیں ہوگا۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ اور وہاں کے پبلک سروس کمیشن کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا‘مگر بعد میں کانگریس حکومت نے آہستہ آہستہ ان سے تمام چیزیں چھین لیں حتیٰ کہ بعد میں روزمرہ کے ریاستی امور میں مداخلت کی جانے لگی‘لہٰذا شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو ایک روز یہ بات ماننا پڑی کہ ہندو ذہن بالخصوص کانگریس حکومت کے بارے میں قائداعظم ہمیشہ سے صحیح اور 100 فیصد درست رائے رکھتے تھے اور ہندو اور مسلمان واقعی 2 قومیں تھیں جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں‘نہ مل کر امن وسکون سے رہ سکتی تھیں۔

☆......☆......☆

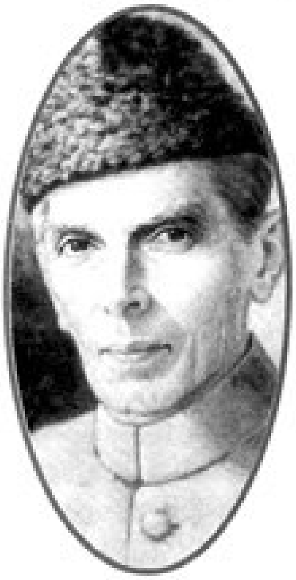

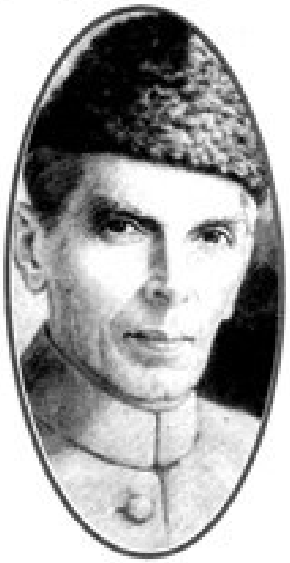

بڑا آدمی...... عظیم شخصیت

جناب کے ایچ خورشید نے اپنی کتاب میں قائد کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا ہے جسکا عنوان ہے "ناخدا" اس مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:-

"آپ سمجھ گئے کہ محمد علی جناح کے چشمے کے سیاہ ریشمی دھاگے کی ایک جنبش پر دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا انحصار ہے اور اسی لئے میں محمد علی جناح کو ایشیا کی اہم ترین شخصیت قرار دیتا ہوں۔"

یہ الفاظ مشہور انگریز مصنف بیورلی نکلسن کے ہیں، جس نے دس کروڑ مسلمانان ہند کے محبوب لیڈر کو ایشیا کی اہم ترین شخصیت قرار دیا ہے لیکن بیورلی نکلسن نے اس عظیم ترین شخصیت کی سیرت، اس کی سیاسیات کے دوسرے رخ اور اس کے شخصی کردار کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا کہ محمد علی جناح موجودہ زمانے کا سب سے بڑا انسان ہے اور اگر وہ کسی آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوتا تو سینکڑوں چرچل اور ہزاروں روزویلٹ اس کے سامنے ماند پڑ جاتے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے کردار میں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے کہ وہ

جس مسلک کو ایک بار درست سمجھ کر اختیار کر لیتے پھر ان کے آہنی عزم کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ وہ جس مؤقف کو صحیح سمجھتے اس پہ ڈٹ جاتے تو انہیں جنبش دینا ناممکن ہوتا۔ شملہ کانفرنس کے دوران میں مسلم لیگ نے جب اپنا قطعی فیصلہ وائسرائے تک پہنچادیا تو ہندو پریس کے منظم اور شرانگیز پراپیگنڈہ سے لیگ کے چند ایک تجربہ کار رہنما بھی اس وسوسے میں پڑ گئے کہ شاید وائسرائے اس پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلم لیگ کو نظرانداز کر دے۔ لیکن قائداعظم کو پختہ یقین تھا کہ لیگ نے صحیح پوزیشن اختیار کی ہے اور اس کا یہ رویہ درست ہے اور مسلم لیگ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ واقعی مسلم لیگ اور قائداعظم کا رویہ آبرومندانہ' اصول پسندانہ اور سو فیصد درست تھا۔

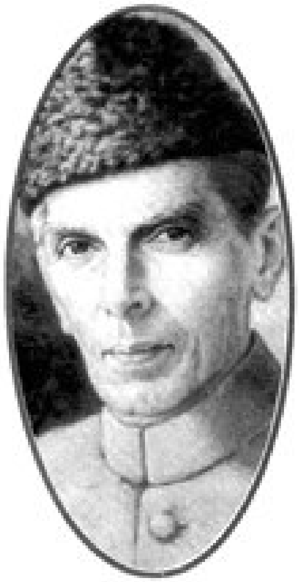

انگریز شناسی کے سلسلے میں بھی قائداعظم کا جواب نہیں تھا۔ قیام انگلستان کے زمانے میں قائد کی رہائش ایک انگریز خاندان کے ساتھ رہی۔ انگریزی فضا اور انگلستان کے آزاد ماحول میں قائد کی طبیعت ایک خاص سانچے میں ڈھلی' وہ انگریز کے عادات واطوار' اس کی خصوصیات' خامیوں' کمزوریوں' قومی کردار' انگریز کی فطرت اور اس کے سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ انگریز کی انفرادی' قومی' سماجی یا سیاسی زندگی کا کوئی پہلو بھی قائد کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ انگریز کے رگ و پے سے واقف تھے۔ سفید چمڑی جو بہت سے ہندوستانی لیڈروں میں احساس کمتری کی پیدائش کا باعث ہے' قائداعظم محمد علی جناح کے لیے بالکل اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ انگریز سے ملتے وقت ان کی گردن جھکتی نہ ان کے منہ سے خوشامدانہ کلمات نکلتے تھے۔

1931ء تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے سخت محنت اور انتھک کوشش کرنے کے بعد محمد علی جناح اپنے تجربہ کی بنا پر حاصل کیے ہوئے سبق اور نئے نظریے یعنی پاکستان کو لے کر انگلستان گئے اور تقریباً پانچ سال تک سیاست میں انہوں نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ اس

عرصہ میں انہوں نے اپنے تیس سالہ تجربہ کی روشنی میں ہندوستان کے مسائل کا دقیق اور عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔ سارے اعداد و شمار کا جائزہ لیا۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے رجحانات اور ان کی سیاسی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی اور بالآخر انہیں پختہ یقین ہو گیا کہ پاکستان ہی ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا واحد حل ہے۔ چنانچہ 1935ء میں انہوں نے ہندوستان واپس آکر دوبارہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو پاکستان ہی ان کا مطمع نظر تھا اور انہی لائنوں پر انہوں نے مسلم سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا۔

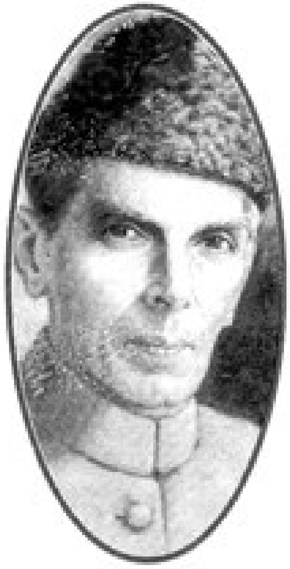

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی عظمت کا صحیح اندازہ اب تک نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے قریب رہنے والے اور ان کے ساتھ کام کرنے والے جانتے ہیں کہ قائد میں ہر وہ خاصیت موجود ہے جو ایک آئیڈیل قومی ہیرو' لیڈر' سیاستدان اور مدبر میں ہونی چاہیے۔ محمد علی جناح میں وہ خصوصیات در حقیقت موجود تھیں جو ایک بڑے آدمی کے لیے لازم ہوتی ہیں۔ گاندھی کی عظمت کا انحصار 50 فیصد ہندو پریس کے جھوٹے پراپیگنڈے اور تیں فیصد ہندو قوم کی بت پرستانہ ذہنیت پر ہے لیکن محمد علی جناح ہندو پریس کے جھوٹے اور مخالفانہ پراپیگنڈے کے باوجود سو فیصد عظیم سیاستدان ثابت ہوئے اور سمجھے گئے۔

اس زمانے میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اگر گاندھی کو کوئی نہ جانتا ہو اور وہ کسی شارع عام سے گزریں تو دیکھنے والا زیادہ سے زیادہ انہیں ایک مخبوط الحواس انسان سمجھے گا جو آدھے کپڑوں میں سڑک پر نکل آیا ہے۔ اس کے برعکس اگر قائداعظم کو کوئی نہ جانتا ہو تو بھی جس کی نظر ان پر پڑتی تھی رک جاتی تھی۔ قائد کا دراز قد' ان کی جاذب نظر شخصیت' ان کے روپہلے بال جو پیچھے کی طرف مڑے تھے' انکا موزوں ترین لباس' ان کی چال' ان کے نپے تلے قدم اور ان کا بارعب چہرہ ہر دیکھنے والے کو محسوس کراتا تھا کہ "کوئی" بڑا آدمی' کوئی عظیم شخصیت جا رہی ہے۔

☆......☆......☆

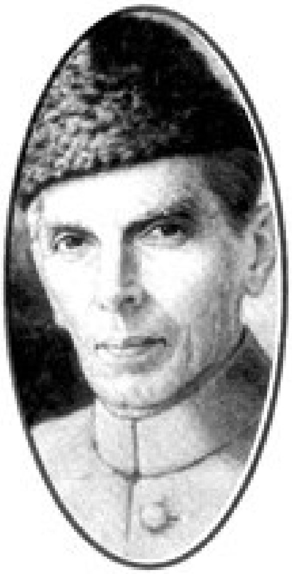

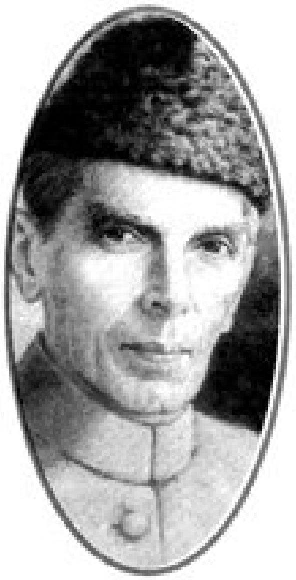

قائد کی ذاتی باتیں

ہم قائداعظم کے بارے میں جناب خورشید کی یادیں شمار کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

قائد کا لباس نہایت پسندیدہ اور موزوں ہوتا تھا۔ درحقیقت یہی ان کی شخصیت اور ان کے کردار کا آئینہ تھا۔ قائد کا دل ان کے لباس کی طرح صاف تھا۔ جس طرح آپ ان کے لباس کو بے داغ' بے عیب اور ہر لحاظ سے موزوں پاتے تھے' اسی طرح محمد علی جناح کا کریکٹر بے داغ اور بے عیب تھا اور وہ اپنے مقام کیلئے موزوں ترین آدمی تھے۔ ان کا عمدہ لباس ان کی نفاست پسندی کی نہیں بلکہ ان کے کامل ہونے کی دلیل تھا۔ آپ ان کے لباس میں کوئی نقص تلاش نہیں کرسکتے تھے۔ آپ کو ان کے لباس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی تھی جو لاپروائی' جلد بازی' دماغی پریشانی اور افراتفری کا پتہ دیتی ہو۔ اس سے محمد علی جناح کی ہوش مندانہ' محتاط' پرسکون اور خود مختار طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

قائد اپنا ہر کام خود کرتے تھے۔ سیاسی مصروفیات' ملاقاتیں' انٹرویو' روزمرہ کی خط وکتابت اور لیگ کا سرکاری کام کرنے کے علاوہ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے اخبارات ورسائل' مختلف سیاسی کتب' قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے انگریزی تراجم بھی اکثر ان کے

زیر مطالعہ رہتے تھے۔ وہ اپنا ہر ایک خط خود کھولتے' خود پڑھتے اور خود اس کا جواب دیتے تھے۔ سفر کرنے سے پیشتر اپنا سامان خود پیک کرواتے تھے اور بعض اوقات اپنی قمیض کے بٹن تک خود ٹانک لیتے تھے۔ دن اور رات میں تقریباً بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے اور عیدین اور یوم پاکستان وغیرہ پر بھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔

قائد کی کوئی پرائیویٹ زندگی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک پبلک آشرم میں رہنے کے بجائے ایک پرائیویٹ مکان میں رہتے تھے اور ذرا تنہائی پسند تھے۔ نام و نمود کے خواہشمند لیڈروں کی طرح وہ اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے' لیکن اس سے بعض لوگ یہ غلط نتیجہ نکالتے کہ محمد علی جناح عوام سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ بات نہیں' محمد علی جناح دنیا کے ان کم کم لوگوں میں سے تھے' جنہیں وقت کی صحیح قدر تھی۔ جن کی آنکھوں سے اپنا نصب العین کبھی اوجھل نہ ہوتا اور جنہیں ہر وقت اور ہر لحہ اپنی بھاری مگر نازک ذمہ داری کا احساس رہتا تھا۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر محمد علی جناح ہفتے میں ایک روز اور دن میں دو چار گھنٹے محض عوام کو درشن دینے میں ضائع کر دیتے تو ان کے کام کا کس قدر حرج ہوتا۔ یوں بھی ان کے نزدیک یہ بات پسندیدہ نہیں تھی اور بت پرستوں ہی کو زیب دیتی تھی۔

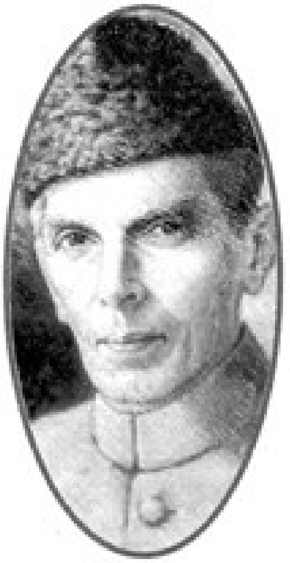

اپنے گھر میں محمد علی جناح اپنی سب سے چھوٹی بہن کے ساتھ رہتے تھے' جو عمر میں ان سے تقریباً 20 سال چھوٹی تھیں۔ مس فاطمہ جناح گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے لئے خدمت خلق کا راستہ پسند کیا تھا اور وہ ایک کامیاب ڈینٹل سرجن تھیں۔ انہوں نے بمبئی میں بہت عرصہ پریکٹس کی' لیکن اپنی بھاوج رتی جناح کی وفات کے بعد وہ اپنے بھائی محمد علی جناح کے پاس رہنے لگیں۔

وہ قائد کے آرام اور سہولت کا خیال رکھنے کے اہم کام کو سرانجام دیتی تھیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی لیکن ان کی تین بہنیں' سب کی سب پوتوں اور نواسوں والی تھیں' ان کا دوسرا بھائی احمد علی جناح جو جنگ سے پہلے ایک کامیاب تاجر تھا' اور جس کی تجارت یورپ'

امریکہ اور افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی، بمبئی میں مقیم تھا۔ اس کے بال بچے بعد ازاں سوئٹزرلینڈ چلے گئے تھے۔ وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سوئس زبان کا ماہر تھا۔ قد میں اپنے بھائی سے ذرا چھوٹا تھا اور ناک قدرے چپٹی تھی، لیکن اس کی چال ڈھال اور باتیں کرنے کا انداز اپنے بھائی سے بہت ملتے تھے۔

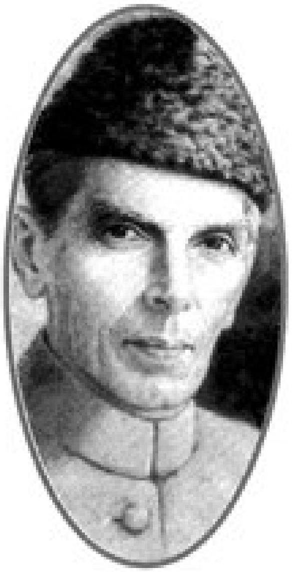

قائداعظم محمد علی جناح کا صحیح معنوں میں کوئی ذاتی دوست نہیں تھا۔ وہ سب کے قائداعظم تھے اور لوگ انہیں اپنا لیڈر اور ہیرو سمجھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ لاکھوں انسانوں میں انہیں دوست بنانے کی خواہش موجود ہو، لیکن دراصل محمد علی جناح ایک ایسے مقام پر تھے جہاں ہر شخص ان کی بزرگی اور بڑائی تسلیم کرنے پر اور ان کی عزت و توقیر کرنے پر مجبور تھا۔ ایک یا دو اشخاص ایسے تھے جو انہیں مائی ڈیئر جناح کہہ کر مخاطب کرتے تھے، لیکن یہ طرزِ تخاطب بھی صرف خطوط تک محدود تھا۔ ملاقات کے دوران انہیں بھی اتنا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ مسٹر جناح کے ساتھ بے تکلف ہو کر یا ایک دوست کی طرح گھل مل کر گفتگو کریں اور یہ محمد علی جناح کی چھا جانے والی شخصیت کا اثر تھا۔ آپ قائد کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے کمرے پر یہ دبلا پتلا انسان چھایا ہوا ہے۔ باتیں کرتے وقت ان کے لانبے ہاتھ اور پتلی پتلی انگلیاں جب اپنا مطلب واضح کرنے اور الفاظ پر زور دینے کیلئے حرکت کرتی تھیں تو سننے والا مبہوت ہو جاتا تھا۔ ان کا ایک ایک لفظ جو نہایت واضح اور صاف طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ ان کی گردن کی جنبش اور ان کی انگلیوں کی حرکات اور سب سے بڑھ کر ان کے سگار پینے کا انداز سب مل کر ان کی باتوں کو آپ کے دماغ اور دل کی گہرائیوں تک پہنچا دیتے تھے۔ ان کی تیز نگاہوں سے آپ کو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ آپ کو چیر کر نکل گئی ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھتے دیکھتے آپ کا ایکسرے کر لیتی تھیں اور آپ محسوس کرتے تھے کہ قائد میرے دل کی اندرونی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ نہایت ہی زود فہم تھے لیکن اس کے باوجود وہ ہر بات کا بار بار امتحان کرتے تھے، ہر معاملے کی گہرائی تک پہنچنے اور اس کے ہر پہلو کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور جب آخری بار ان کی رائے قائم ہو جاتی تو اس سے وہ نہیں ٹلتے تھے۔

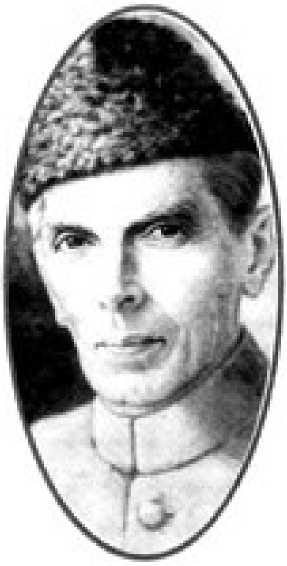

عوام کا جرنیل

قائد کی کچھ اور ذاتی باتیں۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے ایچ خورشید مرحوم کی تحریر' وہ لکھتے ہیں:

جناب محمد علی جناح کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی حیرت انگیز یادداشت تھی۔ اگر آج وہ ایک بیان پریس کو دیتے تو ہفتہ بھر بعد بھی انہیں وہ سارے کا سارا زبانی یاد ہوتا تھا۔ حالانکہ ایسا ہونا بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ محمد علی جناح کا طریق کار ہی ایسا تھا کہ وہ اپنے الفاظ کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بیان دیتے تو بقول خود ننانوے بار سوچ کر سویں بار الفاظ اپنی زبان سے نکالتے تھے۔ جس مضمون کے متعلق انہیں کہنا ہوتا وہ اس سے بالکل بھٹکتے نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں یاد رہتا تھا کہ میں نے فلاں موقع پر فلاں مسئلے کیلئے کون سا لفظ استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں مسلم سیاسیات کا جو نقشہ ان کے دماغ میں تھا اور جن لائنوں پر انہوں نے اپنی سیاست کو چلایا تھا اس سے ان کا ذہن ایک خاص سانچے میں ڈھل چکا تھا اور ان کی زبان سے ہمیشہ موزوں ترین الفاظ نکلتے تھے جن میں کسی تبدیلی یا بہتری کی

گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ تقریر کرتے وقت بھی عوام کے جوش و خروش سے وہ کبھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ آپے سے باہر ہوتے تھے نہ ہی توازن کو ہاتھ سے جانے دیتے تھے۔ سٹیج پر چڑھ کر زمین ان کے پاؤں تلے سے کبھی نہیں سرکتی تھی۔

ہندوستانی مقرروں میں سے جناب محمد علی جناح ہی ایسے تھے جن میں آپ کو یہ خصوصیت ملے گی بلکہ شاید اس دور میں دنیا بھر میں اس معاملے میں ان کا ہم پلہ کوئی نہ نکلے۔ اس کی ایک اور وجہ مسٹر جناح کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے قول کے پکے تھے' ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر کی لکیر تھی' جو مٹ نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بولنے سے پہلے بار بار جذبات سے مبرا ہو کر سوچتے تھے جس سے غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرنا ہوگا۔

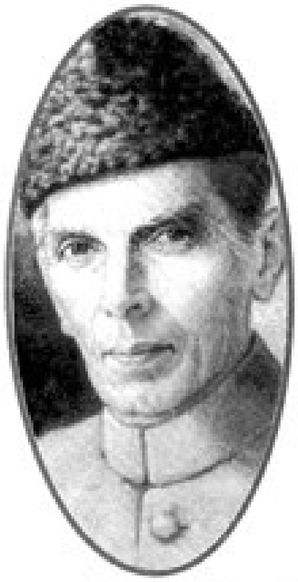

ایک بار کوئٹہ میں تقریر کرتے وقت قائد نے کہا تھا کہ "میں ڈرنے والا انسان نہیں ہوں جب وقت آئے گا اور جب میں یہ دیکھوں گا کہ اب اور کوئی آبرومندانہ طریق کار باقی نہیں رہا تو میں سب سے پہلے گولی کھانے کیلئے اپنا سینہ پیش کروں گا۔"

اس میں لفاظی ہرگز نہیں' یہ سٹیج کے کسی ایکٹر کے نہیں' محمد علی جناح کے الفاظ تھے' جنہیں انہوں نے ننانوے بار سوچ کر ادا کیا تھا۔ اگر ایسا کوئی موقع آتا تو قائد ایسا ہی کرتے اور واقعی گولی کھانے کیلئے اپنا سینہ پیش کر دیتے۔

مخالفین کی طرف سے قائد کی سیاسی روش پر دو اعتراض جو عام طور پر کئے جاتے ہیں' یہ ہیں۔

قائد جیل جانے سے پرہیز کرتے تھے اور انہوں نے کوئی قربانی نہیں دی۔

دوم یہ کہ اگر قائد نے پاکستان لینا تھا تو پہلے انگریز کو ہندو سے مل کر نکالتے' پھر ہندوؤں سے معاملہ طے کرتے۔ کانگریسی لیڈر اکثر دوسرا الزام دہراتے تھے۔

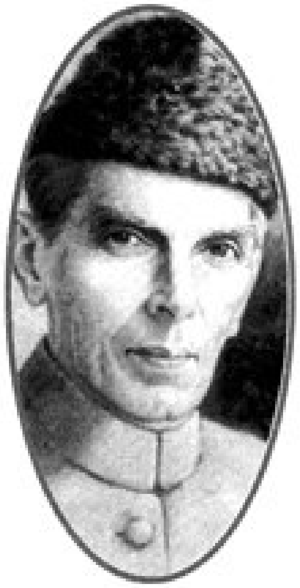

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح گولی کھانے کو تیار تھے' لیکن وہ جیل جانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ ایک غیر ملکی طاقت جب برسر اقتدار ہو' تو جیل جانا اکثر نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہاں اپنی قومی حکومت کے خلاف احتجاج اور ایجی ٹیشن کا مؤثر ذریعہ جیل ہے' بیرونی طاقت کا مقابلہ خود اپنے آپ کو بے بس اور محبوس کر دینے سے نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ نہایت پتے کی بات قائد نے خود مجھ سے کہی کہ "اگر میں جیل گیا بھی تو مجھے آغا خان کے کسی محل میں رکھا جائے گا۔ میرے سیکرٹری' میرا عملہ اور میرے ڈاکٹر میرے ساتھ ہوں گے۔ اخبارات اور ریڈیو اور دیگر ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہوں گی۔ اصل جیل تو عوام کیلئے ہے اور جب تک اس کی ضرورت نہیں بلاوجہ اور بے فائدہ عوام کو نقصان پہنچانا میری سیاست سے خارج بات ہے۔"

انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "میں آپ کا جرنیل ہوں۔ میرا کام آپ کو صرف لڑائی کی آگ میں جھونکنا ہی نہیں بلکہ اولین فرض ہے کہ میں پہلے آپ کو تربیت دوں۔ آپ کو اسلحہ اور سازوسامان مہیا کروں۔ آپ کی خوراک' وردیوں' سپلائی' ڈاکٹروں وغیرہ کا بندوبست کروں۔ آپ کو جنگی نقشہ سمجھاؤں' دشمن کی پوزیشن اور اس کی کمزوریوں سے آگاہ کروں' پھر میں آپ کو حملہ کرنے کا حکم دوں گا اور آپ جانتے ہیں کہ افسر تو افسر معمولی سپاہی کو بھی تربیت دینے کیلئے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔"

جناب کے ایچ خورشید کہتے ہیں:

"قائداعظم محمد علی جناح کی پالیسی کی توضیح ان سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی کہ یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں جو میں نے اپنے کانوں سے سنے۔"

جیل میں نہ جانے کے باوجود قائد نے قربانی دی اور پیشہ ور وکلاء نے اندازہ لگایا

ہے کہ اگر قائد دن میں صرف چار گھنٹے وکلاء اور بیرسٹروں کو قانونی مشورہ ہی دیتے تو اس مشورے کی فیس کے طور پر وہ سالانہ لاکھوں روپے وصول کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں امریکہ اور انگلستان کے مشہور ناشروں اور کمپنیوں کی طرف سے انہیں اپنی زندگی کے حالات لکھنے کی درجنوں پیشکشیں آچکی تھیں۔ قائد چاہتے تو لاکھوں روپیہ اس طرح کما سکتے تھے‘ لیکن انہوں نے ہر پیشکش کو رد کر دیا۔ قائد کا وقت ان کی قابلیت اور ان کی ساری زندگی قومی خدمت کیلئے وقف ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ ان کی صحت پر بھی زیادہ محنت کا برا اثر پڑا جو انہیں جان لیوا بیماری تک لے گیا۔

☆......☆......☆

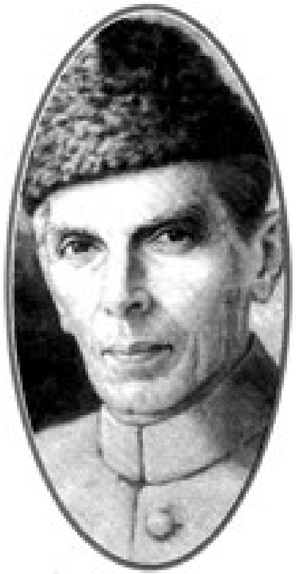

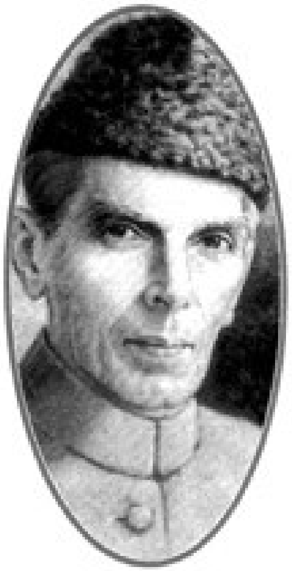

مصطفیٰ کمال اور لینن سے عظیم

قائد کی باتیں' پرائیویٹ سیکرٹری کے ایچ خورشید کی زبانی۔ جناب خورشید کہتے ہیں:

جھوٹے پراپیگنڈے اور سستی شہرت سے جناب محمد علی جناح کو بہت سخت نفرت تھی' اس کے ساتھ ہی ساتھ قائد یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ حقیقت کو دبایا یا چھپایا جائے یا سچی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔ ایک ہندو پریس رپورٹر نے ایک بار ان سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ قائد نے جواب دیا: "میرے عزیز نوجوان! پریس کا کام نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ایک امانت ہے جو تمہارے سپرد کی گئی ہے۔ اگر پریس والے اپنے پیشہ کا صحیح استعمال کریں تو وہ ملک اور قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔ تمہیں ہر کسی سے بے نیاز ہو کر اور بے خوف رہ کر اپنا فرض انجام دینا چاہئے۔ مجھے جھوٹے پراپیگنڈے سے سخت نفرت ہے۔ تم میرے متعلق اور مسلم لیگ کے متعلق جو دیکھو' وہی لکھو اور یہی تمہارا اصول ہونا چاہئے۔"

مستقبل میں کیا ہونے والا ہے' کس اقدام کا رد عمل کیا ہو گا اور کتنا گہرا اور دیرپا ہو گا۔ جناب محمد علی جناح کی دور بینی مسلمہ تھی۔ وہ ہر بات کا تخمینہ ایسے درست پیرائے میں کرتے

کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ شملہ کانفرنس کے ٹوٹنے کے دو ہی روز بعد انہوں نے مسلمانوں سے کہا ''وہ خبر دار ہو جائیں کیونکہ الیکشن اچانک تم پر ٹھونس دیئے جائیں گے اور تمہیں آج ہی سے ان کیلئے تیار ہو جانا چاہئے۔''

اس بیان کے ایک ہی ماہ کے اندر برطانوی حکومت نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا' جس سے کانگریسی حلقے بھناگئے اور ان کی عقل چکر میں پڑ گئی۔ سر جگدیش پرشاد اور مسٹر جیکر اور لیڈروں نے تو ایک مشترکہ بیان میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان پر حکومت لارڈ ویول کرتے ہیں یا مسٹر جناح۔'' آخر انہیں الیکشن کا پیشگی پتہ کیسے چل گیا حالانکہ یہ محض قائد کی فہم و دانش تھی کہ انہوں نے اندازہ کیا کہ اب عوام کے پاس جانے کے سوا حکومت کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

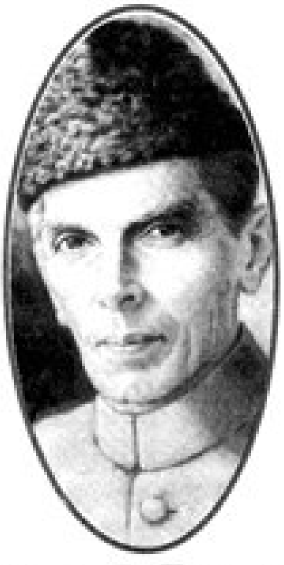

قائد کو سیاستدانی نہرو کی طرح والدین سے ترکے کی صورت میں نہیں ملی تھی کہ وہ اچھل کر لیڈری اور بڑائی اور شہرت کے سنگھاسن پر بیٹھ گئے ہوں۔ قائد نے مسلسل محنت کی اور سیاست کو سیکھا اور سمجھا۔ البتہ انہیں سیاسیات میں اپنی قانون دانی سے بہت مدد ملی۔ انہوں نے اسمبلی میں جا کر بھی بہت فائدہ اٹھایا۔ سیاست تو دراصل ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور وہ اس کے داؤ پیچ اور ہر ٹیکنیک سے بخوبی واقف تھے۔

قائد اپنی زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ (سوائے ایک بار جب وہ نیشنلسٹ تھے اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی) صوبہ سندھ کو بمبئی سے الگ کروایا یا سندھ بمبئی سے الگ کیا گیا تو یہ قائد کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سرحد کو اصلاحات ملیں تو یہ بھی قائد کی محنت کا پھل تھا اور پھر بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کا وعدہ قائد اور مسلم لیگ ہی کی کوششوں سے ہوا۔

قائد کو مرعوب کرنے اور اپنے راستے سے ہٹانے کی کیا کیا کوشش نہیں کی گئی۔ کونسا

جشن تھا جو ہندوؤں نے نہ کیا ہو۔ جھوٹ کے طومار' غلط بیانوں کے پلندے اور بے بنیاد الزامات۔ مخالفین کی طرف سے آج اگر غدار اعظم کہا گیا تو کل اسی غدار اعظم کو ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کی گئی۔ پھر اسی ہونے والے وزیر اعظم کو دشمن نمبر ایک قرار دیکر کورٹ مارشل کی دھمکی بھی دی گئی۔ ہندوستان کے غریبوں کا خون چوس کر برلا سیٹھ کا کمایا ہوا دھن مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے بے اندازہ خرچ کیا گیا۔ قائد کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق الف لیلیٰ کے افسانے تراشے گئے' لیکن یہ سب مل کر بھی ہمارے عظیم قائد کو اپنے راستے سے نہ ہٹا سکے' انہیں اپنی سچائی' نصب العین کی درستی اور اپنی قوم کی وفاداری پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا' انہیں اس وقت بھی مرعوب نہیں کیا جا سکا' جب وہ تنہا تھے' بعد میں تو وہ پوری قوم کے لیڈر تھے۔

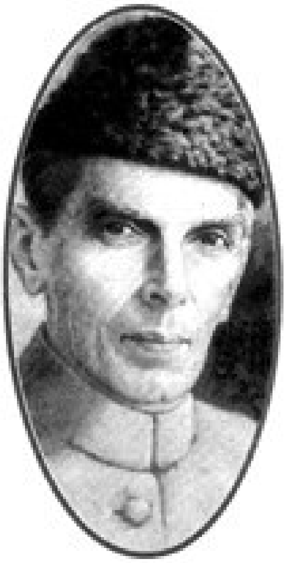

وہ ایک پُرعمل سیاستدان تھے اور ایک دیدہ ور' دلیر' باہمت' تجربہ کار اور مستقل مزاج جرنیل۔

جناب خورشید لکھتے ہیں: محمد علی جناح ایسے لوگ تاریخ نے کم ہی پیدا کیے ہیں۔ ایک عیسائی لیڈر نے مسٹر جناح کو لینن اور کمال اتاترک کی صف میں شمار کیا۔ حالانکہ مسٹر جناح کا کام لینن اور اتاترک دونوں سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھا۔ لینن کا مقابلہ اپنی حکومت سے تھا۔ روس پر روسیوں ہی کی حکومت تھی' اور لینن نے روسی حکام اور فوجی افسروں کے جذبات کا کافی فائدہ اٹھایا۔ مصطفیٰ کمال خود ایک جرنیل تھا اور فوج کی اکثریت اس کی حامی تھی۔ لینن اور کمال نے اس وقت زور پکڑا جب گزشتہ جنگ عظیم میں روس اور ترکی کی حکومتیں شکست کھا چکی تھیں۔ عوام میں ان حکومتوں کا وقار ختم ہو چکا تھا اور روس اور ترکی کی حکومتوں کی بد انتظامی اور عاقبت نا اندیش طریق کار سے عوام سخت بدظن ہو چکے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ روسی ایک قوم تھے اور ترک بھی ایک قوم اور دنیا ان کی قومیت کو تسلیم کرتی تھی۔

قائداعظم محمد علی جناح کا ماحول ان دونوں لیڈروں کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ انہیں نہ صرف ایک بیرونی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا بلکہ 20 کروڑ ہندوؤں کا بھی۔ یہ تعداد اور سرمایہ کے لحاظ سے مسلمانوں سے بہت بہتر پوزیشن میں تھے۔ قائد نے بھیڑوں کے ایک گروہ کو قوم بنایا۔ انہوں نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کیلئے کرۂ ارض پر ایک جگہ پیدا کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو نئی زندگی بخشی اور یہ بات عیاں ہے کہ یہ کام کمال اور لینن کے کام سے مشکل تر تھا۔

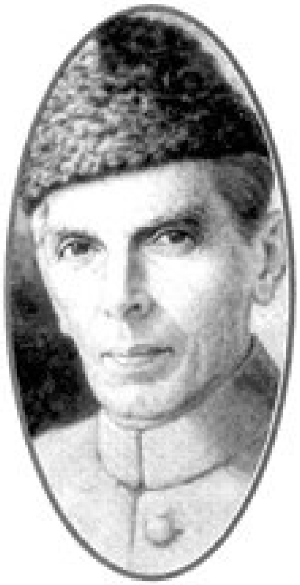

☆......☆......☆

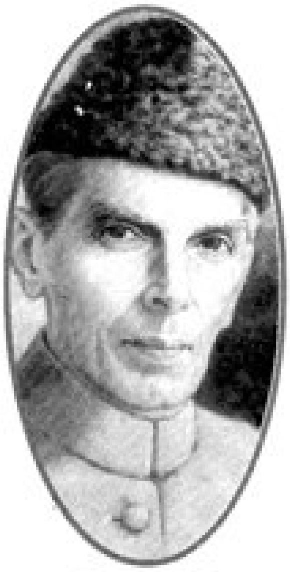

آئین پرست نہیں باغی

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید نے اپنی یادداشتوں میں بانیٔ پاکستان کی شخصیت کا ایک نیا پہلو روشناس کرایا ہے۔ وہ انہیں باغی قرار دیتے ہیں۔ آگے دیکھیں خورشید صاحب کیا لکھتے ہیں:

لوگ اکثر قائداعظم محمد علی جناح کو آئین پرست کہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی سیاسی زندگی ایک امن پسند کی حیثیت سے گزری، لیکن سیاسی مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہوا رویہ ان کی طبیعت کے قدرتی میلان کو بنیادی طور پر جذب نہ کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ قائد فطرتاً ایک باغی تھے۔ ہاں! باغی!!

انہوں نے بغاوت کی، بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے پے در پے بغاوتیں کیں۔ ابتدا میں آبائی پیشے اور خاندانی روایات سے، پھر اپنی غربت کے خلاف، پھر سیاسی میدان میں کانگریس سے اور بعدازاں غیر ملکی حکومت کے خلاف۔

مخالف انہیں ضدی کہتے تھے۔ ہندوؤں نے ہٹ دھرم نام رکھ چھوڑا تھا، پر مسلمانوں

نے انہیں اپنا ہیرو کہا۔ شاید اس لئے کہ قائد ایک باغی تھے اور مسلمان فطرتاً بغاوت پسند اور انقلاب وہنگامہ پرور ہوتا ہے۔ قائد کی مسلسل بغاوتوں نے مسلمانوں کو گرویدہ بنالیا' انہوں نے دور غلامی میں برسوں کے قائم کیے ہوئے طور طریقوں کے خلاف بغاوت کی۔ انہوں نے ہندوستانی وحدت کے بت کو للکارااور تاج برطانیہ کے اس درخشاں ہیرے کو جوش بغاوت سے پاش پاش کر دیا۔ انہوں نے تاریخ کے تموج اور جغرافیہ کے جمود سے بغاوت کی۔ انہوں نے قومیت کے قائم کیے ہوئے فرسودہ معیار کا تاروپود بکھیر کر رکھ دیا اور وطنیت کی دیوی اپنی رعنائیوں کی دلبربا کشش کے باوجود اس سرکشی کو مسحور نہ کر سکی۔

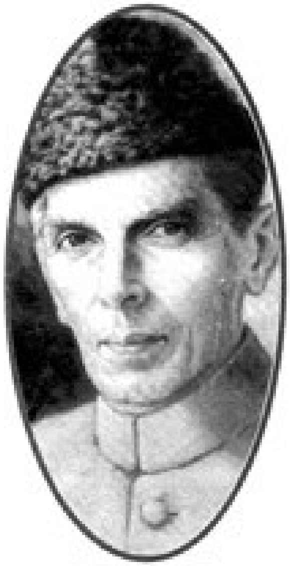

قائد فرانس جارہے تھے' وہ جوان تھے' جذبہ بغاوت شباب پر تھا۔ ساحل فرانس پر اترنے کے بعد انہیں کسٹم کی چوکی پر روک لیا گیا۔ غالباً تلاشی ہوئی' کچھ سگریٹ ملے جن کا محصول طلب ہوا۔

"میں ان سگریٹوں کا محصول نہیں دوں گا" باغی بولا۔

"آپ کو دینا ہی ہوگا۔"

"اور اگر میں نے نہ دیا تو؟"

"تو آپ یہاں سے آگے نہیں جاسکتے۔"

"میں ضرور جاؤں گا"۔ باغی نے ضد کی۔

"مگر کسٹم دیئے بغیر نہیں۔"

"اچھا' تو دیکھو" اور یہ کہہ کر قائد نے اپنے سگریٹ کیس میں سے سب سگریٹ نکال کر پھینک دیئے اور کہا: "اب میرے پاس سگریٹ نہیں ہیں' محصول کیسا۔"

کسٹم کا عہدیدار خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔

آپ آج انگلستان جائیں تو آپ کو تقریباً ہر جدید مکان میں جدید آسائش میسر آئے

گی۔ سردیوں میں گرم پانی بلکہ سارے کا سارا مکان گرم کرنے کا اعلیٰ برقی انتظام ہوگا مگر جب محمد علی جناح وارد انگلستان ہوئے‘ ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ تھا۔ آرام و آسائش کا سامان تعیش میں داخل تھا۔ غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ مہینوں نہیں نہاتے تھے۔ بہت زیادہ ہوا تو قمیص کا کالر اور کف بدل لئے۔

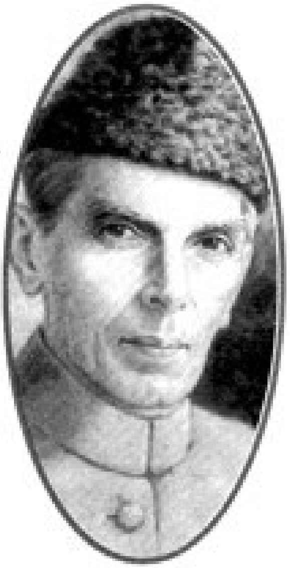

پندرہ سولہ برس کا سن بھی کیا ہوتا ہے۔ باغی بچہ سپاہی تھا۔ سردیوں کا موسم تھا‘ ان کی مالکہ مکان جاڑے میں صحت کے متعلق رواج کے مطابق کچھ نصیحت فرمانے لگیں۔

باغی نے کہا: ”میں تو روز ہی نہاؤں گا۔“

”لیکن تمہیں گرم پانی تو نہیں مل سکتا۔“

”نہ سہی‘ میں ٹھنڈے پانی سے ہی نہاؤں گا۔“

جب دوسرے روز صبح غسل خانے میں داخل ہوئے تو رات کو سردی کی شدت سے ٹب کا پانی سطح پر سے ہلکا سا جم چکا تھا!

باغی نے ایک مکا مار کر کہر کی تہہ کو توڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے ٹب میں کود پڑا۔ یہ واقعہ خود انہوں نے مجھے سنایا تھا جب میں ان کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔

انگلستان سے فارغ التحصیل ہو کر لوٹے تو والد کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا۔ مالی پریشانیاں خاندان کو گھیرے ہوئے تھیں۔ سارے کنبے کا بوجھ نوجوان محمد علی جناح کے کاندھوں پر آن پڑا۔

حالات کا تقاضا اور والدین کا اصرار تھا کہ نوکری کر لو‘ پانچ چھ سو روپے ماہوار سے ایک متوسط گھرانے کی بخوبی گزر ہو جاتی۔ والد معمر ہو چکے تھے‘ چار بہنیں اور بوڑھی والدہ اور ایک چھوٹا بھائی‘ سب کی نظریں محمد علی پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ لیکن قائد نے اس زبوں حالی کے آگے سر نہیں جھکایا ”میں روزانہ پیدل عدالت جایا کرتا تھا۔“ محمد علی جناح نے ایک بار بتایا ”اتفاق سے کبھی دیر ہو جاتی تو مجھے سواری لینے کا خیال آتا‘ لیکن ایک انی ٹرام پر

خرچ کرنے سے پہلے ننانوے بار سوچتا اور آخری فیصلہ یہی ہوتا کہ یہ ایک آنہ بھی پس انداز کرنا ہی مناسب ہوگا۔"

ایک اور واقعہ۔

ابھی محمد علی جناح کی عمر سات آٹھ برس کی ہی تھی کہ انہیں اپنے والد کے ساتھ ایک عدالت میں جانے کا موقع ملا۔ احاطہ عدالت میں ان کی نظر ایک بیرسٹر پر پڑی جو اپنا سیاہ گون پہنے گھوم رہا تھا۔ ننھے باغی نے اپنے والد کا دامن پکڑ لیا۔

"ابا یہ کون ہے؟"

"بیرسٹر"......باپ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کرتا ہے۔"

"یہ لوگوں کے مقدمے لڑتا ہے۔"

"تو میں بھی بیرسٹر ہی بنوں گا اور لوگوں کیلئے لڑوں گا۔"

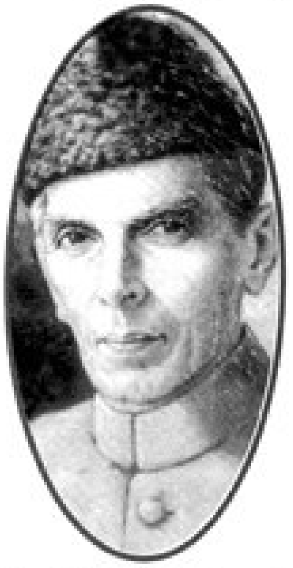

کہتے ہیں کہ ان کے والد نے جو انہیں اپنے بزنس میں شریک کرنا چاہتے تھے، بیٹے کی ضد اور دوستوں کے مشورہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا اور قائد کو انگلستان جانے کی اجازت مل گئی۔

دوران طالبعلمی وطن سے ہزاروں میل دور باغی کو اپنے ملک پر بہت ناز تھا۔ وہ اکثر انگریز ہم جماعتوں اور دیگر طلبہ سے الجھ پڑتے۔ ان کی آزاد پسندی انہیں ہر ہندوستانی رہنما کے قریب لے جاتی۔

انہی دنوں کی بات ہے، دادا بھائی نوروجی برطانوی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ مخالفین نے جہاں اور ذرائع استعمال کئے وہاں انہیں "کالا آدمی" کا طعنہ بھی دیا گیا، لیکن اتفاق ہے کہ دادا بھائی رنگ کے سرخ و سفید تھے۔ محمد علی جناح اور ان کے ساتھی بڑے اصرار سے انگریز ووٹروں کو دادا بھائی کے پاس لے جاتے اور پھر پوچھتے۔

"کیوں 'کیا' یہ "کالا آدمی" ہے؟"

یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور دادا بھائی الیکشن جیت گئے۔ دادا بھائی نے بعد میں نوجوان جناح کے خلوص سے اور قابلیت سے متاثر ہو کر انہیں اپنا اعزازی سیکرٹری مقرر کر لیا۔ ہوم رول لیگ میں انہوں نے جو ایجی ٹیشن بمبئی میں جاری رکھی اور جس طرح کامیابی کے ساتھ کانگریس کو پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کیا...... یہ جنگیں سب کو یاد رہیں گی۔

کیا یہ باتیں ظاہر نہیں کرتیں کہ قائداعظم واقعی ایک باغی تھے' ایسے باغی جنہوں نے ظلم کی ہر شکل کے خلاف بغاوت کی۔

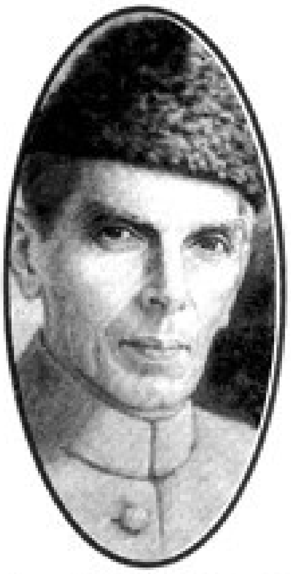

☆......☆......☆

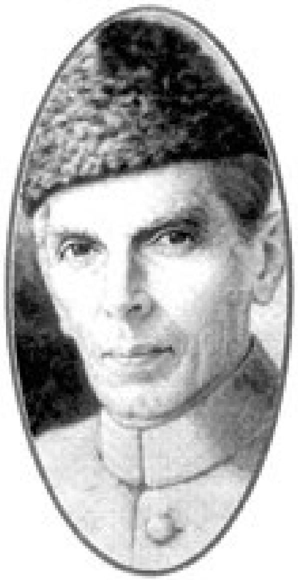

قائداعظم ایف سی کالج کی طرف سے دیے گئے استقبالیے میں طلبا کے ہمراہ (30مارچ 1944ء)

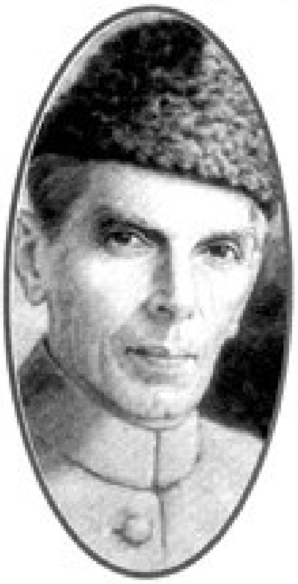

دہلی کا آخری دیدار

قیام پاکستان کے بعد بانی پاکستان کی کراچی آمد کا تذکرہ "کتاب محمد علی جناح" سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کریں:

"7 اگست 1947ء کو محمد علی جناح نے دہلی کو الوداع کہا اور پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کیلئے کراچی روانہ ہوگئے۔

کانگریس نے نئے ہند کی گورنر جنرلی کیلئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نامزد کیا تھا اور وائسرائے کے عملے کے کئی ارکان کو یہ توقع تھی کہ مسلم لیگ بھی پاکستان کا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بنائے گی۔ لیکن لیگ کی طرف سے ایسی کوئی تحریک نہ ہوئی۔ لارڈ ازمے نے لیاقت علی خاں سے اصرار کیا کہ مسلم لیگ کو بھی اس ضمن میں کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔ انہیں جواب ملا کہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ چند دن بعد قائداعظم نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کا اصرار ہے کہ وہ خود (یعنی قائد) پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں۔ لیگ کے اس فیصلے کا تذکرہ ان دنوں وائسرائے کی ایک پریس کانفرنس میں ہوا۔

کانفرنس میں "اسٹیٹس مین" کے ایڈیٹر مسٹر این اسٹیفنز بھی شریک تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب HORNED MOON میں لکھا ہے کہ اس موقع پر ماؤنٹ بیٹن کے رویے کے بعض پہلو تشویش انگیز تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن بہت خود پسند ہیں، انہیں جب مسٹر جناح کے فیصلے کی خبر ملی تو غالباً ان کے جذبہ خود پسندی کو ٹھیس لگی۔ لیکن ہم میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ وائسرائے کا یہ رد عمل بے جا ہے، کیونکہ ان حالات میں لائق سے لائق شخص بھی کامیابی سے دونوں ملکوں کی سربراہی کے فرائض بیک وقت انجام نہ دے سکتا۔"

ماؤنٹ بیٹن کے عملے کا خیال کچھ اور تھا۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ مسٹر جناح خود وزیراعظم بننا زیادہ پسند کریں گے کیونکہ اقتدار دراصل وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور گورنر جنرل عملاً اس کے مشورے کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ قائد کی صحت بہت گر چکی ہے اور ایک مہلک مرض کا اثر بہت تیزی سے ان کے ناتواں جسم میں پھیل رہا ہے۔ قائد نے غالباً اسی لئے گورنر جنرل بننا پسند کیا کہ وہ اب حکومت کی انتظامی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھے۔ اس محنت طلب کام کیلئے انہوں نے اپنے نائب اور دست راست لیاقت علی خاں کا انتخاب کیا، جو تندرست تھے اور ان کی بہ نسبت جوان تھے۔

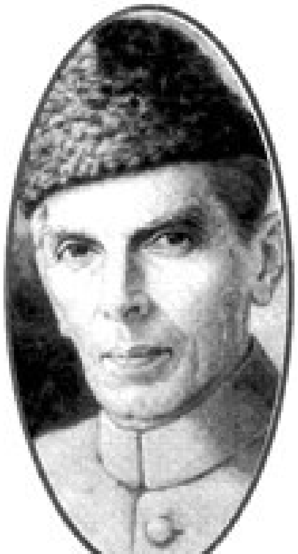

دہلی سے کراچی کا سفر مسٹر جناح نے وائسرائے کے ذاتی ڈیکوٹا ہوائی جہاز میں کیا۔ ان کے ہمراہ ان کی ہمشیرہ کے علاوہ ان کے نیول اے ڈی سی سید محمد احسن اور فضائی اے ڈی سی فلائٹ لیفٹیننٹ عطا ربانی بھی تھے۔ اس سے چند دن پہلے ربانی ریل میں دہلی کی طرف جا رہے تھے کہ اخبار میں انہوں نے مسٹر جناح کے سفر کراچی کی تیاریوں کا حال پڑھا۔ اسے پڑھتے پڑھتے ان کے دل میں خیال آیا کہ اگر اس تاریخی سفر میں وہ اپنے قومی رہنما کی خدمت میں ہوں تو یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہو گی۔ دہلی پہنچتے ہی ان کی دلی مراد بر آئی۔ لیاقت علی خاں نے خود انہیں بلوا کر پوچھا کہ کیا وہ قائداعظم کے اے ڈی سی کا عہدہ قبول کریں گے؟ ربانی نے جواب دیا:

”اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔“

لیاقت علی خاں نے کہا:

”آپ جا کر قائداعظم سے مل لیجئے‘ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

ملاقات کے بعد قائد نے کہا:

”بہت خوب‘ اب آپ جا کر لیاقت سے کہہ دیجئے کہ انہوں نے انتخاب ٹھیک کیا ہے۔“

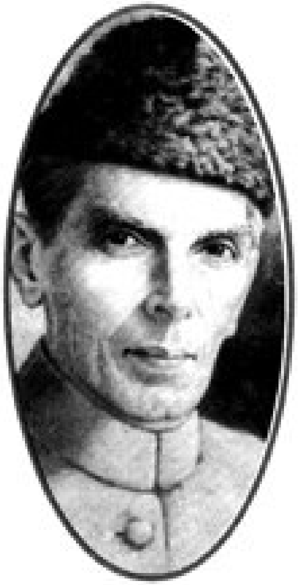

قائد نے اپنے اعلیٰ درجے کے انگریزی کپڑے بند کروا دیئے تھے۔ دہلی سے روانگی کے وقت انہوں نے ایک نئی سفید شیروانی زیب تن کی۔ جب وہ موٹر سے اتر کر طیارے تک گئے تو ان کے ساتھ ان کی ہمشیرہ اور ان کا مختصر سا قافلہ تھا۔ ربانی کے ہاتھ میں بید کی ٹوکری تھی جو کاغذات سے بھری ہوئی تھی۔ ایک ملازم کے پاس اخباروں کا بنڈل تھا جو قائداعظم راستے میں پڑھنے کیلئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں قدم رکھتے ہوئے قائد نے مڑ کر اس شہر پر آخری نظر ڈالی جہاں انہوں نے پاکستان کی آزادی کی لڑائی لڑی اور جیتی تھی‘ پھر کہا:

”میرا خیال ہے کہ میرے لئے یہ دہلی کا آخری دیدار ہے۔ اور جب ہوائی جہاز کے پہیے اڈے کے میدان پر سے اٹھنے لگے تو قائد نے کہا: ”آج سارا قصہ ختم ہو گیا۔“

☆......☆......☆

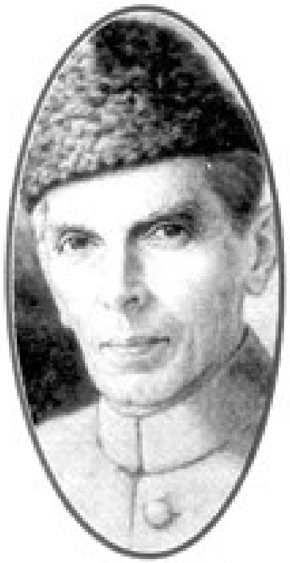

قائداعظم کی کراچی کے ہوائی اڈے پر آمد۔

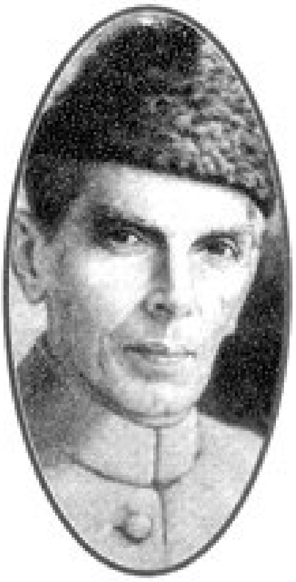

پاکستان کی طرف پہلا سفر

بانیٔ پاکستان کی پہلی مرتبہ بطور گورنر جنرل کراچی آمد کا تذکرہ۔ کتاب کا نام ہے محمد علی جناح۔ مصنف لکھتا ہے:

"دوپہر کا کھانا مسٹر جناح نے ہوائی جہاز میں کھایا اور پھر اخبار پڑھنے لگے۔ ان کے دونوں اے ڈی سی ان کی باضابطہ اخبار بینی کی عادت سے واقف نہ تھے۔ آج پہلی دفعہ انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم نے سلیقے سے ایک ایک اخبار اس انبار سے اٹھایا جو ان کے بائیں ہاتھ پر رکھا تھا، پڑھنے کے بعد اسے پھر دُہرا کیا اور داہنے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس طرح بائیں طرف کا انبار رفتہ رفتہ داہنی طرف منتقل ہو گیا۔ ان کے دونوں اے ڈی سی آپس میں ان کے سلیقے اور باضابطگی پر رائے زنی کرتے رہے۔ اس دن کے اخبار مسٹر جناح کی کارکردگی اور کامیابی کے تذکرے سے پُر تھے۔ انہیں پڑھ کر قائد کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے ہوں گے ان کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ دوران سفر میں جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کا کہنا ہے کہ قائد کے جذبات کا کوئی اثر ان کے بشرے پر ظاہر نہ ہوا۔ چار گھنٹے کے اس سفر میں انہوں نے صرف ایک مرتبہ لب کشائی کی۔

چند اخبار اٹھا کر انہوں نے ربانی کی طرف بڑھائے اور کہا: ''آپ یہ اخبار پڑھیں گے'' اس کے بعد ختم سفر تک وہ بالکل خاموش رہے۔

جہاز جب کراچی کے قریب پہنچا تو قائداعظم نے نیچے نظر ڈالی اور دیکھا کہ ہزاروں آدمی ان کے استقبال کو تیار کھڑے ہیں۔ یہ اس قوم کے فرد تھے جنہیں ابھی ابھی قائد نے سیاسی غلامی اور معاشی زبردستی سے نجات دلائی تھی۔ اس مجمعے میں اکثر افراد سفید کپڑے پہنے تھے اور ہوائی جہاز میں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ نیچے ایک وسیع برفیلا میدان ہے۔ ان دنوں کراچی کی ہر سڑک پر مہاجروں اور پناہ گزینوں کے قافلے دکھائی دیتے تھے۔ جو تھوڑا بہت اثاثہ وہ ہندوستان سے بچا کر ساتھ لا سکے تھے' وہ چھوٹی چھوٹی گاڑیوں پر لدا ہوتا تھا۔ قائد کا خیر مقدم کرنے والوں میں بھی بہت بڑی تعداد ان مہاجروں کی تھی۔ اس دن انہیں جہاں کہیں پانی کا نل نظر آیا اس میں انہوں نے اپنے کپڑے دھو ڈالے۔ پھر دھوپ میں انہیں سکھایا اور پہن کر ہوائی اڈے کا رخ کیا۔ قائداعظم کے ایک اے ڈی سی کا کہنا ہے کہ ''جب قائداعظم نے نیچے نظر ڈالی اور مشتاقان دیدار کا ہجوم دیکھا تو یکایک ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور یوں معلوم ہوا کہ وہ دوبارہ جوان ہو گئے ہیں۔''

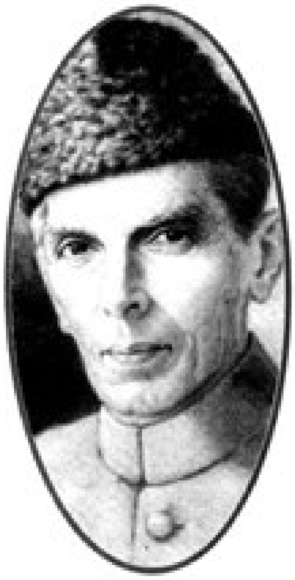

ہوائی جہاز ٹھہرا تو سب سے پہلے قائد اس میں سے اترے' ان کی ہمشیرہ ان کے پیچھے تھیں۔ لوگوں نے ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے بلند کئے اور دیوانہ وار آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے' تاکہ وہ اپنے رہنما اور مسیحا کو جی بھر کر دیکھ سکیں۔

قائد کے چہرے پر اس وقت بھی ان کی مخصوص مستقل مزاجی اور تنہائی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے کاغذوں کا ایک صندوق اپنے نیول اے ڈی سی کے سپرد کرتے ہوئے تاکید کی کہ اسے بہت احتیاط سے رکھیں' پھر انہوں نے مسلم لیگ کے لیڈروں سے مصافحہ کیا جو ان کے قریب کھڑے تھے۔ قائداعظم جب ان کے سامنے سے گزرے تو ان میں سے کئی ایک رو پڑے۔

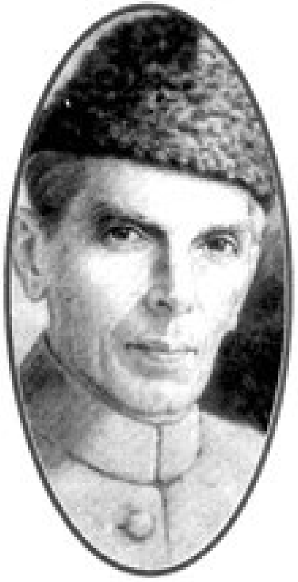

ہوائی اڈے سے اندرون شہر تک لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا اور اس بھیڑ کو چیر کر قائداعظم کی سواری کیلئے راستہ صاف کیا گیا۔ قدم قدم پر لوگوں نے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے بلند کئے۔ ہاں راستے میں ایک مقام البتہ ایسا آیا جہاں نہ نعرے سنائی دیئے نہ جوش و خروش کا کوئی مظاہرہ دکھائی دیا۔ یہاں بھی لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر کھڑے ہو کر قائداعظم کی سواری دیکھ رہے تھے' لیکن وہ خاموش تھے اور مغموم و متفکر معلوم ہوتے تھے۔ قائد نے جب اس کی وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ یہ ہندوؤں کا علاقہ ہے۔ پاکستان کے ان شہریوں کیلئے یہ خوشی کا دن نہ تھا۔ قائد نے کہا ہم ان لوگوں کیلئے پاکستان میں امن اور سلامتی کا اہتمام کریں گے۔

جس ہجوم نے کراچی میں قائد کا استقبال کیا' اس میں ایک بزرگ خاتون فاطمہ بائی بھی تھیں' جو قائد کے لڑکپن کے زمانے میں انہیں رات میں زیادہ دیر تک پڑھنے پر ڈانٹا کرتی تھیں۔ اسی ہجوم میں نانجی جعفر بھی تھے' جن کے ساتھ کبھی قائد گلیوں میں گولیاں کھیلا کرتے تھے اور جنہیں انہوں نے کرکٹ کھیلنا سکھایا تھا۔

☆......☆......☆

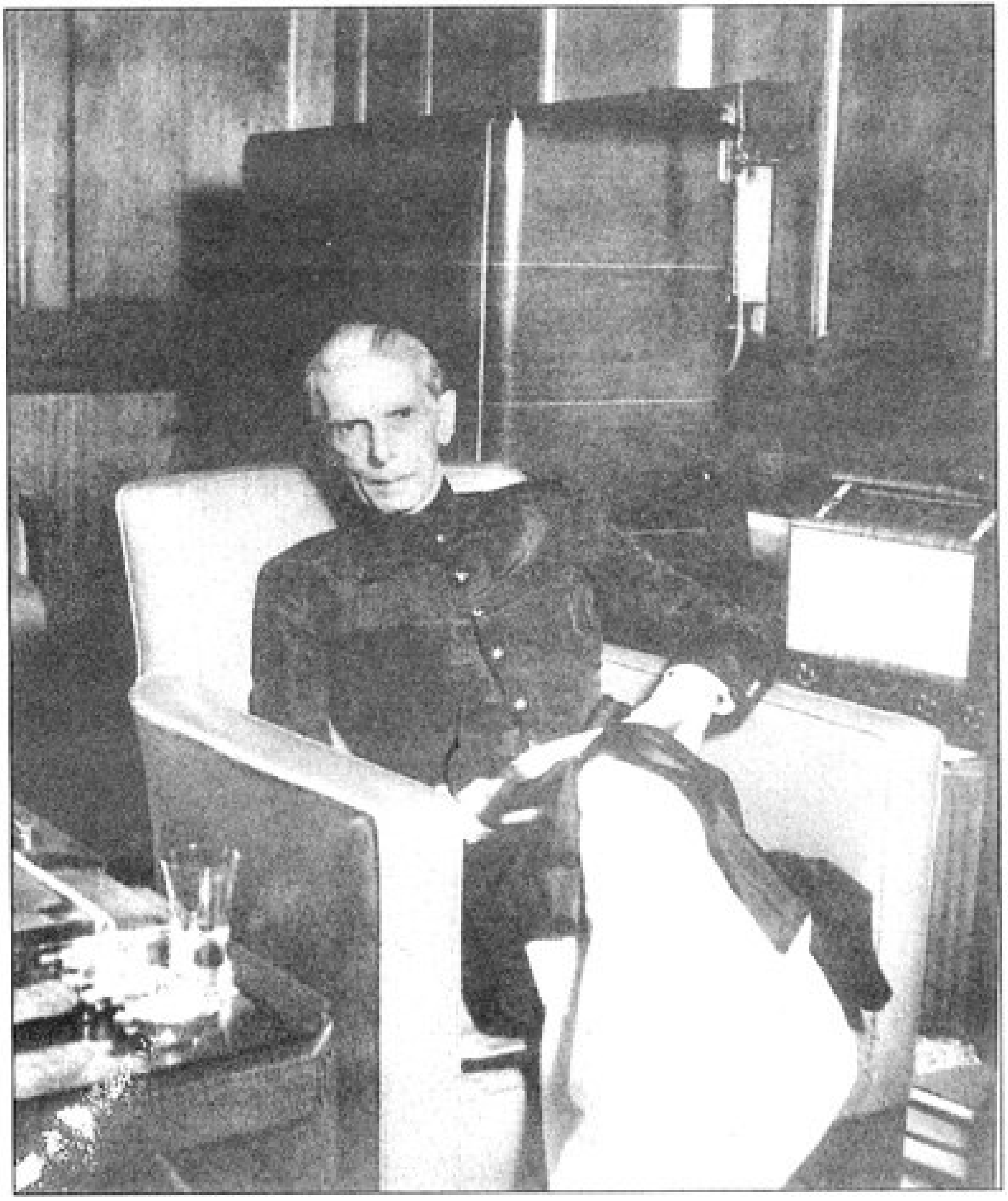

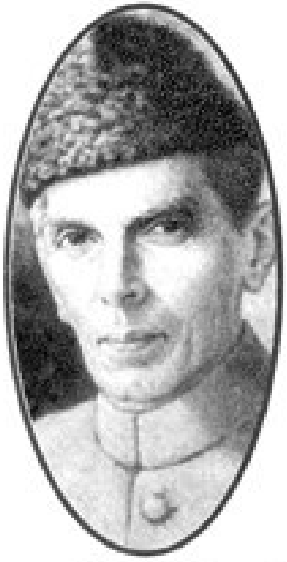

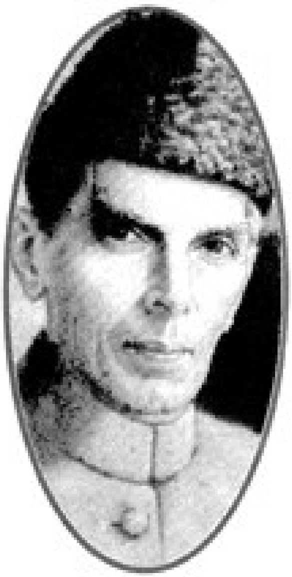

کام چوروں سے نفرت

قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں کا تذکرہ جاری ہے۔

شروع میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لڑکپن کے دنوں میں مسٹر جناح نے جو ابھی قائداعظم نہیں بنے تھے' اپنے دوست نانجی جعفر کو یہ نصیحت کی تھی کہ تم گولیوں کے بجائے کرکٹ کھیلا کرو تاکہ تمہارے ہاتھ اور کپڑے گندے نہ ہوں۔ اس نصیحت پر قائد نے خود ساری عمر عمل کیا۔ انہوں نے ہمیشہ گرد اور گندگی سے پرہیز کیا اور نجی اور سیاسی زندگی میں ان کا دامن بالکل بے داغ رہا۔ فاطمہ بائی اور نانجی جعفر اسی قوم کے دو فرد تھے جسے قائداعظم محمد علی جناح نے آزاد کرایا تھا' لیکن وہ غیر معروف اور گمنام تھے اور کون جانتا تھا کہ قوم کے رہبر اعظم سے ان کا کتنا قریبی تعلق رہ چکا ہے۔ پرجوش عوام کے اس بحر مواج میں وہ دو قطروں کی طرح کھو گئے اور دور ہی سے اپنے عزیز اور قوم کے مسیحا کا دیدار کر سکے۔

گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر جب قائداعظم اس کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے تو انہوں نے اپنے نیول اے ڈی سی احسن سے کہا "شاید تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ مجھے کبھی یہ امید نہ تھی کہ

پاکستان میری زندگی میں قائم ہو جائے گا۔ ہم نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے' اس پر ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔"

استقبال کے بعد ہزاروں مسلمانوں نے بجائے گھر واپس جانے کے گورنمنٹ ہاؤس کا رخ کیا اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ رات گئے تک وہاں رہے۔

قائداعظم نے اپنی نئی قیام گاہ میں پہنچ کر ایک اے ڈی سی کو ساتھ لیا اور پھر سارے گھر کا معائنہ کیا۔ چند دن پہلے تک اس گورنمنٹ ہاؤس میں صوبہ سندھ کا گورنر رہا کرتا تھا۔ قائداعظم نے مکان کا ایک ایک کمرہ دیکھا اور اے ڈی سی کو بتاتے رہے کہ گھر کا کونسا حصہ کس مصرف کیلئے استعمال کیا جائے گا۔ ایک حصے کے متعلق انہوں نے کہا "یہ حصہ صرف میرے اور مس جناح کیلئے مخصوص ہو گا۔" پھر چند اور کمروں کو دیکھ کر کہا: "یہ دو کمرے بہت بڑے بڑے مہمانوں کیلئے مخصوص ہونگے۔ میں نہیں چاہتا کہ صوبوں کے گورنر یا وزراء یہاں ٹھہریں۔ ان کمروں میں صرف دنیا کی اہم ترین ہستیاں قیام کریں گی۔ مثلاً شاہ ایران یا شاہ برطانیہ۔"

جب دن ڈھلنے لگا تو قائد مستقبل کے منصوبے چھوڑ کر حال کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے عملے کے ایک رکن کو حکم دیا کہ ایک ریڈیو سیٹ فوراً وہاں لگوادے تاکہ وہ شام کی خبریں سن سکیں۔ یہ افسر نیا تھا اور ابھی اپنے آقا کے مزاج و عادات سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اس نے کہا: "جناب عالی' اب آپ تھک گئے ہیں اور اگر اجازت ہو تو یہ کام صبح تک ملتوی رکھا جائے۔" اس پر جناح نے فوراً جواب دیا کہ "یہ ٹال مٹول میرے ساتھ ہرگز نہ چلے گی۔"

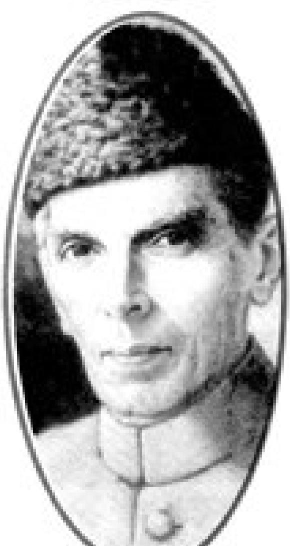

قیام پاکستان کے شروع کے دنوں میں نئی حکومت کے عہدیداروں' افسروں اور اہلکاروں کو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری دفتروں میں میز کرسیاں اور کاغذ پنسلیں بھی برائے نام تھیں۔ ان حالات میں ایک نئی مرکزی حکومت کا قیام اور نظم و نسق کے تمام

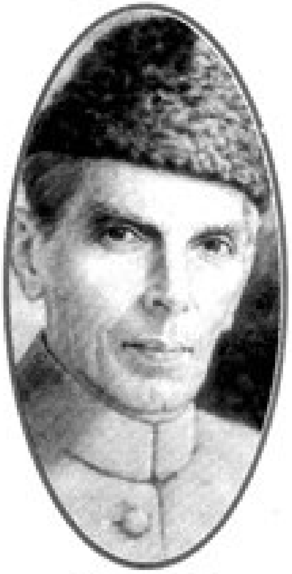

ضروری سازوسامان اور لوازمات کی فراہمی بڑا کٹھن اور ہمت شکن کام تھا‘لیکن جن لوگوں کے کندھوں پر اس زبردست ذمہ داری کا بوجھ تھا وہ بھی غضب کے کام کرنے والے تھے اور ان کا جوش جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے دیکھتے دیکھتے دفتروں کو ضروری سازوسامان سے آراستہ کیا اور ان میں ٹیلیفون کا سلسلہ نصب کیا۔ پھر ان دفتروں میں بلا تاخیر کام شروع ہو گیا اور ٹائپ رائٹروں کی کھٹا کھٹ ہر وقت ان میں سنائی دینے لگی۔ ظاہر ہے کہ ان سے بہت سی غلطیاں اور حماقتیں بھی سرزد ہوئیں‘لیکن جو کچھ انہوں نے کر دکھایا‘ وہ واقعی ایک غیر معمولی کارنامہ تھا جو تھوڑے بہت یورپین ملک میں رہ گئے تھے اور ہندوستانیوں کے عادات واطوار سے اچھی طرح واقف تھے‘ انہیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے اتنی جلدی ابتری اور افراتفری پر قابو پالیا اور ایک نئی حکومت کا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیا۔

ایک دلچسپ واقعہ...... مگر سبق آموز اور تاریخی۔

ان دنوں کراچی سے دو میل دور ایک ریل کا انجن اندھیرے میں پٹڑی بدلتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر بریک ڈاؤن ٹرین موقع پر پہنچ گئی اور مزدوروں نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ کام کے دوران میں وہ برابر ”پاکستان زندہ باد“ کی صدا لگاتے رہے اور تھوڑی دیر میں انجن کو پٹڑی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت اتفاق سے ایک اسکاٹ تاجر لائن کے قریب موجود تھا اور اس نے یہ کارنامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ”میں اکیس برس اس برعظیم میں رہا ہوں‘لیکن میں نے لگن اور جوش کی ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ اسی دن مجھے پاکستان کی کامیابی پر یقین ہو گیا۔“

☆......☆......☆

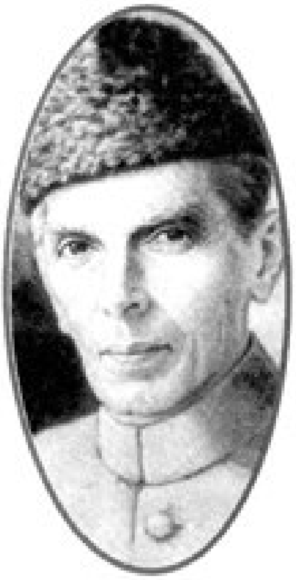

14اگست 1947ء کو اقتدار کی منتقلی کے موقع پر قائد اعظم محمد علی جناح قانون ساز اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔

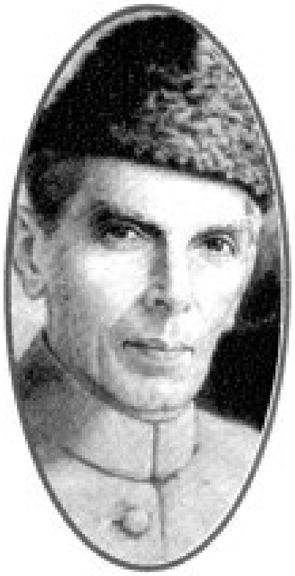

اسمبلی میں پہلی تقریر

پاکستان کے ابتدائی ایام کا تذکرہ جاری ہے۔ کتاب ''محمد علی جناح'' کا مصنف لکھتا ہے:

قائداعظم محمد علی جناح اس نئی قوم کی توجہ کا مرکز تھے اور قوم کا یہ تعمیری جذبہ بہت کچھ خود ان کی لگن اور جہد مسلسل کا مرہون منت تھا۔ قائد زیادہ تر گورنمنٹ ہاؤس کے اندر ہی رہتے تھے۔ برسوں کی مسلسل محنت کے بعد وہ تھک چکے تھے اور ان کی صحت جواب دے رہی تھی۔ لیکن ان میں حوصلہ باقی تھا۔ جن دنوں ان کے ماتحت عہدیدار اور اہلکار دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کی حکومت کا ڈھانچہ تیار کر رہے تھے، محمد علی جناح اپنی نئی قیام گاہ کی ایک ایک چیز کا تفصیل سے معائنہ کر رہے تھے۔ ایک دن وہ اس کے کتب خانے میں گئے تو دیکھا کہ الماریاں خالی پڑی ہیں۔ انہوں نے پوچھا: ''کتابیں کہاں گئیں؟'' جواب ملا: ''سندھ کے گورنر صاحب یہ کوٹھی خالی کرتے وقت کتابیں اپنے ساتھ اٹھوا لے گئے۔'' یہ سن کر قائداعظم نے حکم دیا کہ وہ ''کتابیں یہیں رہنی چاہئیں، جاؤ اور انہیں واپس لا کر یہاں رکھو۔''

اس کے بعد انہوں نے کوٹھی کے سامان کی فہرست کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ (کروکے)

کھیل کے سامان کا ایک سیٹ غائب ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی آہنی محرابیں اور لکڑی کی ہتھوڑیاں پنجاب کے گورنر کے ملٹری سیکرٹری لاہور لے گئے تھے۔ قائد کو یہ بات یاد رہی اور چند ہفتے بعد جب وہ لاہور گئے تو انہوں نے حکم دیا کہ وہ سب سامان واپس کراچی بھیج دیا جائے۔

قائداعظم ان دنوں اپنی زندگی کی سب سے اہم سیاسی تقریر بھی تیار کر رہے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے کمروں اور ان کے ساز و سامان کا معائنہ کر کے وہ اپنے دفتر میں چلے جاتے اور اس تقریر کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ یہ تقریر وہ تھی جو 11 اگست کو انہوں نے مجلس آئین ساز کے صدر کی حیثیت سے کرنی تھی۔ اس کی تیاری پر انہوں نے کئی گھنٹے صرف کیے۔ اس تقریر کے ذریعے انہوں نے یہ اعلان کیا کہ پاکستان کے سب شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس معاملے میں مذہب و ملت کا کوئی امتیاز روانہ رکھا جائے گا۔ انہوں نے کہا:

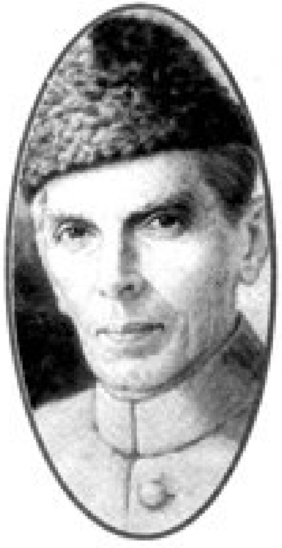

"اب تم سب آزاد ہو اور پاکستان میں تمہیں اس بات کی پوری آزادی ہے کہ اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرو۔ ہمارا یہ بنیادی اصول ہے کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ یہ اصول مذہب، معتقدات اور ذات پات کے امتیاز سے بالاتر ہے۔"

ہیکٹر بولائیتھو لکھتے ہیں: "قائداعظم کے ان الفاظ کی تہہ میں وہی جذبہ کارفرما تھا جس کا اظہار 1400 برس پہلے پیغمبر اسلام ﷺ نے یوں کیا تھا:

"خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں اور تم میں سے ہر ایک کی جان و مال واجب الاحترام ہے۔ تم پر لازم ہے کہ کسی حالت میں بھی ایک دوسرے کی جان و مال پر حملہ نہ کرو۔ آج میں ذات، نسل اور قومیت کے تمام امتیاز اپنے پاؤں تلے روند کر مٹا رہا ہوں۔"

قائداعظم نے رواداری کی اپیل انگریزی زبان میں کی تھی تاکہ پوری دنیا تک ان کا پیغام پہنچ سکے۔ یہ تقریر ان کی رواداری اور وسعت نظر کی بین دلیل ہے۔ چار دن پہلے جب محمد علی جناح فاتحانہ شان سے کراچی کی سڑکوں پر سے گزرے تھے تو انہوں نے شہر کے ہندوؤں کو خاموش اور متفکر پایا تھا۔ آئین ساز اسمبلی کیلئے افتتاحی تقریر لکھتے وقت غالباً یہی اقلیتیں قائداعظم کی چشم تصور کے سامنے ہوں گی۔

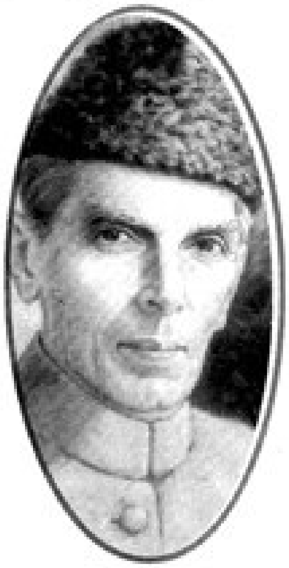

☆......☆......☆

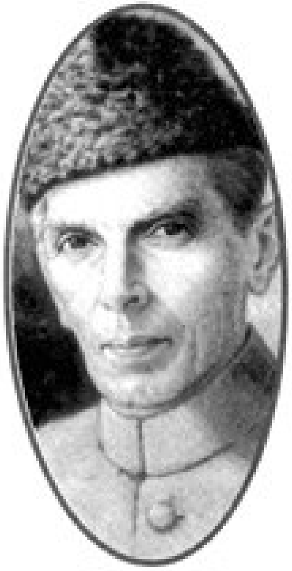

قائداعظم کراچی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے 31ویں سالانہ اجلاس میں تشریف لارہے ہیں' ان کے پیچھے عبداللہ ہارون کے بیٹے محمود ہارون اور یوسف ہارون بطور باڈی گارڈ کھڑے ہیں۔

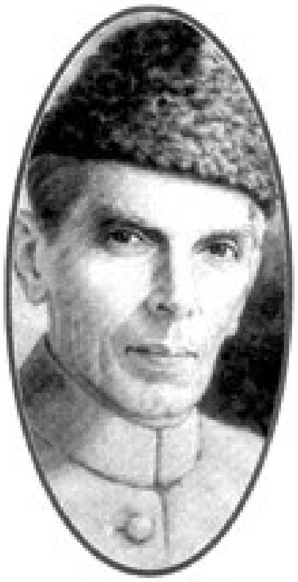

ایک کام ختم ہوا

ہم پاکستان کے ابتدائی ایام کا تذکرہ کر رہے تھے۔ کتاب ہے ”محمد علی جناح“۔

14 اگست کو وائسرائے ہند کی موجودگی میں قائداعظم نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور اس موقع پر انہوں نے عوام سے رواداری اور تحمل کی اپیل کی۔ جس عمارت میں یہ رسم ادا ہوئی اس پر نیا پرچم لہرا رہا تھا جو قائداعظم اور لیاقت علی خاں نے پاکستان کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کا تین چوتھائی سبز حصہ ملک کی مسلمان اکثریت کا اور باقی سفید ٹکڑا اقلیتوں کا نشان تھا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں واضح کر دیا کہ یہ پرچم کسی سیاسی جماعت کا نہیں‘ اس سلسلے میں انہوں نے وہی بات دوہرائی جو تین دن قبل مجلس دستور ساز میں کہی تھی۔

”میرے ذہن میں پاکستان کا جو تصور موجود ہے اس میں کسی فرد یا فرقے کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ ہوگی‘ نہ کسی کو کوئی خاص حقوق یا رعایتیں حاصل ہوں گی۔ پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق برابر ہوں گے اور ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی یکساں ہوں گی۔“

15 اگست کو پاکستان کی پہلی کابینہ کے وزیروں نے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ وہ سب

گورنمنٹ ہاؤس میں اس رسم کے لیے جمع ہوئے اور جب وقت ہو گیا تو فلائٹ لیفٹیننٹ ربانی قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ تقریب گاہ تک ان کی پیشوائی کریں۔ اس تاریخی تقریب کا حال ربانی نے یوں بیان کیا:

"میں قائداعظم کے کمرے میں گیا تو وہ کھڑے ہوئے تھے اور ان کا لباس پہلے سے بھی زیادہ صاف ستھرا اور بے داغ معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پوچھا:

"اب ہمیں چلنا چاہیے؟"

پھر ہم سیڑھیوں سے اتر کر ایک درمیانی جھروکے میں پہنچے اور وہاں سے قائداعظم نے اپنے وزیروں پر اور باہر کھڑے ہوئے ہجوم پر نظر ڈالی، مگر جھروکا یوں واقع تھا کہ جو لوگ نیچے کھڑے تھے وہ قائداعظم کو نہ دیکھ سکے۔ نیچے کا منظر دیکھ کر قائداعظم مسکرائے اور میں نے پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر مسرت کے آثار دیکھے۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور انہیں دیکھ کر میں نے کہا کہ شاید بارش ہونے والی ہے۔ اس پر قائداعظم بولے:

"کراچی کے بادلوں کو میں خوب جانتا ہوں، ان میں پانی نہیں ہوتا۔"

نیچے اتر کر ہم اس میدان میں پہنچے جہاں تقریب ہونے والی تھی۔ قائداعظم نے وزیروں سے یکے بعد دیگرے حلف اٹھوایا۔ تقریب کے بعد میں نے انہیں ان کے کمرے میں واپس پہنچایا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو قائداعظم پھر مسکرائے۔ انہوں نے کہا ایک کام ختم ہوا۔ اب ذمہ داریاں پوری کرنے کی باری ہے۔

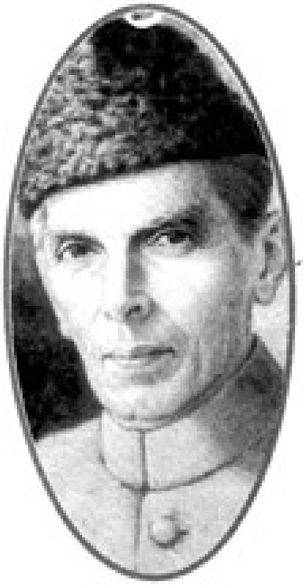

☆......☆......☆

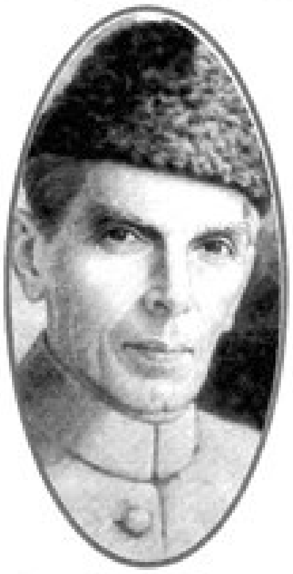

بناوٹ سے نفرت

قائداعظم کے انگریز سوانح نگار ہیکٹر بولائیتھو نے اپنی کتاب میں ایک باب "قائد کے انگریز افسر" کے نام سے ترتیب دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مسٹر جناح ان انقلابی لیڈروں میں سے نہ تھے جو برسوں سے یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ انگریزوں کو فوراً بوریا بستر سمیت ہندوستان چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ ایک معتدل مزاج اور عملی انسان تھے۔ تقسیم ہند سے بہت پہلے ہی وہ طے کر چکے تھے کہ پاکستان کی تشکیل و تعمیر میں محنتی انگریز افسروں کی لیاقت اور تجربے سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ کون کون سے انگریز افسر پاکستان کیلئے مفید ثابت ہوں گے اور کس کی خدمات کتنی مدت کیلئے مستعار لینا ہوں گی۔

ایک روز انہوں نے جنرل سر ڈگلس گریسی سے کہا: "انگریز افسروں کی خدمات ہم زیادہ سے زیادہ پانچ یا دس برس کیلئے مستعار لیں گے۔"

جو انگریز افسر ہندوپاکستان میں باقی تھے ان میں سے بیشتر متحدہ ہندوستان کی طویل سیاسی

کشمکش اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے تنگ آ چکے تھے اور بے چینی سے اس وقت کے منتظر تھے' جب وہ وطن واپس جا کر سکون اور آرام کی زندگی بسر کر سکیں' تاہم ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ ان سے پہلے پوچھا گیا تو وہ راضی ہو گئے۔ قائداعظم نے ان منتخب افسروں کے نام گنوا کر وائسرائے کے سیکرٹری لارڈ ازمے سے کہا: "میں سر آرچیبالڈ رولینڈز (Archibald Rowlands) کو اپنا مالی مشیر مقرر کرنا چاہتا ہوں' سر جارج کیننگھم (George Cunningham) کو صوبہ سرحد کا گورنر اور سر فرانسس موڈی (Francis Mudie) کو پنجاب کا گورنر......"

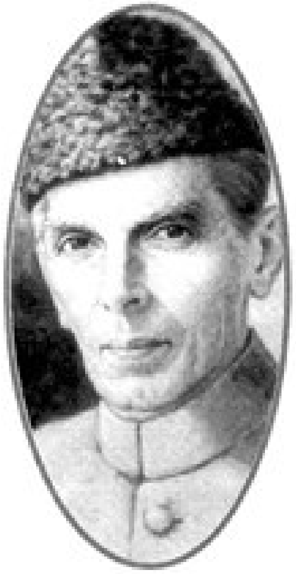

یہ انگریز افسر ایک عمر ہندوستان میں بسر کر چکے تھے اور انہیں ملک سے بڑا لگاؤ تھا۔ مسٹر جناح خوب جانتے تھے کہ ان میں سے کس افسر سے وہ کیا کام لے سکتے ہیں۔ سر جارج کیننگھم تقسیم سے پہلے ہی ہندوستان کی خدمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان میں سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی کے ریکٹر مقرر ہو چکے تھے' لیکن جب پاکستان کی طرف سے انہیں صوبہ سرحد واپس آنے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے قبول کر لی۔

قیام پاکستان کے دو ہی دن بعد ان انگریز افسروں اور سابق حاکموں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ قائداعظم محض ان کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے بلکہ دل سے ہر محنتی اور ذمہ دار انسان کے خلوص کی قدر کرتے ہیں اور انہیں عزت سے پاکستان میں رکھیں گے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے:

17 اگست کو تاریخ پاکستان کا پہلا اتوار تھا۔ اس دن انگلستانی کلیسا کے آرچ ڈیکن (Archdeacon) نے کراچی کے گرجا گھر میں نماز شکرانہ کا اہتمام کیا۔ نماز کیلئے آرچ ڈیکن نے ایک خاص دعا لکھی' جس میں مسٹر جناح کا بھی ذکر تھا۔ قائداعظم کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے بھی سربراہ مملکت کی حیثیت سے اس نماز میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل قائد چاہتے تھے کہ انگریز افسروں بالخصوص اقلیتی اور مسیحی آبادی کو احساس ہو کہ ان کیلئے

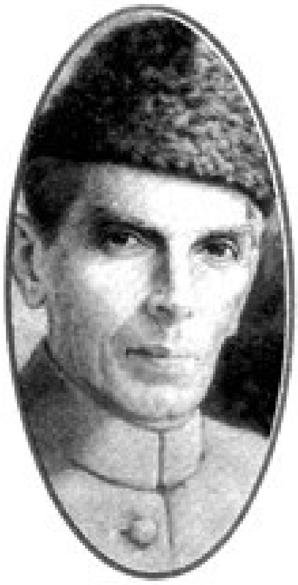

پاکستان میں آزادی اور عزت دونوں میسر ہوں گے۔

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ولفریڈ رسل لکھتے ہیں: ''مسٹر جناح خوب جانتے تھے کہ ان کے معتقدوں میں بہت سے انتہا پسند مسلمان ہیں جو عیسائیوں کی اس دلجوئی سے خوش نہ ہوں گے، مگر انہوں نے دیدہ ودانستہ یہ سیاسی خطرہ مول لیا۔''

پاکستان کی بری فوج کے پہلے سپہ سالار جنرل سر فرینک میسروی (Frank Messervey) نے کہا کہ ایک دفعہ قائداعظم نے مجھ سے کہا: ''مجھے فوج کے کام کا زیادہ تجربہ نہیں، لہٰذا فوجی معاملات میں تمام تر آپ پر اور لیاقت علی خاں پر چھوڑ رہا ہوں۔'' میسروی کہتے ہیں کہ یہ ان کی عظمت اور صاف گوئی تھی، ورنہ وہ کوئی اور توجیہہ بھی بیان کر سکتے تھے۔

بولائتھو لکھتے ہیں: 1948ء کے مارچ میں ڈھاکے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح فوجی معاملات اور مخصوص آداب سے زیادہ واقف نہیں تھے، لیکن اگر انہیں کسی بات کا علم نہ ہوتا تھا تو وہ ظاہر داری اور بناوٹ سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ صاف کہہ دیتے تھے کہ میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔

مصنف کے مطابق جب قائد ڈھاکہ میں سلامی لینے کھڑے ہوئے تو مقررہ مقام سے کوئی تین فٹ دور تھے۔ کمانڈر انچیف نے ان کے کان میں کہا:

''جناب آپ کو اس جگہ کھڑا ہونا چاہیے۔''

قائداعظم نے پوچھا: ''یہ کیوں؟'' اس پر کمانڈر انچیف نے جواب دیا: ''کیونکہ یہ ایک فوجی تقریب ہے اور یہی آداب ہیں۔'' قائد بہت خوب کہہ کر وہاں سے ہٹے اور ٹھیک جگہ پر جا کر کھڑے ہوگئے۔

☆......☆......☆

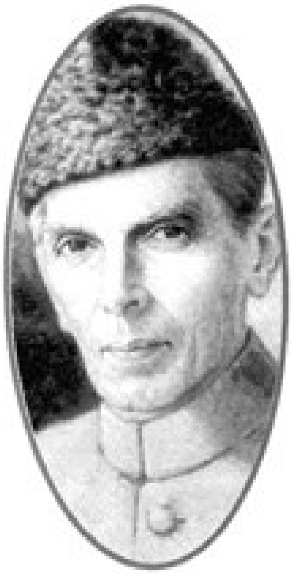

قائداعظم یوم آزادی کے سلسلے میں 14 اگست 1947ء کو گورنر جنرل ہاؤس میں
ایک تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔

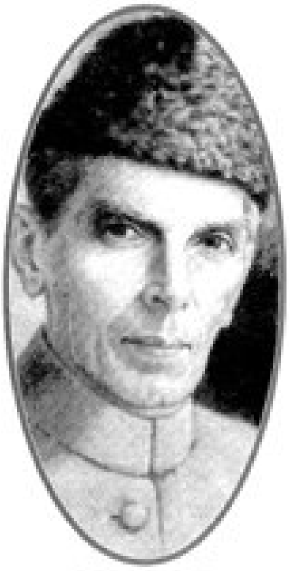

مشرقی پاکستان کی فکر

بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم کے تذکرے کے سلسلے میں ہم ان انگریز افسروں کا ذکر کر رہے تھے، جنہیں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں خدمات انجام دینے کیلئے روکا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 13/اگست کو ریر ایڈمرل جیفرڈ (Rear-Admiral Jefford) نے پاکستان کی چھوٹی سی بحری فوج کی کمان سنبھالی۔ اس وقت پاکستان کے جنگی بیڑے میں ایک (Frigate)' دو سرنگیں ہٹانے والے جہاز (Minesweepers) اور چند چھوٹے ساحلی جہاز تھے۔ یہ سب کراچی کی گودیوں میں لنگرانداز تھے۔ ان کے علاوہ ایک فریگیٹ اس وقت سفر میں تھا اور چار مائن سویپر بمبئی میں زیرِ مرمت تھے۔ کراچی میں دو ساحلی اڈے (Shore bases) بھی تھے، لیکن وہاں نہ رسد تھی نہ گولا بارود، نہ جہازوں کی مرمت کا سامان تھا، نہ بیڑے کے انتظام کیلئے کوئی سہولت میسر تھی۔

مصنف لکھتا ہے: بحری فوج میں صرف دو پاکستانی افسر ایسے تھے جن کا تجربہ آٹھ سال سے زیادہ تھا۔ پاکستان قائم ہوتے ہی اس کی بحری فوج کی تشکیل و توسیع کا کام شروع ہو گیا۔

کراچی میں اس کا مرکز قائم کیا گیا اور اس کیلئے افسروں اور ماتحتوں کا عملہ مہیا کیا گیا۔ ایک بحری اڈا بھی قائم کیا گیا اور اس میں بیڑے اور توپخانے کی رسد فراہم کی گئی۔ مشرقی پاکستان میں ’جو بحری فوج کے صدر مقام سے ہزار میل دور ہے‘ کوئی بحری سٹیشن نہ تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان خشکی کا راستہ ہندوستانی علاقے میں سے ہو کر گزرتا ہے اور ہندوستان کی حکومت سے اس کے استعمال کی اجازت ملنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا بحری فوج کے سپہ سالار نے ایک مکمل لاسلکی بحری سٹیشن اور اس کو چلانے کیلئے ملاحوں کا ایک دستہ ’ہوائی جہاز سے چاٹگام بھجوادیا۔ کچھ عرصے بعد وہاں ایک مستقل بحری اڈا قائم ہو گیا۔

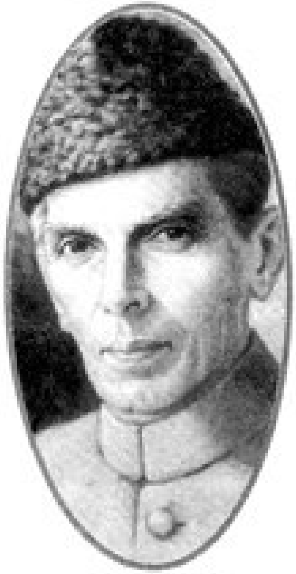

ایڈمرل جیفرڈ پانچ سال تک پاکستان کی بحری فوج کے سپہ سالار رہے۔ اس دوران میں انہوں نے اس نئی مملکت کیلئے خاصا مضبوط جنگی بیڑا تعمیر کر دیا۔ جب وہ سبکدوش ہو کر وطن واپس جانے لگے تو انہوں نے قائداعظم کے متعلق اپنی ایک یادداشت چھوڑی‘ اس میں لکھتے ہیں:

”مسٹر جناح یقیناً بہت بڑے انسان تھے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ مسلمان عوام میں قریب قریب ایک دیوتا کا رتبہ حاصل کر چکے تھے‘ لیکن وہ کوئی فتنہ انگیز اور شورش پسند لیڈر نہ تھے اور انہوں نے کبھی عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنا مطلب نکالنے کی کوشش نہ کی۔ لیاقت علی خان کی طرح وہ دوسروں سے جلد بے تکلف بھی نہ ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی دوسروں کو خوش کرنے اور عوام میں سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ فطرتاً کم گو واقع ہوئے تھے‘ لیکن کبھی کبھی ان کے چہرے پر انسانی ہمدردی اور گرمجوشی کی چمک پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ خوشامدیوں سے انہیں نفرت تھی۔ اس ضمن میں مجھے پہلے یوم آزادی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

ایڈمرل جیفرڈ لکھتے ہیں:

”پاکستان کی حکومت کی رسم افتتاح کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس جا چکے تھے اور

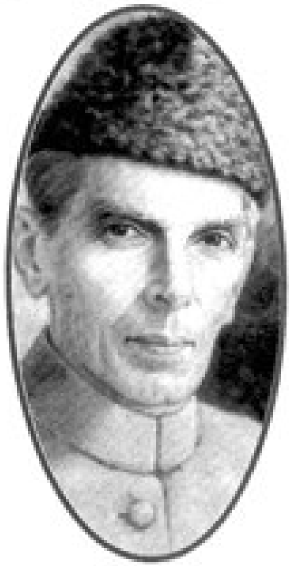

قائداعظم اپنے چند پاکستانی دوستوں کیساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں تھے‘ ذرا دیر پہلے تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی قائداعظم کے ساتھ وہاں مقیم تھے۔ اس لئے گورنمنٹ ہاؤس پر پاکستان کے قومی پرچم کیساتھ ساتھ برطانیہ کا یونین جیک بھی لہرارہا تھا۔ قائداعظم کو خوش کرنے کے خیال سے ان کے کسی معتقد نے کہاکہ وائسرائے اب پاکستان سے رخصت ہو چکا ہے‘ لہٰذا یونین جیک اتار لیا جائے۔ اس پر قائداعظم نے بڑی سختی سے کہا:

”پرچم اتارنے کا مناسب وقت بعد مغرب ہے۔ قاعدے کی رو سے اس سے قبل پرچم اتار دیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔ مجھے ابھی ابھی گورنر جنرل مقرر کیا گیا ہے اور وہ فرمان جاری کیا گیا ہے‘ جس کی رو سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا ہمیں وہی کرنا چاہیئے جو قاعدے اور قانون کی بات ہے اور بلاوجہ جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔“

ایڈمرل جیفرڈ کو معلوم تھا کہ قائداعظم کو بحری فوج سے خاص لگاؤ ہے اور بحیثیت گورنر جنرل قائد نے بحری فوج کا معائنہ بری اور ہوائی فوج سے پہلے کیا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان واحد رابطہ ہے۔ شروع میں کچھ عرصہ جیفرڈ کو یہ اندیشہ رہا کہ پاکستان کی وزارت خزانہ بحریہ کیلئے ان دو تباہ کن جہازوں (Destroyers) کیلئے رقم دینے سے انکار نہ کر دے جو ایڈمرل کو اپنے بیڑے کیلئے فوراً درکار تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے اس اندیشے کا اظہار قائداعظم سے کیا۔

قائداعظم ضابطے کے سخت پابند تھے اور شاید کسی اور معاملے میں وہ وزارت خزانہ کے دائرہ اختیار میں دخل دینا پسند نہ کرتے‘ لیکن بحری فوج کی بات کچھ اور تھی۔ لہٰذا قائداعظم ایڈمرل جیفرڈ کو الگ لے گئے اور ان سے کہا: ”آپ بے دھڑک جہاز خریدنے کی تیاری کریں‘ یہ پاکستان کیلئے ضروری کام ہے‘ لہٰذا رقم منظور کروانے کا ذمہ میرا ہے۔“

☆......☆......☆

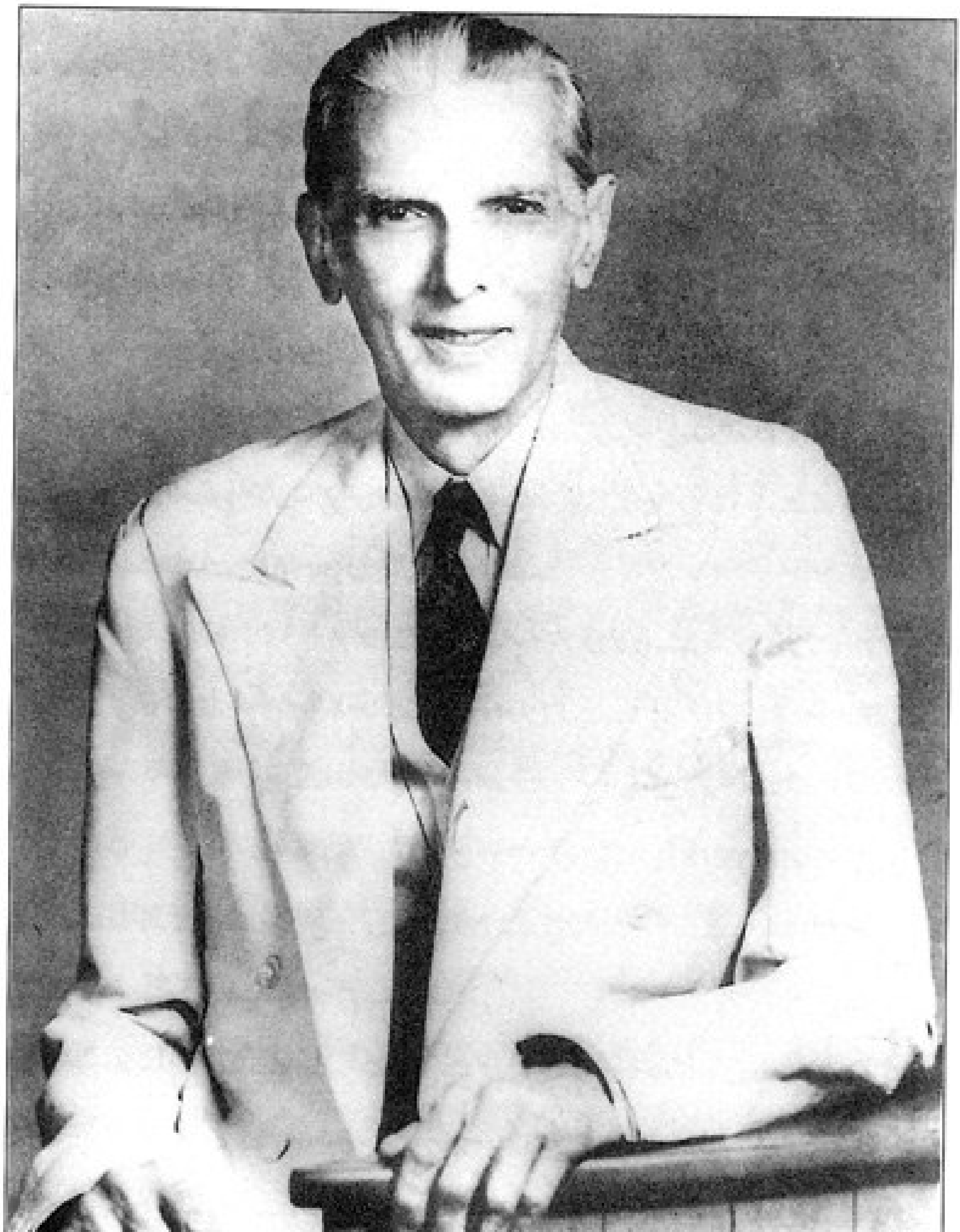

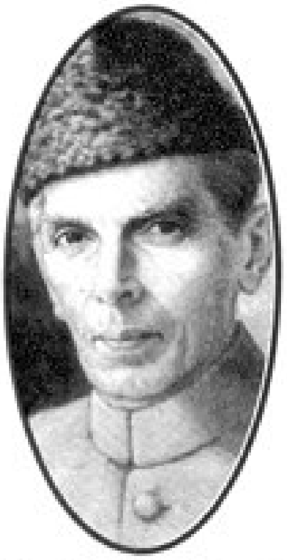

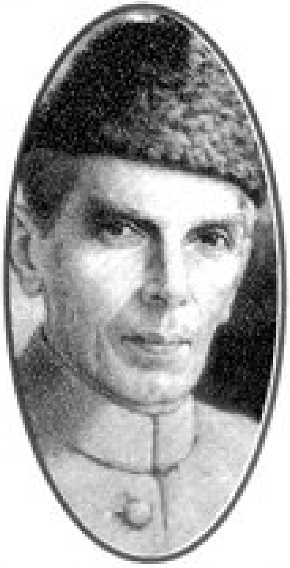

ایک آزاد قوم کا سربراہ

گزشتہ روز ہم انگریز افسروں کے حوالے سے بانئ پاکستان قائداعظم کا تذکرہ کر رہے تھے۔ قائد کا انگریز سوانح نگار بولائتھو لکھتا ہے:

”قائداعظم اور پاکستان نیوی کے پہلے سربراہ ایڈمرل جیفرڈ کے مابین صرف ایک دفعہ ایک معاملے میں شدید اختلاف رونما ہوا' تاہم اس کی وجہ سے آپس میں رنجش نہ پیدا ہوئی اور اختلاف ختم اس طرح ہوا کہ شاہی ضابطوں اور بحری فوج کی مروجہ ہدایات میں ایک اہم ترمیم کر دی گئی۔

1947ء کے اواخر میں برطانوی بحری فوج کے جزائر شرق الہند کے سپہ سالار' ایڈمرل سر آرتھر پیلزر نے پاکستان آنے اور قائداعظم سے رسمی ملاقات کا قصد کیا۔ برطانوی بحری فوج کے ضابطے اور روایات کی رو سے یہ لازم تھا کہ اس کے بعد قائداعظم بھی ایڈمرل کے جہاز پر جا کر ان سے ملاقات کریں۔ قائداعظم نے ایڈمرل کی پاکستان آمد کے سلسلے میں تمام تجویزیں منظور کر لیں 'لیکن اس پر تیار نہ ہوئے کہ ایڈمرل سے ملاقات کیلئے بذات خود اس

کے جہاز پر جائیں۔ قائد نے یہ طے کیا کہ یہ کام ان کی طرف سے گورنر کا ملٹری سیکرٹری ادا کرے گا۔

یہ خبر برطانوی امیر البحر کے دفتر بھیج دی گئی۔ لندن میں اس سے بڑی کھلبلی مچ گئی۔ پھر کراچی میں ایڈمرل جیفرڈ نے قائداعظم سے ملاقات کی درخواست کی۔ درخواست میں کہا گیا تھا کہ ایڈمرل جیفرڈ گورنر جنرل کے بحری مشیر کی حیثیت سے ان سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ بحری فوج کے نقطۂ نظر کی وضاحت کر سکیں۔

قائداعظم قانونی موشگافی کے ماہر ٹھہرے' انہوں نے درخواست کا قانونی سقم فوراً پکڑ لیا اور حکم دیا: بحری فوج کے کمانڈر کو بتادیا جائے کہ وہ میرے نہیں بلکہ حکومت پاکستان کے بحری مشیر ہیں۔ ہاں اگر بحیثیت ایڈمرل جیفرڈ بحری فوج کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تو میں بڑی خوشی سے ان سے ملاقات کروں گا۔"

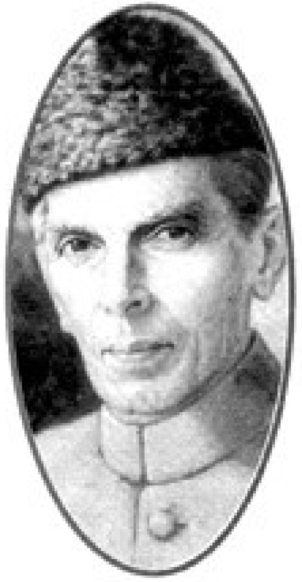

"ایڈمرل جیفرڈ گورنمنٹ ہاؤس پہنچے تو انہیں اندیشہ تھا کہ قائداعظم سے یہ ملاقات بڑی ہنگامہ خیز ہوگی اور اس کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ ان کی برطرفی کا حکم ہو جائے گا' لیکن جب وہ اندر گئے تو دیکھا کہ قائداعظم ہشاش بشاش ہیں۔ ایڈمرل کے استقبال کیلئے وہ اٹھ کر دروازے تک آئے۔ یہ غیر معمولی عنایت والتفات دیکھ کر گورنمنٹ ہاؤس کا سارا عملہ حیران رہ گیا۔

اس خوش گوار ابتدا کے بعد ایڈمرل نے مطلب کی بات شروع کی۔ انہوں نے برطانیہ کے "شاہی قواعد" کے متعلقہ حصے قائداعظم کو پڑھ کر سنائے اور انہیں بتایا کہ جب کوئی ایڈمرل کسی ڈومینین یعنی ماتحت ریاست کی بندرگاہ پر اترے اور گورنر جنرل سے رسمی ملاقات کرے تو برطانیہ کی بحری فوج کی روایت کے مطابق گورنر جنرل کو جہاز پر جا کر ایڈمرل سے جوابی ملاقات کرنا چاہیے۔

اس پر قائد نے کہا: "مسٹر جیفرڈ' میری بات سنیں۔ تمہارے یہ قواعد اور ضابطے

اٹھارہویں صدی کی برطانوی نوآبادیوں کیلئے ٹھیک تھے۔اس زمانے میں اگر جزائر غرب الہند کی کسی نوآبادی میں تمہاری نیوی کا مشہور ایڈمرل نیلسن یا کوئی اور امیر البحر وارد ہوتا اور وہاں کے گورنر سے ملنے جاتا تو یہ توقع بے جا نہ ہوتی کہ گورنر بھی جوابی ملاقات کیلئے خود ایڈمرل نیلسن کے جہاز پر جائے۔ لیکن میری حیثیت بہت مختلف ہے۔ یہ 1947ء ہے اور میں ایک آزاد اور خود مختار ڈومینین کا گورنر جنرل ہوں جو ابھی برطانوی راج سے آزاد ہوئی ہے' لہٰذا مجھے آپ اٹھارہویں صدی کے ماتحت ممالک کے سربراہوں سے نہ ملائیں تو بہتر ہوگا۔"

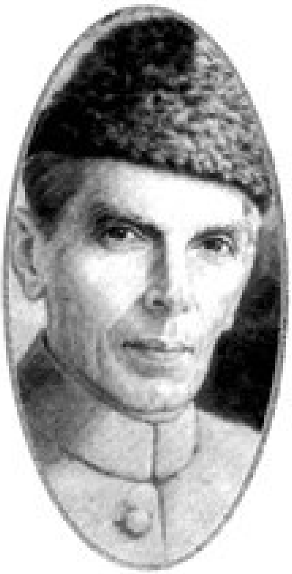

پھر قائد نے ایڈمرل جیفرڈ کو سمجھایا کہ پاکستان کے عوام سرکاری اور سفارتی آداب و رسوم سے بالکل ناواقف ہیں۔اگر گورنر جنرل خود ایڈمرل پیلرز سے ملاقات کرنے ان کے جہاز پر جائے تو پاکستان کے لوگ اس کا مطلب کچھ اور سمجھ لیں گے اور ممکن ہے اس کی مذمت بھی کریں کہ آزادی کے بعد بھی ایسا کیوں؟ قائداعظم نے یہ تجویز کیا کہ بحری فوج کی طرف سے ایڈمرل پیلرز کو گورنمنٹ ہاؤس میں قیام کی دعوت دی جائے اور انہیں مطلع کر دیا جائے کہ اگر وہ اپنے جہاز پر کوئی باقاعدہ تقریب کرنا چاہیں تو گورنر جنرل خوشی سے اس میں شریک ہونگے۔

اس طرح قائد کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ اصول پرستی کے باعث یہ مسئلہ حل ہوگیا۔

☆......☆......☆

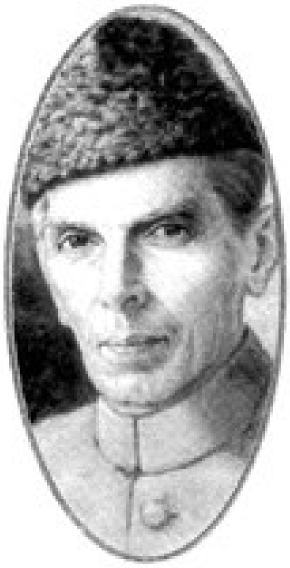

قائداعظم کننگھم پارک پشاور میں ایک فقید المثال جلسہ عام سے خطاب کر رہے ہیں (1948ء)۔

عزم و ہمت کی چٹان

قائداعظم کی صحت کے حوالے سے ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی چند اور باتیں: محترمہ لکھتی ہیں:

"قائداعظم بیماری کے باوجود پیروکاروں اور مداحوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی چال سے تھکاوٹ اور اداسی ظاہر ہوتی تھی اور وہ دونوں طرف باری باری قدرے جھک جاتے اور اپنی پارٹی کے لوگوں کے سلام قبول کرتے اور انہیں پُرجوش جوابی سلام کرتے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگاتی تھیں۔ وہ ڈائس پر چلے جاتے۔ قرآن حکیم کی چند ایک آیات کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقاریر کے بعد وہ چند قدم چل کر مائیک کے سامنے آتے۔ اب وہ ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں پُرجوش لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے اور اس کے بعد ایسے لب و لہجے اور آواز میں ان سے خطاب کا آغاز کرتے گویا ان پر بڑھاپا یا خرابی صحت مطلق اثرانداز ہی نہیں ہوئی۔ ہر وقفے کے دوران حاضرین جلسہ "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگاتے۔ قائد اپنی آواز کو عوام کے دلوں میں پیدا ہونے

والی امیدوں' امنگوں اور مسرتوں کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے جواب تک خود کو کھلے آسمان تلے ہولناک اندھیرے کی قید میں محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ قائداعظم کی قوم ہرگز نہیں جانتی تھی کہ اس کا لیڈر جسمانی طور پر کس قدر تھکا ماندہ' مضمحل' کمزور اور بیمار ہے۔ وہ اپنی قوم کے ہیرو تھے اور ہیرو کے ہیرو پن کو بھلا کون الزام دے سکتا ہے؟"

فاطمہ جناح لکھتی ہیں: "گھر واپسی پر اپنے کمرے کی تنہائی میں میرے بھائی بے سدھ اور بے جان سے ہو کر لیٹ جاتے اور ہانپتے ہوئے سانس لیتے۔ تاریخ کے دوسرے بہت سے مشاہیر کی طرح وہ تنہائی میں زیادہ آرام محسوس کرتے تھے مگر ان کے اندر دہکتی ہوئی آگ اپنی قوم کے دلوں کو دور سے بھی گرمائے رکھتی تھی۔"

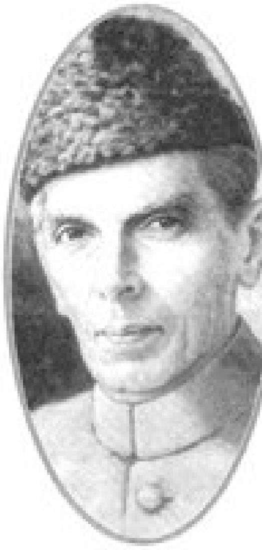

"خوش قسمتی سے وہ اپنی مرضی کے مطابق سونے کی صلاحیت کے بھی مالک تھے' چنانچہ دن بھر کی پریشانیاں اور تفکرات ان کے تحت الشعور کے باہر تک ہی محدود رہتے تھے' البتہ ہر صبح کے ساتھ ان کے نام تازہ خطوط' تازہ درخواستیں آ جاتیں اور نئے نئے مسائل اور بھاری بھرکم معاملات فیصلوں کے منتظر ہوتے۔"

محترمہ مزید لکھتی ہیں: "قائد ایک ایسی روح تھے جو خدمت کیلئے بے قرار تھی اور وہ روح ایک ایسے جسم میں تھی جو کام اور خرابی صحت سے ٹوٹ چکا تھا۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سی کیفیت طاری رہی۔ بخار کے بار بار کے حملوں نے ان کے جسم کو لاغر کر دیا تھا۔"

"میں نے انتہائی افسوس اور کرب کے ساتھ دیکھا کہ 1947ء میں کامیابی کے اس عظیم لمحے میں بھی جب پاکستان بنا' قائداعظم کی جسمانی صحت کسی بھی لحاظ سے اطمینان بخش نہیں تھی' ان کی بھوک برائے نام رہ گئی تھی بلکہ بالکل ہی ختم ہو چکی تھی' چنانچہ انتہائی توجہ اور محبت سے بنائے گئے کھانے بھی انہیں کھانے کی طلب پر آمادہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی بھر کی اپنی مرضی سے سو جانے کی عادت اب غائب ہو چکی تھی اور وہ مسلسل کئی کئی راتوں تک

بے خوابی کے عالم میں تکیے پر کروٹیں بدلتے اور جاگتے رہتے تھے۔ ان کی کھانسی میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ حرارت بھی اب زیادہ رہنے لگی تھی۔"

فاطمہ جناح لکھتی ہیں: انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے' قائد کے اعزاز میں کراچی کلب میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا: "مس فاطمہ جناح میرے لئے مسلسل امداد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ رہی ہیں۔ ان دنوں جب مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کرلے گی' یہ میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور بہت سی امید افزاء باتیں کہیں جبکہ انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ میری بہن نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا۔"

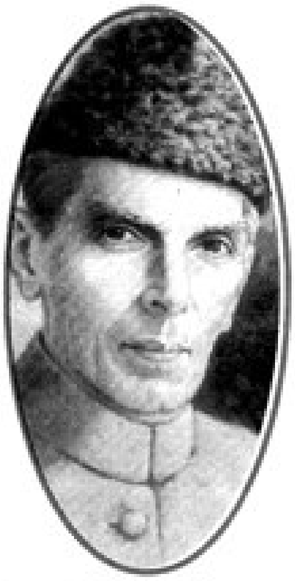

قارئین محترم۔ قائد کی صحت کے حوالے سے یہ چند واقعات تھے جو ہم نے مختلف کتابوں سے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ سب سے بڑی گواہی ان کی قابل احترام بہن محترمہ فاطمہ جناح کی ہے جو ہر دم قائد کے ساتھ رہتی تھیں۔ واقعی کون جان سکتا تھا سوائے ان کے۔ کہ جس قائد کیلئے ٹرین سے باہر ہزاروں مسلمان نعرے لگا رہے ہوتے تھے وہ جسمانی طور پر بیماری سے کس طرح لڑ رہا تھا' گر پڑتا تھا مگر عزم و ہمت کی یہ چٹان تھی جو کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دیتی تھی کہ اس شخص کو اندر سے کتنی تکلیف ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے پاکستان تخلیق کیا۔

☆......☆......☆

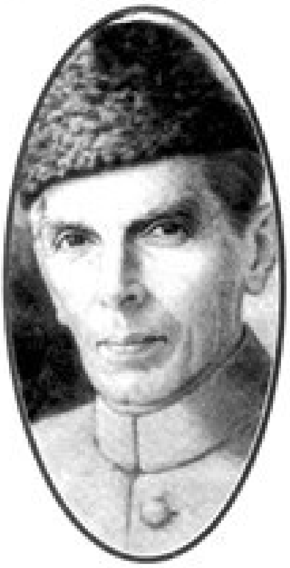

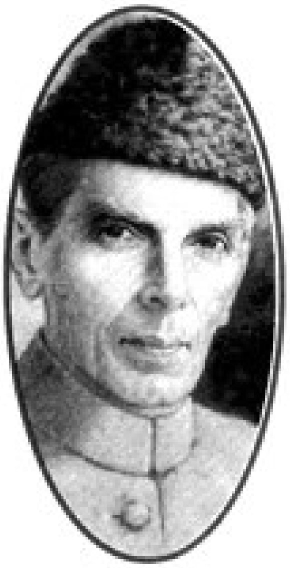

وقت کی پابندی

قائداعظم کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کیلئے دو اہم واقعات:

قائد کے ایک دوست تھے' اے بی اکرم۔

نام عزیز بخش، تخلص اکرم' عمر اڑسٹھ برس' تعلیم ایم ایس سی (مکینیکل انجینئرنگ مشی گن یونیورسٹی امریکہ) مسلم لیگ کے عروج وزوال کی داستانیں سینے میں سمیٹے شاہراہ قائداعظم لاہور پر اے بی اکرم اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ مزاج میں بزرگانہ رکھ رکھاؤ' زبان میں شیرینی' وضع داری کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر لباس تک اسی وضع کا پہنا جیسا کہ اس وقت تھا جب قائداعظم سے محفلیں جمتی تھیں۔ جناب اے بی اکرم نے یادوں کو کریدتے ہوئے کہا:

1934ء میں میں نے بمبئی میں اے بی اکرم اینڈ کمپنی کے نام سے کاروباری زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت مسٹر جناح ولایت میں تھے۔ میری ان کے ساتھ شناسائی نہ تھی۔ 1935ء میں وہ واپس ہندوستان آئے تو اس وقت میں 88 بالکیسر سٹریٹ مالابار بمبئی میں رہائش پذیر تھا اور اس طرح ان کا ہمسایہ تھا۔ میرا ان سے تعارف نہ تھا۔ ایک روز مشترکہ ہندو دوست 'نمایاں

کاروباری شخصیت گوپل داس متھراداس نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایااوراس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلااوراتنی قربت ہوگئی کہ جب 1935ء میں مسٹر جناح نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کیلئے کہا تو میں انکار نہ کر سکا حالانکہ میں سیاسی آدمی نہیں تھا۔ مجھ میں ایک مخلص اور دیانتدار انسان کی پیشکش کو ٹھکرانے کا یارانہ تھا۔ اس دوران میں نے مسلم لیگ کو 40 ہزار ڈالر چندہ بھی دیا۔

نشست وبرخاست کی یہ محفلیں اتنی بڑھیں کہ ہم اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھاتے۔ یہ اتفاق اس لئے بھی پیش آتا رہا کہ میرا کاروبار سیکرٹریٹ کی عمارت کے بالکل سامنے تھا۔ قائداعظم کو کھانے میں کوئی خاص ڈش مرغوب نہ تھی۔ ہاں پاپڑ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ وہ بھی ایسے جن میں مرچیں کم ہوں۔ قائد صرف سیاسی زندگی میں ہی بااصول اور نظم وضبط کے پابند انسان نہ تھے نجی زندگی بھی بڑی باترتیب تھی۔ یہ نظم وضبط ہی تھا کہ ڈھیروں دولت کمانے کے باوجود کوئی اخلاقی برائی ان کے قریب نہ پھٹکی۔ خود تو کسی برائی میں کیا ملوث ہوتے برے آدمی کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ جس شخص کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ کسی علت کا شکار ہے اس سے نفرت کرتے۔

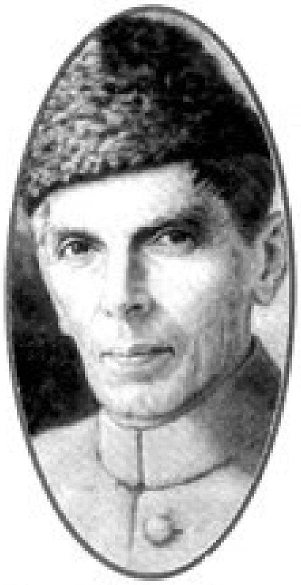

قائد کو بس ایک ہی عادت تھی یہ کہ سگار بہت پیا کرتے۔ بلاشبہ اس زمانہ میں ان کے دوستوں میں ہندو بھی تھے۔ جس دوست گوپل داس کے ذریعہ میری جناح صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ ان کا بھی دوست تھا۔ ملاحظہ کریں ان کا وہ ہندو دوست بھی کس کردار کا مالک تھا۔ وہ شخص بیڑی کا کاروبار کرتا تھا کہ اس کا دیوالیہ ہوگیا' وہ جاپان چلا گیا، اس نے پائی پائی ادا کر دی۔ 33 کروڑ روپیہ کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ اس شخص کی مثال میں اس لئے دے رہا ہوں کہ آپ کو پتہ چل جائے کہ قائداعظم کے حلقہ احباب میں اعلیٰ کردار کے لوگ تھے۔ قائد کا کہنا تھا کہ اس نے ڈھیروں دولت کمائی اور جب مرا تو اس زمانے میں اسی لاکھ روپے کا ورثہ چھوڑا۔"

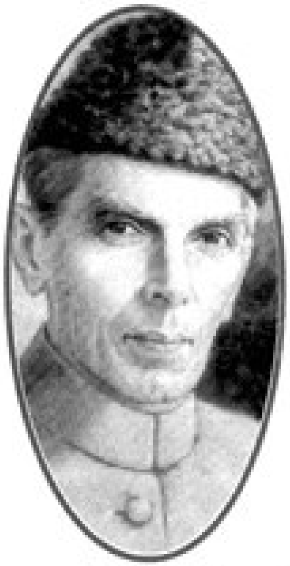

ایک اور واقعہ ہے جو رازداں کے قلم سے اخبارات کی زینت بنا۔ ''رازداں'' قلمی نام ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''قائداعظم وقت کے بڑے پابند تھے۔ اس بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں لیکن جو واقعہ میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ مجھے قائد کے ایک جانثار سپاہی نے بتایا کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سٹیٹ بینک کا افتتاح ہوا۔ قائد اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر تشریف لائے لیکن کئی وزراء اور سرکاری افسران نے ابھی تک تقریب گاہ میں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا۔ ان میں وزیراعظم لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔ اگلی روکی کئی کرسیاں جو بڑے افسران اور وزرائے کرام کیلئے مخصوص تھیں خالی پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر قائداعظم کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے کارروائی شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ تقریب گاہ میں موجود تمام خالی کرسیاں اٹھالی جائیں تاکہ جو حضرات بعد میں آئیں انہیں کھڑا رہنا پڑے۔ اس طرح انہیں پابندیٔ وقت کا خیال رہے گا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ تقریب شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جناب لیاقت علی خان تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ چند دوسرے وزراء بھی تھے لیکن کسی شخص کو ان کیلئے کرسی لے کر آنے یا انہیں اپنی کرسی پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف قائد ملت اور وزیراعظم کا ظرف بھی یہ تھا کہ کسی کو کرسی سے نہ اٹھایا بلکہ تقریب کے دوران لیاقت علی خاں اور ان کے کئی رفقاء کھڑے رہے۔ قائد روانہ ہونے لگے تو ان حضرات نے دیر سے آنے پر بڑی معذرت کی۔

قائد نے کہا آئندہ پابندیٔ وقت کا خیال کریں، اس واقعے کے بعد کسی مقتدر سے مقتدر شخص کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ سرکاری تقریب میں دیر سے آئے۔''

☆......☆......☆

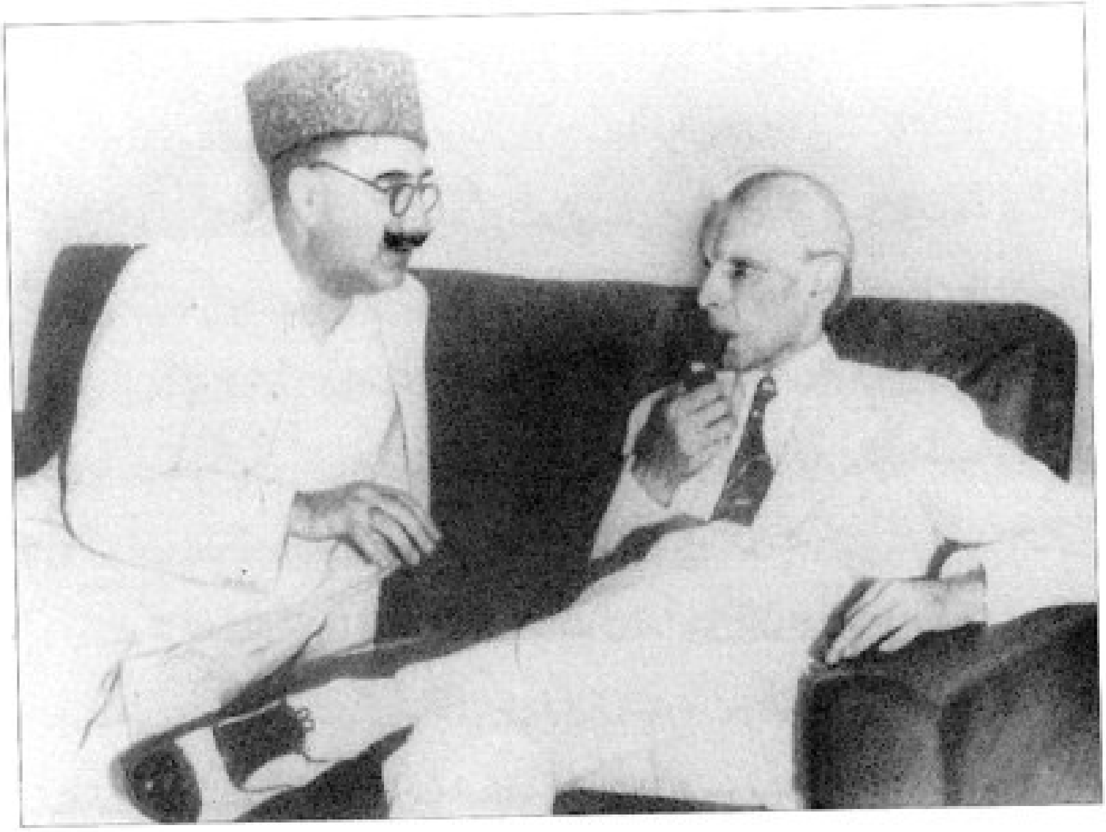

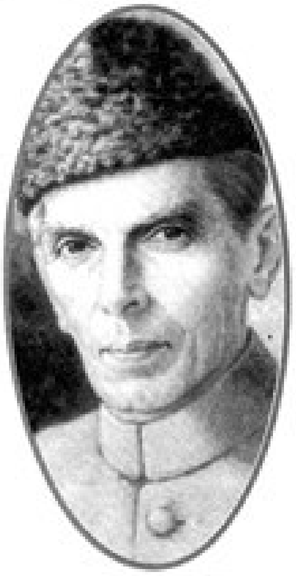

قائداعظم محمد علی جناح اور سردار عبدالرب نشتر۔

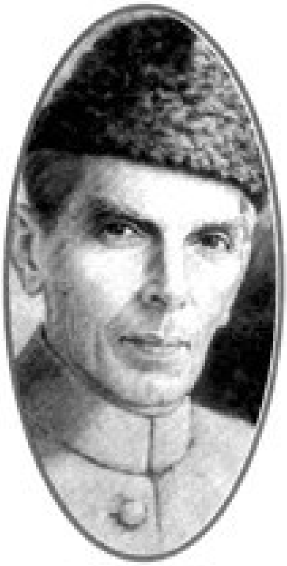

ذکر پرچم کی تیاری کا

قائداعظم کی یاد ہی ہمارا سرمایہ ہمارا ورثہ ہے۔

قائداعظم کی حس مزاح کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ جو جناب عباس احمد عباس نے درج کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

آخری مرتبہ میں نے قائداعظم کو اس دن دیکھا جب انہوں نے دس اگست کو دہلی میں آخری پریس کانفرنس بلائی تھی۔ ان کی کوٹھی کا ایک چھوٹا سا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ بلا کی گرمی تھی' صرف ایک پنکھا تھا جس کا رخ قائداعظم کی طرف پھیر دیا گیا۔ قائداعظم اس دن بہت خوش تھے کیونکہ وہ پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے خواب کی تعبیر تھا اب بن رہا تھا۔ اس دن میں نے ان کی پہلی مرتبہ پریس کانفرنس دیکھی۔ ان کے جوابات چبھتے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک ہندو نے ان سے پوچھا "پاکستان کیا دینی ریاست ہو گی؟" انہوں نے کہا دینی ریاست کا کیا مطلب ہے' ہم سب مسلمان ہیں، البتہ خواہ مخواہ بے سوچے الفاظ استعمال کرنے سے کیا حاصل ہے۔ ایک اور شخص نے لقمہ دیا کہ ان کا مطلب ہے ملاؤں کی حکومت! قائداعظم نے فرمایا "ہندوستان کی

شکل میں پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا رائے ہے؟" اور قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

دوسرا واقعہ پاکستانی پرچم کے بارے میں ہے۔ تحریک آزادی کے رہنما مسلم لیگ کے لیڈر اور پنجاب کے سابق گورنر سردار عبدالرب نشتر (مرحوم) کا ایک مضمون "پاکستانی پرچم کا پس منظر" کے زیر عنوان ہفت روزہ "چٹان" لاہور میں 19 فروری 1962 کو شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ کیجیے۔ سردار نشتر لکھتے ہیں:

پاکستان کا پرچم تیار کرنے کے سلسلے میں قائد اعظم نے وائسرائے سے گفتگو کی تو اس نے مشورہ دیا کہ نیوی والے پرچم تجویز کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اس لئے انہیں کہا جائے کہ پاکستانی نمائندوں کے فیصلہ کے مطابق پرچم تجویز کریں۔

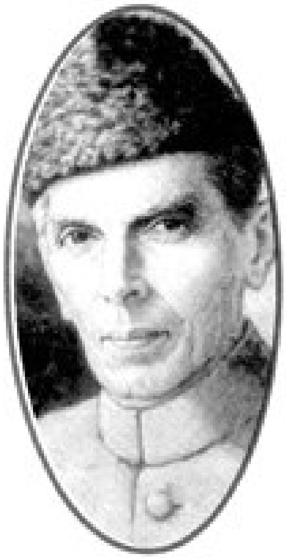

چند یوم کے بعد بحریہ والوں نے چھوٹے چھوٹے پرچم بنا کر بھیج دیے۔ کسی میں سفید رنگ دونوں طرف اور درمیان میں مسلم لیگ کا جھنڈا تھا' کسی میں سفید رنگ لکڑی کی طرف اور مسلم لیگ کا پرچم دوسری طرف اور کسی میں اس کا الٹ۔ چنانچہ ایک سہ پہر کو آخری انتخاب کیلئے چند نمونے پیش ہوئے۔ دونوں طرف سفید رنگ اور بیچ میں مسلم لیگ کے جھنڈے والا نمونہ تو بھلا نہیں لگتا تھا، اس لئے اسے رد کر دیا گیا۔ باقی دو نمونوں پر بحث ہوئی۔ بالآخر موجودہ پرچم کا انتخاب کیا گیا۔ علاوہ دیگر وجوہات کے اس کی تائید میں یہ دو باتیں بھی تھیں کہ ایک تو مسلم لیگ کے جھنڈے والا حصہ اس طرف رہے گا جو ہوا میں اڑتا ہے کیونکہ یہ خوبصورت نظر آئے گا اور دوسرے جو کپڑا جھنڈے کی لکڑی پر چڑھایا جاتا ہے وہ سفید رنگ کا ہوتا ہے اس لئے اس کے تسلسل میں سفید رنگ والا حصہ ہونا چاہیے۔

دوران گفتگو قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ بہتر نہ ہو گا کہ پاکستان کے پانچ صوبوں کی نمائندگی کیلئے پرچم میں پانچ ستارے رکھے جائیں۔

سردار عبدالرب نشتر لکھتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ پاکستان کے ساتھ ریاستوں کا

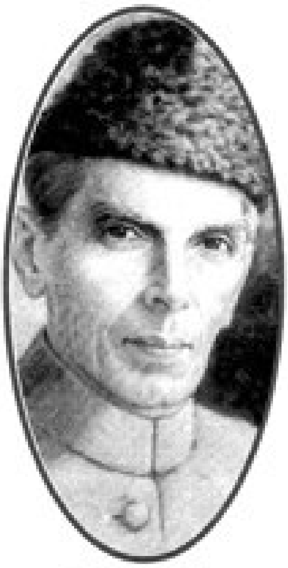

الحاق ہو گا۔ نیز اور کئی وجوہات سے ہمارے صوبوں میں کمی بیشی کا امکان ہے اس لئے اگر یونٹوں کی تعداد میں تبدیلی واقع ہو گئی تو وقتاً فوقتاً ستاروں کی تعداد بدلنا پڑے گی اور اگر نہ بدلیں تو پانچ ستارے بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔

قائد نے مسکرا کر فرمایا آپ نے ٹھیک سوچا۔

آخر کار یہی طے پایا کہ ایک ستارہ ہی رہے گا کیونکہ مسلم لیگ کے جھنڈے میں ایک ہی ستارہ ہے اور اسے بار بار تبدیل کرنا نہیں پڑے گا۔

بحریہ والوں کو اس انتخاب کی اطلاع دی گئی اور انہوں نے وہ فارمولا تیار کر دیا جس کے مطابق پاکستان کا پرچم بنایا جاتا ہے۔ اگست 1947ء کو کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم نے یہ فارمولا اسمبلی کے سامنے منظوری کیلئے پیش کیا۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک چھوٹا سا نمونے کا پرچم بھی تھا جس کی نسبت یہ طے پایا کہ اسے بطور یادگار محفوظ رکھا جائے۔

☆......☆......☆

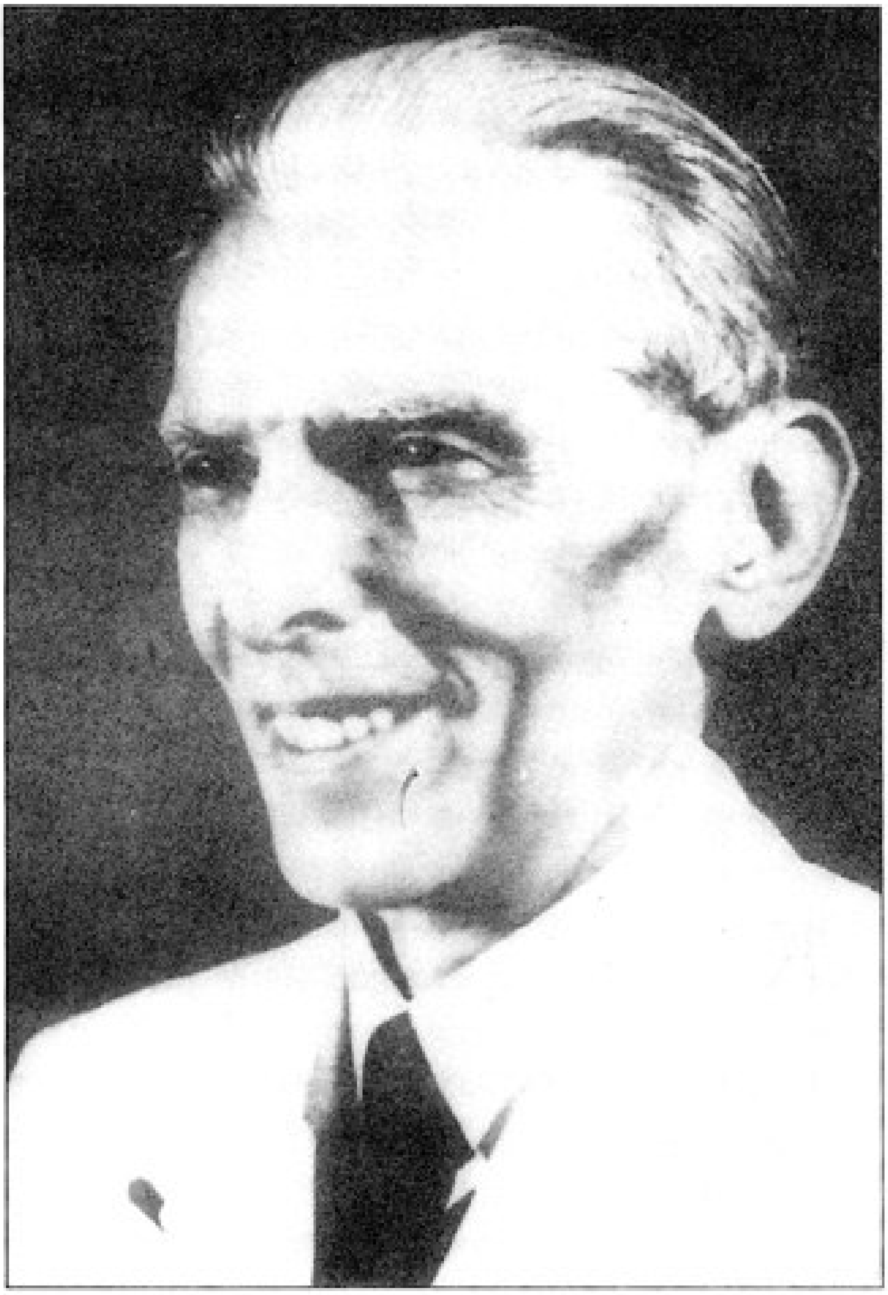

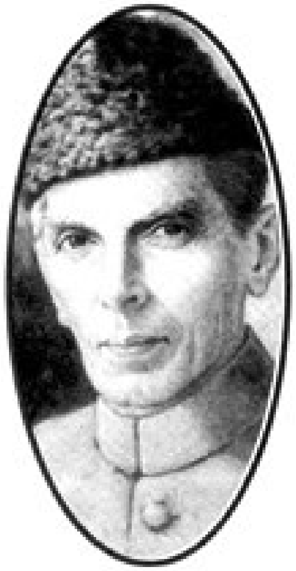

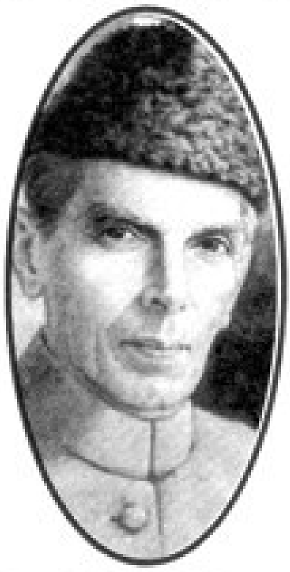

بیماری کے باوجود

قائداعظم کی صحت کے بارے میں ان کے تمام سوانح نگار متفق ہیں کہ آخری دس برسوں میں انہوں نے بے اندازہ محنت کی۔ آیئے دیکھیں جسم و جان کی بازی لگانے والے قائد کی جسمانی حالت کیا تھی اور ان کا ارادہ کس قدر پختہ تھا کہ جب تک انہوں نے اپنا مقصد یعنی پاکستان کا قیام حاصل نہیں کر لیا' وہ چین سے نہیں بیٹھے۔

"قائداعظم جناح' جیسا کہ میں انہیں جانتا ہوں" یہ کتاب کا نام ہے جسے قائد کے ساتھی اور دوست ایم اے ایچ اصفہانی مرحوم نے لکھا۔ اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"محمد علی جناح دوسروں سے کام لینے میں سخت گیر واقع ہوئے تھے' لیکن وہ اپنے آپ کو بھی اتنا ہی رگیدتے تھے جتنا کہ دوسروں کو۔ اگر کچھ کرنا ہے تو اسے جلد کرنا چاہئے۔ لگتا تھا کہ ان کے پاس ضائع کرنے کیلئے وقت نہ تھا۔ کھانا' آرام اور نیند' ان سب کو قائد کی زندگی میں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اپنے کام کو آگے بڑھانے کا یہ جذبہ اور جوش ہی انہیں ٹھیک وقت پر کھانا کھانے یا آرام کرنے سے روکتا تھا اور اسی نے بعد کے سالوں میں ان کی جسمانی قوت کو اتنی

جلدی مضمحل کرنا شروع کر دیا کہ وہ اسے بحال نہ کر سکتے تھے۔ قدرتی طور پر اپنے کمزور جسم پر اس طرح ناقابل برداشت بوجھ ڈالنے سے بالخصوص اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں قائد آسانی سے ٹی بی کا شکار ہو گئے جس نے انہیں تقریباً قبر تک پہنچا دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ملازم آکر دوپہر یا رات کے کھانے کو کہتے تھے جبکہ قائد کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہوتے یا کوئی مسودہ یا خط لکھوا رہے ہوتے تھے۔ قائد ملازموں کی بات کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ بعض اوقات ان کی بہن مس فاطمہ جناح اپنے بھائی کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتی تھیں اور آکر کہتی تھیں کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے' لیکن وہ بہت اخلاق سے جواب دیتے تھے کہ ''بس چند منٹ اور'' یا جاؤ'' شروع کر دو۔ میں ذرا دیر میں تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں گا۔'' انہیں پہلے اپنا کام کرنا ہوتا تھا اور بعد میں کھانے یا کسی اور چیز کا خیال کرنا۔

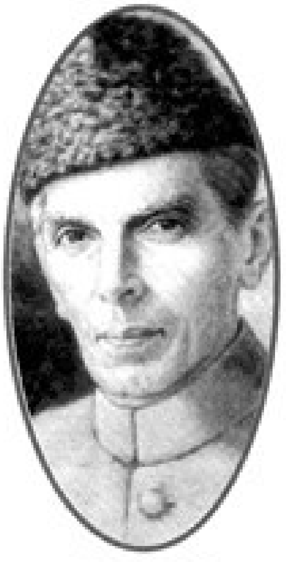

آگے چل کر اصفہانی لکھتے ہیں: ''مجھے یاد ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن اور بنگال کے ایک محترم سیاسی رہنما خواجہ ناظم الدین اپریل 1946ء کے پہلے ہفتے میں نئی دہلی میں سخت بیمار پڑ گئے اور ایک ہلکے سے دورۂ قلب کے بعض آثار نمایاں ہو گئے۔ انہیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا اور ایک پرائیویٹ مریض کے طور پر داخل کرا دیا گیا۔ ہم لوگ مسٹر جناح کے مکان پر جمع تھے کہ ہم نے یہ خبر سنی کہ ان کی بیماری خطرناک ہے راجہ صاحب محمود آباد اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیمار دوست اور رفیق کار کو جا کر دیکھیں۔ ہم نے مسٹر جناح کو ہسپتال جانے کی اس تجویز سے مطلع کیا اور ان سے پوچھا کہ آیا وہ بھی خواجہ ناظم الدین کی عیادت کیلئے جانا پسند کریں گے۔''

اصفہانی لکھتے ہیں کہ: ''ہم قائد کا یہ جواب سن کر دم بخود رہ گئے کہ اگر میں نے ایک مرتبہ بیمار اور علیل لوگوں کی عیادت کو جانا شروع کر دیا تو مجھے اپنا زیادہ تر وقت اسی فریضے کی ادائیگی میں صرف کرنا پڑے گا اور میرے پاس اس اہم کام کیلئے کافی وقت نہ بچے گا جس پر برصغیر

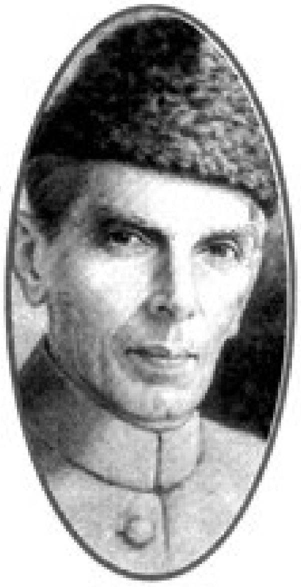

کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ قیام پاکستان کا آخری مرحلہ سر پر ہے اور مجھے واقعی فرصت نہیں۔"

یہ کہہ کر قائد پھر کاغذات کے اس ڈھیر کی طرف متوجہ ہو گئے' جو ان کی لائبریری میں رکھی ہوئی سبز چمڑے کی کرسی کے سامنے جمع ہو چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں کہا: "آپ جانا چاہتے ہیں تو جائیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خواجہ صاحب جلد صحت یاب ہو جائیں مگر سچ مانیں میرے پاس جانے کا وقت نہیں ہے۔"

"میرا بھائی!" یہ کتاب کا نام ہے' جس میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے چہیتے بھائی کے بارے میں لکھا' وہ کہتی ہیں: "قدرت نے میرے بھائی کو بے پناہ قوت اور توانائی عطا کی تھی۔ اس خوبی کو ان کے بظاہر ناتواں اور کمزور جسم کے سپرد کر دیا گیا تھا مگر یہ جسم ان کے قوت اور صلاحیتوں سے بھرپور ذہن اور قوت ارادی کی تیز رفتاری کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ تھی کہ قائد کی صحت ایسی نہیں تھی جو بے پناہ مصائب و مشکلات کے مقابلے میں ان کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کا ساتھ دے سکتی اور انہیں وہ جسمانی قوت فراہم کر سکتی جس کی انہیں ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی قوم کی اٹل تقدیر کی جانب رہنمائی کرنے کی راہ میں حائل مشکلات پر قابو پا سکیں۔"

محترمہ لکھتی ہیں کہ زندگی کے آخری دس برس کے دوران قائد کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا جبکہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاؤں کے باوجود انہوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا۔ وہ آرام کرنے یا اپنے کام کی رفتار میں کمی کرنے سے مسلسل انکار کرتے تھے۔ وہ زندگی کی توانائی کے باقی ماندہ ذخیرے کو کسی کھلنڈرے بچے کی طرح بے دریغ لٹاتے رہے۔ ان کی خرابی صحت سے خوفزدہ ہو کر میں کبھی ان سے طویل اوقات میں اتنا زیادہ کام نہ کرنے کی التجا کرتی یا

ہندوستان بھر کے مسلسل طوفانی دوروں کا پروگرام کچھ عرصے کیلئے ملتوی کردینے کا مشورہ دیتی تو وہ کہتے:

"کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے ایسے وقت چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو؟"

انہیں کمال حاصل تھا کہ مخاطب کی طرف سے بنا بنایا مقدمہ ایک اچھے وکیل کی طرح ایک ہی جملے میں اڑا دیتے۔ میں کہتی: "آپ کی زندگی قیمتی ہے اور آپ کو اس کی مناسب دیکھ بھال کرنی چاہئے۔" ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے' وہ کہتے: "فرد واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے جبکہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقا کے بارے میں پریشان ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسلمان قوم کا سب کچھ خطرے میں ہے؟"

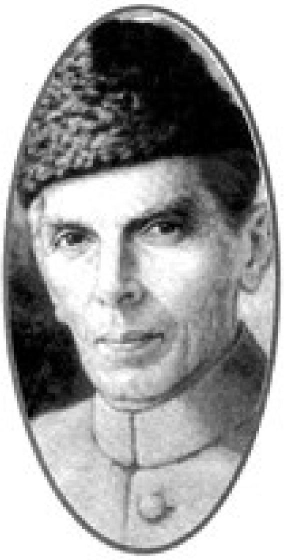

☆......☆......☆

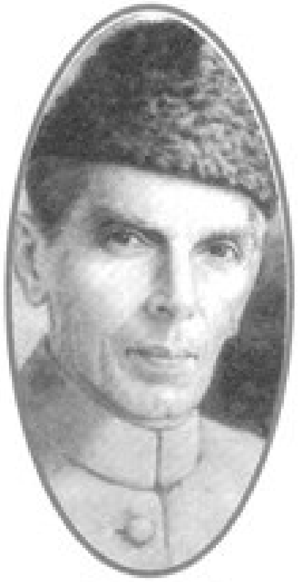

گاڑی میں بیماری کا حملہ

محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب "میرا بھائی۔" میں قائد کی صحت کے بارے میں مزید لکھتی ہیں: "1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت فروری 1937ء میں ملک بھر میں عام انتخابات کرائے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ پہلی مرتبہ اپنے اُمیدوار کھڑے کر رہی تھی۔ اس مرحلے پر مسلم لیگ نہ تو پوری طرح منظم تھی اور نہ اس کا پیغام مسلمانوں تک پوری طرح پہنچایا جا سکا تھا۔ چنانچہ رائے عامہ کو استوار اور منظم کرنے کا بوجھ قائداعظم کے کندھوں پر آن پڑا۔ عوام کے اجتماعات اور جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے قائد جس قدر زیادہ سفر کرتے' اسی قدر ان سے مزید جلسوں کے لئے وقت مانگا جاتا۔"

فاطمہ جناح کا کہنا ہے: "قائد جہاں بھی گئے میں ان کے ہمراہ تھی۔ ان کے جلسوں میں شریک ہونے والے لوگوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر نہ صرف مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے بلکہ محمد علی جناح کی ذاتی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ ایک پرجوش رہنما کی طرح اپنی گرجدار آواز میں کہتے۔ "سب کو جان

لینا چاہئے کہ مسلم لیگ قائم رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو درہم برہم کرنے کی تمام کوششوں کے مقدر میں ناکامی لکھ دی گئی ہے"۔

اس قسم کے امید افزاء الفاظ کے ساتھ جب وہ اپنی تقریر ختم کرتے تو ہجوم بے اختیار نعرے لگاتا۔ "مسلم لیگ زندہ باد' قائداعظم زندہ باد۔"

1940ء میں جب سے مسلم لیگ نے لاہور میں اپنی قرارداد منظور کی تھی' جو قراردادِ پاکستان کے نام سے معروف ہوئی' تب سے کام کی زیادتی کے باعث قائد اپنی گرتی ہوئی صحت کا بھی خیال نہ رکھتے۔ ان کی واحد قوت ان کے منتشر اور غیر منظم پیروکار تھے۔ ایک سیاستدان کو اپنی جدوجہد کے دوران بے پناہ سفر کرنا پڑتا ہے' طویل اور تکلیف دہ حالات میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور یہ اُمور قائد کی صحت پر بہت گراں گزرتے تھے مگر انہوں نے ان سب مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ پانچ فٹ ساڑھے دس انچ قد کے ساتھ ان کا معمول کا وزن 112 پونڈ تھا' مگر اب وہ ایک ایک اونس کر کے اپنا وزن کھو رہے تھے۔ وہ اپنی صحت اور دیگر ذاتی معاملات سے قطعی بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نجی معاملات ان کے کام میں حائل ہوں۔ میں نے ایک بار انہیں دلائل سے اور التجاؤں کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ قابل ڈاکٹروں سے مشورہ کریں اور اپنی صحت کی جانب توجہ دیں' مگر ان کی مضبوط قوت ارادی کے سمندر کے سامنے بند باندھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔"

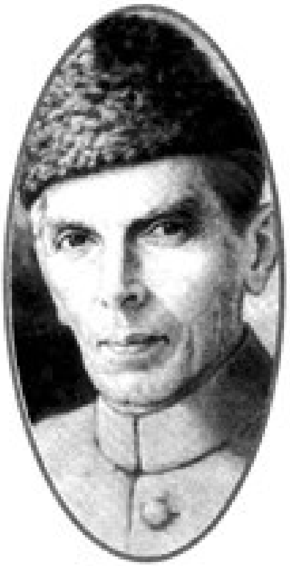

محترمہ لکھتی ہیں: "کئی روز سے انہیں بخار آ رہا تھا' اس کے باوجود ہم اوائل نومبر 1940ء میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ قائد رات کا کھانا کھا چکے تھے اور ٹرین تاروں بھرے صاف شفاف آسمان کے نیچے تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ تھی۔ بھائی بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک زور سے چلا اُٹھے' جیسے کسی نے لوہے کے سرخ دہکتے ہوئے ٹکڑے سے ان کا جسم داغ دیا ہو۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور اس طرح بلبلا اُٹھنے کی وجہ

دریافت کی۔ درد کی شدت نے ان کی قوت گویائی سلب کرلی تھی۔ چنانچہ کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے انگلی سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ظاہر ہے کہ درد ناقابل برداشت تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ چلتی ہوئی گاڑی میں انہیں طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے خیال سے بھائی کے جسم کے متاثرہ حصے کو آہستہ آہستہ ملنا شروع کیا مگر ایسا کرنے سے ان کی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہوگیا' مایوس ہوکر میں نے یہ کوشش ترک کردی۔ مجھے اُمید تھی کہ ٹرین کسی سٹیشن پر رکے گی تو متاثرہ حصے کی ٹکور کرنے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کیا جاسکے گا۔ لمبے بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ گزرتے رہے' حتیٰ کہ ٹرین کے بریکوں کی چرچراہٹ سنائی دینے لگی اور بالآخر گاڑی ایک سٹیشن پر رُک گئی۔

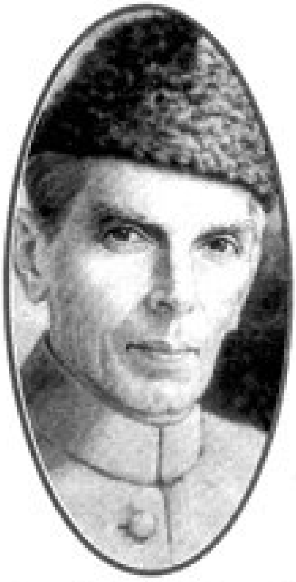

میں نے باہر جھانکا گارڈ کو بلایا اور کہا کہ وہ فوراً گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کرے اور اُسے ہمارے کمپارٹمنٹ میں بھجوادے۔ بوتل آگئی تو میں نے اسے کپڑے میں لپیٹ کر درد والی جگہ پر آہستہ آہستہ ٹکور کرنا شروع کی اور یہ جان کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس سے درد کسی حد تک کم ہوگیا ہے۔

ٹرین علی الصبح دہلی پہنچی اور جلد ہی ہم اپنی رہائش گاہ 10 اورنگزیب روڈ پہنچ گئے۔ میں نے بھائی کی کار سے بستر تک جانے میں مدد کی۔ پھر ٹیلی فون پر فوراً ڈاکٹر کو بلایا' تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ بھائی کے پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آگیا ہے اور انہیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی طور پر آرام کرنا چاہئے۔ جونہی ڈاکٹر گیا' بھائی نے مجھ سے کہا: "کس قدر بدقسمتی کی بات ہے' اسمبلی کا یہ اجلاس بہت اہم ہے' میری وہاں موجودگی نہایت ضروری ہے اور ایک میں ہوں کہ بستر میں جبری آرام کا پابند کردیا گیا ہوں۔"

قائد دو روز تک تو بستر میں رہے مگر اس کے بعد دوبارہ اسمبلی کی تقریر کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔"

☆……☆……☆

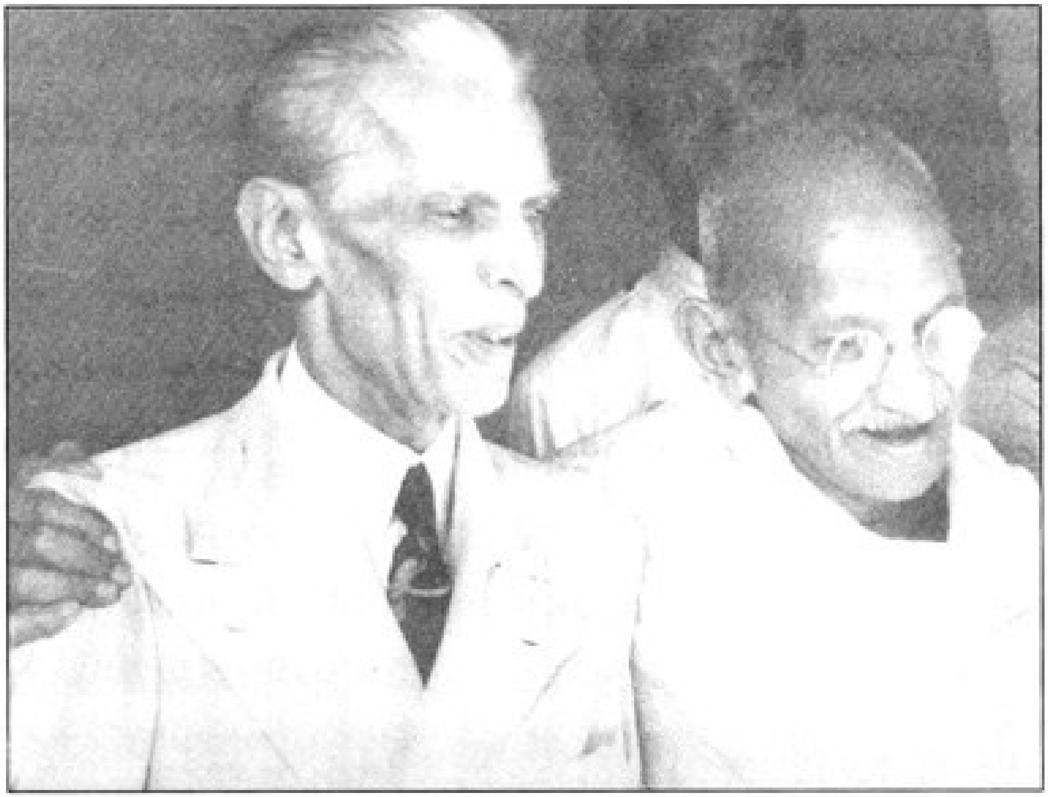

قائداعظم محمد علی جناح ایم کے گاندھی کے ہمراہ
شملہ کانفرنس 25 جون 1945ء

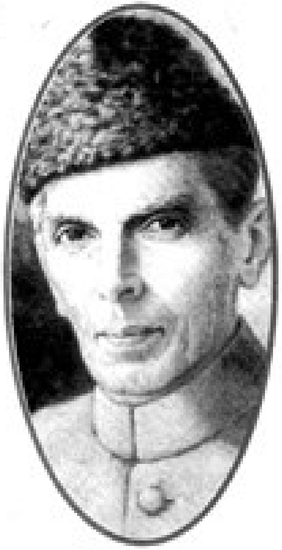

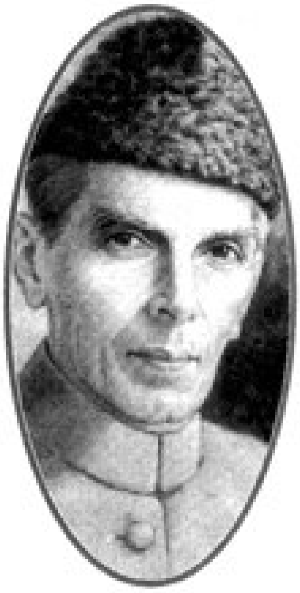

جسم و جان کی بازی

جدوجہد آزادی کے آخری دس برس میں قائداعظم کی جسمانی صحت اور اس کے مقابلے میں ان کی عزت وہمت کی روداد کا ذکر ہو رہا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب ''میرا بھائی'' میں لکھتی ہیں:

''دہلی میں سنٹرل اسمبلی کا نہایت اہم اجلاس تھا اور جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت کے ضمن میں مسلم لیگ کا مؤقف بیان کرنے کی ذمہ داری قائداعظم نے اپنے سر لی تھی۔ میں نے معزز مہمانوں کی گیلری میں سے قائد کو اپنی نشست سے خطاب کرنے کیلئے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو رہی تھی کہ کیا واقعی وہ اپنی تمام تر توانائیاں جمع کر لینے کے باوجود چند منٹ سے زیادہ تقریر کر سکیں گے۔ لیکن قائد نے اپنی تقریر کا آغاز ایسے لہجے اور انداز سے کیا جس سے تھکن غائب تھی۔ جب انہوں نے اپنے دلائل کا آغاز کیا تو تھکاوٹ کے بقیہ آثار بھی یکایک غائب ہوگئے اور وہ جلد ہی اپنے اصل رنگ میں آگئے۔

قائداعظم تقریباً ایک گھنٹہ بولے اور وہ بدستور کھڑے تھے۔ جبکہ میں ان کی صحت

کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھی' جو ہرگز اطمینان بخش نہیں تھی۔ جب ہم اسمبلی سے بذریعہ کار گھر کی جانب روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور ان کی انگلیاں سگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے ہیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے جاکر بستر میں لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ ان میں لباس تبدیل کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

میرے خیال میں پھیپھڑے کی جھلی پر ورم کا حملہ بالآخر ان کیلئے مرض الموت ثابت ہوا۔ وہ اس مرض پر قابو پاسکتے تھے بشرطیکہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے۔ اگر ان کے کام کرنے کے اوقات متعین اور منظم ہو جاتے' کاش وہ آندھیوں اور بارشوں میں باہر نکلنے میں احتیاط کرتے مگر وہ تو برصغیر کے تقریباً مسلسل دورے پر رہتے تھے۔ اس مرض کے بعد وہ سردی سے الرجک ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ سردی کے معمولی حملے سے بھی کئی کئی روز بخار اور کھانسی کی اذیت میں مبتلا رہتے تھے۔"

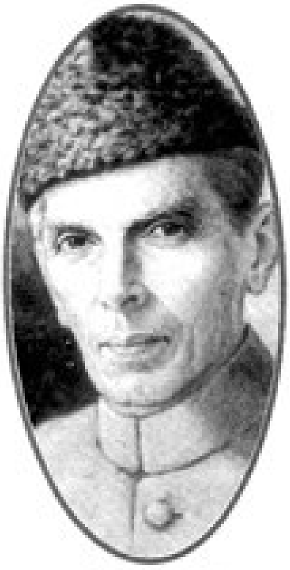

محترمہ فاطمہ جناح آگے چل کر لکھتی ہیں:

"چند ماہ بعد اپریل 1941ء میں ہم بمبئی سے مدراس جا رہے تھے جہاں قائد کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی کہ قائد اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانہ میں گئے۔ یہ دیکھ کر صدمے سے میرا برا حال ہوگیا کہ وہ چند قدم چلنے کے بعد ٹرین کے لکڑی کے فرش پر نڈھال ہو کر گر پڑے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا: "بھائی کیا بات ہے؟" ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی' وہ بولے: "میں بے حد کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔" انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر خود کو اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی برتھ کی جانب بڑھے۔ خوش قسمتی سے ٹرین چند ہی منٹ کے دوران کسی اہم جنکشن پر پہنچ کر رک گئی' جہاں ہزاروں جوشیلے مسلم لیگی کارکن "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے

کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور چلا کر کہا: "شور نہ مچائیں' آپ کے قائد تھکاوٹ اور بخار کے باعث گر پڑے ہیں۔ فوراً کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔"

چند ہی منٹ کے اندر ڈاکٹر آ گیا' جس نے قائداعظم کا معائنہ کیا اور بولا "جناب آپ کو معمولی نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے' خطرے کی کوئی بات نہیں۔ مگر آپ کو کم از کم ایک ہفتہ تک کسی بھی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دوں گا۔ آپ کو ایک ہفتے تک بستر میں مکمل آرام کرنا چاہئے۔"

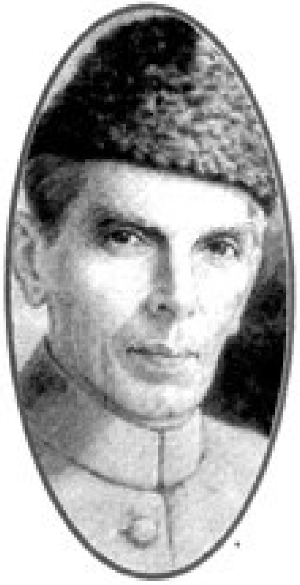

لیکن جلد ہی ہم مدراس میں تھے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کیلئے ہزاروں مندوبین جمع تھے۔ قائداعظم اس قدر کمزور تھے کہ پہلے روز کے عام اجلاس سے خطاب نہ کر سکے مگر دوسرے روز انہوں نے صدارتی خطبہ دینے پر اصرار کیا۔ میں نے انہیں برعکس مشورہ دیا مگر وہ اپنے فیصلے پر اڑ گئے۔ اس پر میں نے مختصر تقریر کی درخواست کی۔ قائد نے یقین دلایا "ہاں میری تقریر بہت مختصر ہو گی۔"

جونہی وہ خطاب کیلئے کھڑے ہوئے اجلاس پر گہری خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے تحریری نوٹس کے بغیر فی البدیہہ تقریر کی۔ انہوں نے ہر نکتے کو وضاحت سے بیان کیا اور ایسی آسان اور شستہ زبان استعمال کی کہ عام شخص بھی ان کا مفہوم بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ قائد کا انداز ایک ایسے لیڈر کا تھا جو نہ صرف مضبوط قوت فیصلہ اور ثابت قدمی کی خوبیوں سے مالا مال ہو بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات سے بھی بخوبی آگاہ ہو۔ ان کا خطاب اختصار سے بہرحال کوسوں دور تھا کیونکہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک تقریر کرتے رہے۔ یہ رہنما جو صاحب فراش ہونے کے باوجود اپنے عوام کے پاس جانے کیلئے بے قرار تھا' ہندوستانی مسلمانوں کی منزل مقصود کی انتہائی جرأت کے ساتھ وضاحت کر رہا تھا۔

فاطمہ جناح لکھتی ہیں: "مجھے ان کی کارکردگی پر فخر تھا' مگر اس فخر کے پیچھے ان کی

خرابی صحت کا خدشہ بھی منڈلا رہا تھا۔ پھر بھی میں دیکھ رہی تھی کہ جذبے کے باعث اس عظیم اجتماع کے بے پناہ جوش و خروش نے ان کے تھکے ماندے جسم کو انتہائی طاقتور ٹانک فراہم کیا ہے۔ وہ کام کے رش میں، جسے انہوں نے برضا و رغبت قبول کر رکھا تھا، اپنی کمزوری، تھکن اور بخار کو بھول گئے تھے۔

کتاب "میرا بھائی" کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو: "قیام پاکستان سے پہلے کے سات برس قائد کی زندگی کا مصروف ترین اور انتہائی ہنگامہ خیز دور تھا۔ میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی دیکھتی تھی کہ وہ بمشکل بستر علالت سے اٹھتے۔ ان کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کے آثار نمایاں ہوتے حالانکہ وہ خاصا سمارٹ لباس پہنتے تھے۔ ہم عام جلسوں سے خطاب کرنے کیلئے اپنی کار میں روانہ ہو جاتے۔ سارا راستہ قائد نہایت خاموش رہتے۔ اس خاموشی کا مقصد خیالات کو مجتمع کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی توانائی کا ایک ایک اونس بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔"

قارئین کرام! اس روداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کے حصول کیلئے کس طرح جسم و جان کی بازی لگا رکھی تھی۔

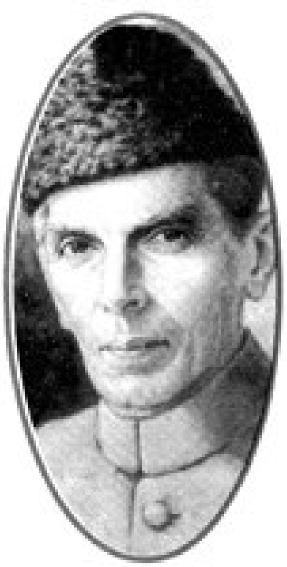

☆......☆......☆

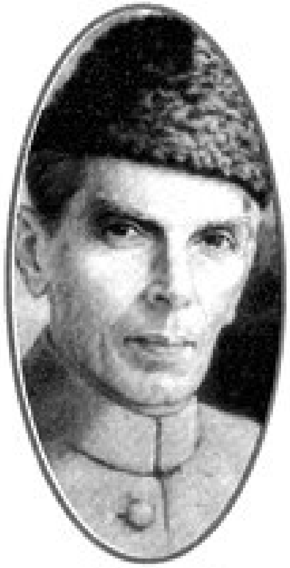

خوشامد سے نفرت اور انسان دوستی

ایم اے ایچ اصفہانی کی کتاب کا نام ہے۔ "قائداعظم جناح" جیسا کہ میں جانتا ہوں جناب اصفہانی کو قائد کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور انہوں نے قائد کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کو بہت دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب میں سے چند واقعات پیش خدمت ہیں اصفہانی لکھتے ہیں:

"اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح ایک بہت بڑے انسان تھے، تاہم وہ تعریف اور خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جب ان کے مداح تعریف کی حدود سے آگے نکل جاتے اور بعض انہیں امیر المومنین کے لقب یعنی اس لقب سے یاد کرتے جو اسلامی تاریخ میں خلفاء کو دیا جاتا تھا، تو قائد فوراً کہہ دیتے تھے: 'مہربانی سے مجھے ایسا نہ کہیں، کیونکہ مجھے تمہارے مذہبی اور روحانی ہادی یا رہنما ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں صرف تمہارا سیاسی لیڈر رہوں اور بس۔"

اصفہانی مزید لکھتے ہیں: مریض کی حیثیت سے قائد ضرور تکلیف میں رہے ہوں گے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں تو وہ یقیناً ایسے ہی تھے۔ قائد نازک بدن تھے۔ تاہم ان کا دماغ اور جسم دونوں ضرورت سے زیادہ کام کرتے تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ پلنگ پر آرام نہ

کر سکتے تھے اور فرض کی ادائیگی میں اکثر اپنے ڈاکٹروں کے احکام کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس کی تشریح کیلئے میں ایک مثال کا ذکر کروں گا۔

پاکستان بننے کے بعد جب قائد زیارت میں بستر علالت پر تھے' تو بھی ان کے گرد فائلوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا اور پوچھا کہ یہ فائلیں کیسی ہیں تو انہوں نے بتایا کہ ان میں سے زیادہ تر پاکستان میں شامل ہونے والی ریاستوں کی ہیں اور یہ قلمدان میرے سپرد ہے۔ میں نے التجا کی کہ وہ ان فائلوں کو بھول جائیں اور مکمل آرام کریں تاکہ ان کے جسم کو بیماری کا مقابلہ کرنے میں مدد مل سکے' تو انہوں نے جواب دیا کہ کاغذات دیکھنے کے کام سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

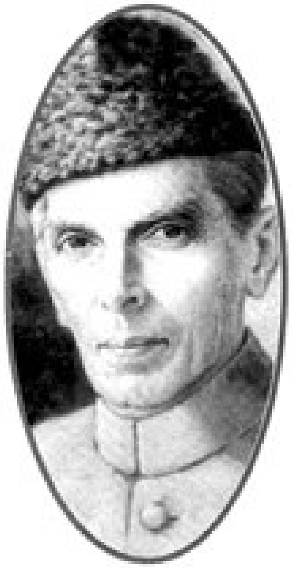

شام کے وقت میں ان کے سپیشل فزیشن ڈاکٹر الٰہی بخش سے ملا تو ان سے کہا کہ آپ قائداعظم کو ایسے کام میں اپنی باقی ماندہ قوت ضائع کرنے کی اجازت نہ دیں۔ جن کی دیکھ بھال دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ میرے مریض بہت خود رائے واقع ہوئے ہیں اور میری نصیحت پر کان نہیں دھرتے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے فائلوں اور قائداعظم کے سیکرٹری کو ان کے کمرے سے دور رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن ناکام رہا' مجبوراً مجھے اپنے آپ کو اس عظیم انسان کے عزم وارادے کا عادی بنانا پڑا۔

آگے چل کر جناب اصفہانی لکھتے ہیں۔ قائداعظم کو شاذ و نادر ہی آرام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ بہت محنت سے کام کرتے تھے اور 1942ء کے بعد سے تو انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بخشا ہی نہیں بلکہ صحیح طور پر خود کو گھسیٹ کر قیام پاکستان کی منزل تک پہنچایا۔ 20 مئی 1944ء کو سری نگر سے انہوں نے مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ:

''اس تبدیلی اور آرام سے یہاں آنے کے چند دنوں کے اندر ہی مجھے اپنی طبیعت بہت بہتر محسوس ہو رہی ہے۔ سات برس کی سخت مشقت کے بعد یہ پہلی چھٹی ہے جو میں لے رہا

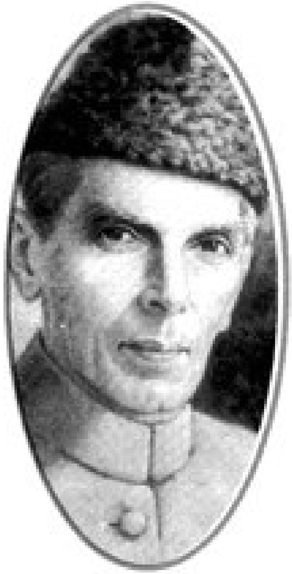

ہوں اور جو میرے لئے بہت ضروری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جب تک بھی ممکن ہو میں یہاں رہ سکوں گا۔" لیکن چند روز بعد 15 اپریل 1945ء کو مجھے خط لکھا:

"میں آپ کو محض اطلاع دینے کیلئے لکھ رہا ہوں کہ میری طبیعت بہتر ہے اور دو دن کے اندر میں واپسی کیلئے روانہ ہو جاؤں گا۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ آپ بنگال کے واقعات سے مجھے مطلع کرتے رہیں گے۔ اگرچہ آج کل میں کام نہیں کر رہا تاہم میں کسی بھی ایسے اہم واقعے سے جو رونما ہو بالکل بے پروا نہیں رہ سکتا۔" اسی کتاب سے ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش خدمت ہے۔ جناب اصفہانی لکھتے ہیں:

ایک روز جب دن کا کام ختم ہو چکا تھا' قائد اعظم شام کے وقت میرے کلکتہ کے مکان کے برآمدے میں بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اس نصیحت کا ذکر کیا جو ایک مرتبہ آغا خان نے انہیں اس وقت کی تھی جب وہ دونوں نوجوان تھے۔ قائد نے کہا کہ مجھے اس نصیحت سے بہت فائدہ پہنچا' نصیحت یہ تھی کہ کسی کو بھی کسی سے ملنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے' خواہ آپ اسے کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں یا اس کے خیالات سے کتنا ہی غیر متفق کیوں نہ ہوں۔ آغا خان نے قائد سے ہنستے ہوئے کہا کہ "جناح" اگر برے سے برا یا بدترین مخالف حتیٰ کہ شیطان بھی تم سے ملنا چاہے تو تمہیں اس کی ملاقات سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ تم اس کے خیالات سے اتفاق کرو یا اس کی نصیحت قبول کرو۔ تمہیں کیا معلوم شاید وہ کوئی ایسی بات بتا سکے جو تمہارے فائدے کی ہو۔ لہٰذا سب کو سنو مگر کرو وہی جسے تم درست سمجھتے ہو۔

جناب اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائد نے مجھ سے کہا: "تمہیں بھی یہی حکمت عملی اختیار کرنا چاہئے بلکہ تمہیں چاہئے کہ اسے اپنی زندگی کا ایک زریں اصول بنالو۔ ہاں یہ بات یاد رکھو کہ مخالف کی بات سے کچھ سیکھو۔"

آگے چل کر اصفہانی لکھتے ہیں' مجھے اس نصیحت سے بہت فائدہ پہنچا۔

ایک اور واقعہ جو جناب اصفہانی نے اپنی کتاب میں لکھا کچھ یوں ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح ذاتی طور پر دولت مند تھے' لیکن ساتھ ہی کفایت شعار بھی تھے۔ وہ فضول خرچی اور دولت کے بیکار مظاہرے کے خلاف تھے۔ قسمت جیسے جیسے ان پر مہربان ہوتی گئی وہ اپنی زندگی کو سنوارتے رہے۔ ان کا مکان نہایت نفیس تھا اور بہترین مقام پر واقع تھا اور اسے خوش ذوقی سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن بھڑکیلے طریقے پر نہیں۔ وہ بے عیب لباس پہنتے تھے اور ان کی مہمان نوازی ہمیشہ مناسب و موزوں ہوتی تھی۔ لیکن وہ فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ وہ روپیہ ضائع کرنے کے قائل نہ تھے' خواہ وہ ان کا اپنا ہو' دوسروں کا یا حکومت کا۔ وہ اس امر کی بہت پابندی کرتے تھے کہ اپنے گھر میں زائد از ضرورت روشنیوں کو 'گل کر دیں اور اپنے میزبان کے گھر میں بھی اگر وہ روشنیاں ان کیلئے جلائی گئی ہوں۔ جب وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے ان کا یہ معمول تھا کہ غیر ضروری روشنیوں کو 'گل کر دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ ''روپیہ ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر وہ عوام کا روپیہ ہو تو یہ اور بھی بڑا گناہ ہے۔''

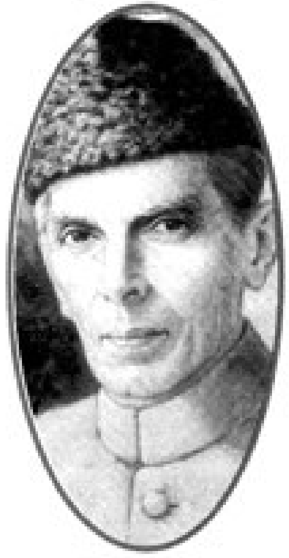

چنانچہ میں نے انہیں اپنے گھر میں' میرے مکان میں اور گورنر جنرل کے مکان میں خود اٹھ کر بتیاں 'گل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اصفہانی لکھتے ہیں: البتہ میں یہاں قائد کی انسان دوستی کی ایک مثال بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں۔ ان کی وفات کے بعد قائد کے وصیت نامے سے یہ پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت کا ایک بڑا حصہ لوگوں کی بھلائی کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس وقف سے کئی تعلیمی اور دیگر اداروں کو معقول رقمیں ملتی رہی ہیں۔ گویا ان کی انسانیت کا اظہار ایک ایسی شکل میں ہوا جس سے چند افراد نہیں بلکہ عوام کی یکے بعد دیگرے آنے والی نسلیں استفادہ کریں گی۔ یہ خیرات کی بہترین صورت ہے جسے اسلامی اصطلاح میں صدقہ جاریہ کہا جاتا ہے۔

☆......☆......☆

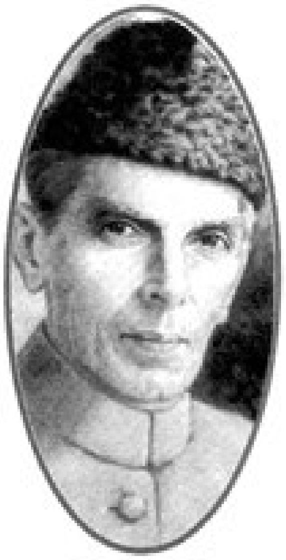

ترقی میں عورتوں کا کردار

قائداعظم کی زندگی سے دلچسپ واقعات کا سلسلہ پیش خدمت ہے۔ قائد کے دوست جناب ایم اے ایچ اصفہانی اپنی کتاب "قائداعظم جناح' جیسا کہ میں انہیں جانتا ہوں" میں لکھتے ہیں:

ہمارے قائد صاف ستھری سیاست پسند کرتے تھے' تاہم بڑی بات یہ ہے کہ وہ در حقیقت سیاست کے کھیل کو بھی آداب کے ساتھ کھیلتے تھے۔

1946ء میں جب ان کے ہمراہ بنگال اور آسام کے دورے پر گیا تو سلہٹ میں آسام کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر' بعد میں بننے والے مشرقی پاکستان کے مولانا بھاشانی تھے' جو ایک معروف و مشہور سیاسی شخصیت تھے اور آگے چل کر بہت مشہور ہوئے۔ مولانا بھاشانی قائداعظم سے ملنے آئے۔ آسام میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا حال بیان کرنے اور قائداعظم کو یہ اطمینان دلانے کے بعد کہ آسام کے مسلمان پاکستان کیلئے جدوجہد میں پوری مدد کریں گے' مولانا بھاشانی نے بہت رقت سے ہندوؤں کی بے انصافی اور تشدد کے واقعات اور مسلمانوں کے مصائب بیان کئے۔ یہ بتاتے وقت مولانا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کے

خلوص کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور ایسی رقت طاری ہوئی کہ اپنی آنکھوں کو خشک رکھنے کیلئے مجھے اپنے آنسوؤں کو روکنا پڑا۔

اسی شام جب ملاقاتیوں کا ہجوم ختم ہو گیا اور قائد اعظم اپنے کمرے میں تنہا رہ گئے تو کھانے سے پہلے میں ان سے بات کرنے گیا۔ میں نے اس گفتگو کا ذکر کیا جو دوپہر کو مولانا بھاشانی سے ہوئی تھی اور انہیں بتایا کہ صوبائی صدر کے خلوص کا مجھ پر کتنا گہرا اثر ہوا تھا اور یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی ہمارے پاس مولانا بھاشانی جیسے باعمل اور پرجوش صدر ہوتے' جو تکلیف اٹھانے اور لیگ کی خاطر قربانیاں دینے کو تیار ہوں اور ذاتی مفاد یا بڑائی کا کوئی خیال نہ کریں تو مسلم لیگ یقیناً ایک طاقتور اور بہت زیادہ فعال تنظیم بن جائے گی۔

اصفہانی لکھتے ہیں: اس پر قائد کہنے لگے کہ "مولانا کے بارے میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک اس طرح کے آدمی جذباتی مقرر تو ہو سکتے ہیں' رہنما بننے کے قابل نہیں ہوتے اور ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی مفید کام کر سکیں گے۔"

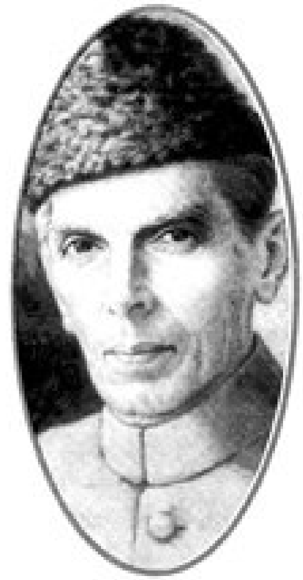

پھر کچھ رک کر قائد نے کہا: "زیادہ جذباتی باتوں اور رقیق القلبی کیلئے سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ میرے بیٹے' سیاست شطرنج کی بازی ہے۔ اور برائیوں کا خاتمہ آنسوؤں سے نہیں بلکہ محنت' جرأت اور عزم سے ہو سکتا ہے۔ رقیق القلبی کا نل کھولا تو آسانی سے جا سکتا ہے لیکن اسے بند کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ الٹا رقت کی بدولت ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے کسی معقول حکمت عملی کا خون ہو جائے۔"

قائد نے یہ بھی کہا: "شاید مولانا صاحب ایک اچھے واعظ ہیں اور اپنے سامعین کی آنکھوں میں آنسو لا سکتے ہیں' لیکن وہ اچھے رہنما ثابت نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص بحران کے زمانوں میں جبکہ دماغ کو ٹھنڈا اور آنکھوں کو خشک رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ انسان صاف طور سے دیکھ سکے اور فیصلے کر سکے۔"

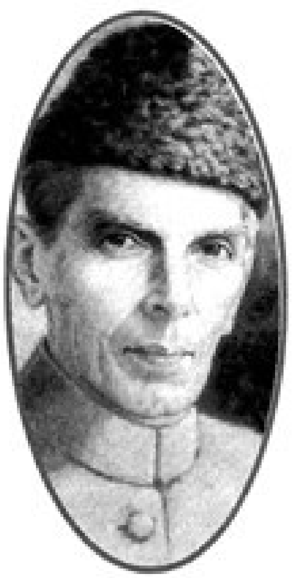

قائداعظم اور خواتین کے حوالے سے اصفہانی لکھتے ہیں: ”جہاں تک عورتوں اور ان کے دائرۂ عمل کا تعلق ہے‘ قائداعظم ان کیلئے زیادہ آزادی کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی اپنی گھروں کی چاردیواری کے باہر کے معاملات میں دلچسپی لینے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ قائد اوروں کو جو تلقین کرتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بہن مس فاطمہ جناح ان کے ساتھ زیادہ تر عام جلسوں میں جایا کرتی تھیں اور ڈائس پر ان کے قریب بیٹھتی تھیں۔ قائد مسلمان عورتوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ باہر نکلیں‘ عوام کی خدمت کریں اور اپنی بہنوں کو اس طرح منظم کریں کہ وہ اپنے گھروں کی حدود سے باہر قومی زندگی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ قائد کا نظریہ تھا کہ ترقی کیلئے یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورتیں معاشرے کی فلاح و بہبود میں پورا پورا حصہ لیں۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی تشکیل کے وقت بھی قائد عورتوں کو نظرانداز نہ کرتے تھے‘ چنانچہ بیگم محمد علی‘ بیوہ مولانا محمد علی جوہر‘ 28مارچ 1947ء تک اس مجلس کی رکن رہیں‘ البتہ وفات نے انہیں برصغیر میں ایک مسلم وطن پاکستان کے قیام کا منظر دیکھنے کی مہلت نہ دی۔

☆......☆......☆

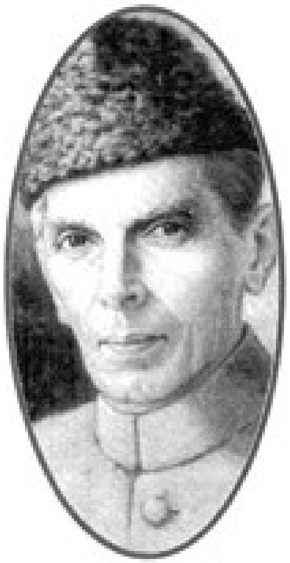

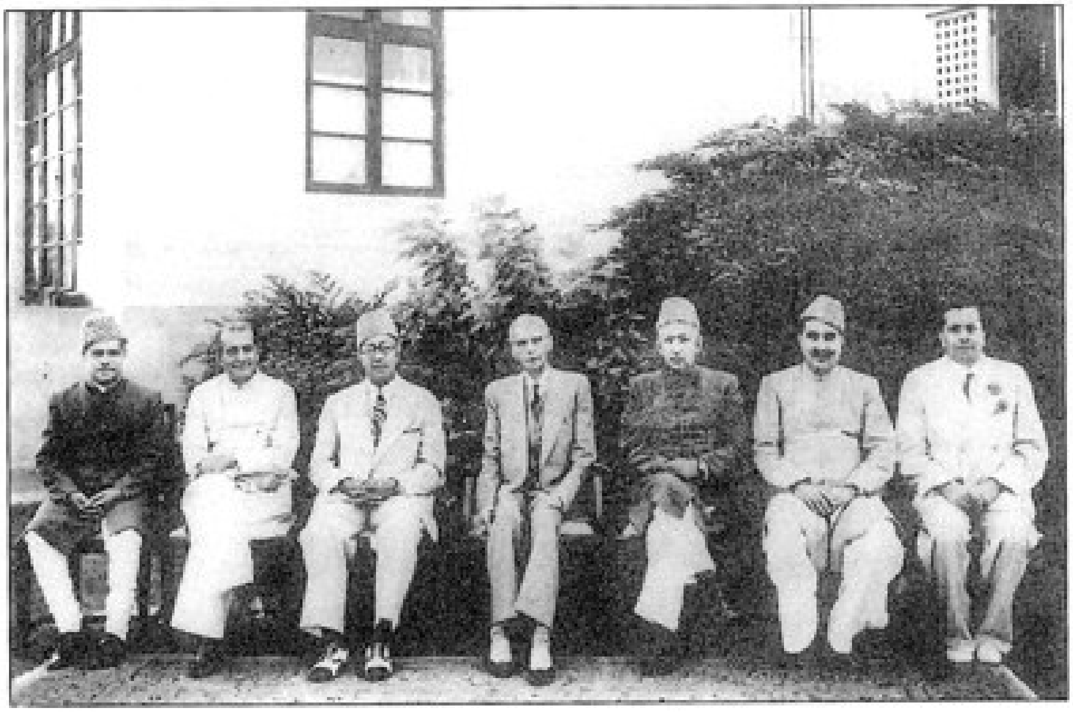

قائداعظم پاکستان کی پہلی کابینہ کے چند وزراء کے ساتھ
(دائیں سے بائیں) پیرزادہ عبدالستار، سردار عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، قائداعظم محمد علی جناح
لیاقت علی خان، غلام محمد اور فضل الرحمان۔

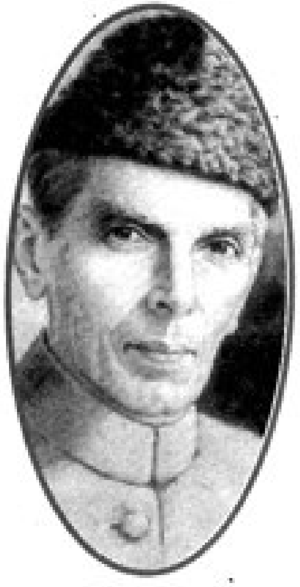

شام زندگی

قائداعظم کی زندگی پر ایک مستند کتاب ہیکٹر بولائتھو کی "محمد علی جناح" ہے۔ اس کتاب کے آخری دو ابواب قائد کے آخری ایام سے متعلق ہیں اور جی چاہتا ہے کہ انہیں حرف بحرف دیکھنے اور سننے والوں کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ آخری سے پہلے باب کا نام ہے "شام زندگی"۔ ہیکٹر بولائتھو: انگریزی زبان کے شاعر رابرٹ بلیئر کی نظم THE GRAVE کے ان اشعار سے شروع کرتے ہیں:

Behold him in the evening tide of life...
By unperceived degrees he wears away:
Yet, like the Sun, seems larger at his setting.

اس درخشاں زندگی کی شام بھی قابل دید ہے۔
شمع حیات آہستہ آہستہ بجھ رہی ہے'
لیکن اسکے گل ہونے کا انداز بھی اپنی ایک شان رکھتا ہے'

جیسے غروب ہونے سے قبل کچھ دیر تک
سورج پہلے سے بھی زیادہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔

قائد کے پرانے پارسی دوست جمشید نوشیر واں جی کراچی میں رہتے تھے۔ وہ قائد سے بہت مانوس تھے۔ ایک دن وہ قائد کو تلاش کرتے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس کے چمن میں پہنچ گئے اور دیکھا کہ قائد ایک نشست پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر قائد نے سر اٹھایا اور بولے:

"میں تھک گیا ہوں' جمشید' بری طرح تھک گیا ہوں۔"

یہ فروری 48ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت پاکستان کو قائم ہوئے صرف چھ مہینے گزرے تھے۔

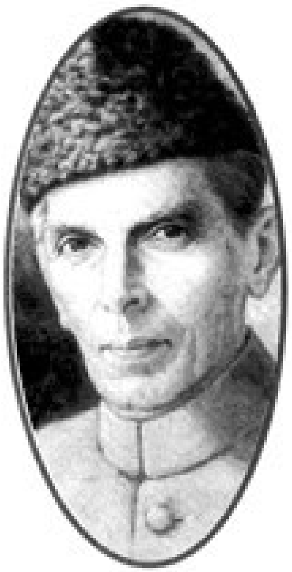

اس سے پہلے شاید قائد کو کبھی اتنی فرصت ہی نہ ملی تھی کہ گھر سے باہر باغ میں بیٹھ کر کچھ دیر اونگھ لیں۔ ان کی سیاسی زندگی کے شروع کے دنوں میں مالابار ہل پر ان کی کوٹھی کے ساتھ باغ بھی تھا۔ صبح کو وہ ضرور وہاں جایا کرتے تھے' لیکن تیزی سے اس کی روشیں طے کر جاتے اور باغ کے انتظام پر نکتہ چینی صرف اس وقت کرتے جب انہیں ایک ہی کیاری میں دو قسم کے پھول ملے جلے دکھائی دیتے۔ وہ کہتے کہ "یہ باغ نہیں جنگل ہے۔" انہیں فلاکس اور پٹیونیا کے پھولوں کی سیدھی' ستھری قطاریں بہت مرغوب تھیں' لیکن پھول توڑنے کا شوق نہ تھا۔ نہ انہیں کبھی اتنی فرصت ملی کہ اطمینان سے بیٹھ کر گلستان کے نظارے سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن اپنی زندگی کے آخری زمانے میں قائد کی بعض عادتوں میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی۔ کبھی کبھی وہ گورنمنٹ ہاؤس کے چمن میں جا بیٹھتے اور کچھ دیر درختوں کے سائے کے تلے تصور کی دنیا میں گم ہو جاتے۔ اس کے بعد اکثر تھوڑی دیر کیلئے ان کی آنکھ لگ جاتی۔ اس سے پہلے کبھی انہوں نے اس طرح چمن میں استراحت نہ کی تھی۔ کبھی کبھی باغ میں ٹہلتے ہوئے وہ ٹھہر جاتے اور کارنیشن کا ایک پھول توڑ کر اپنے کوٹ میں لگا لیتے۔

اسی مہینے میں ایک صبح کو "اسٹیٹس مین" کے ایڈیٹر مسٹر این اسٹیفنز نے قائد اعظم سے

ملاقات کی۔ کئی برس بعد اپنی کتاب Horned Moon میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

"بانی پاکستان کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا، مگر اس وقت تک کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہیں اور یہ موذی مرض ان کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر چکا ہے۔ چند ہی مہینوں میں اس مرض نے ان کی جان لے لی۔"

کہا جاتا ہے کہ ساڑھے تین سال قبل بمبئی میں قائداعظم کے معالجوں نے ان کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا، لیکن قائد نے یہ بات راز بنا کر چھپا رکھی تھی۔

آگے چل کر مسٹر اسٹیفنز لکھتے ہیں: "تقسیم ہند سے چند دن قبل میں نے مسٹر جناح کو دیکھا تھا۔ اس زمانے کی بہ نسبت اب ان کی صحت مجھے بہتر معلوم ہوئی اور میں نے یہ بات ان سے کہی۔ اس کے بعد وہ دیر تک مجھ سے گفتگو کرتے رہے اور ان کے سیکرٹریوں کو 77 منٹ کی اس طویل ملاقات پر بہت تعجب ہوا۔ دوران گفتگو مسٹر جناح نے ہندوستان اور پاکستان کے گزشتہ سال کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا۔ اس دور کی تاریخ کی تشکیل میں خود ان کا بہت بڑا حصہ تھا اور خود ان کی زبان سے اس کی داستان مجھے بہت دلچسپ اور مؤثر معلوم ہوئی۔"

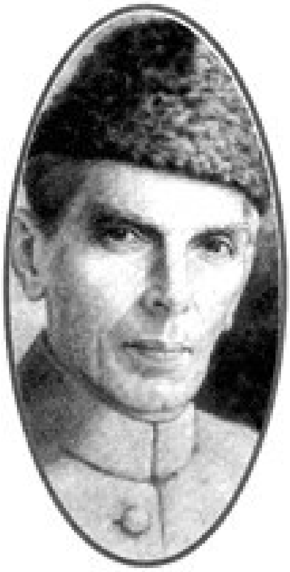

☆......☆......☆

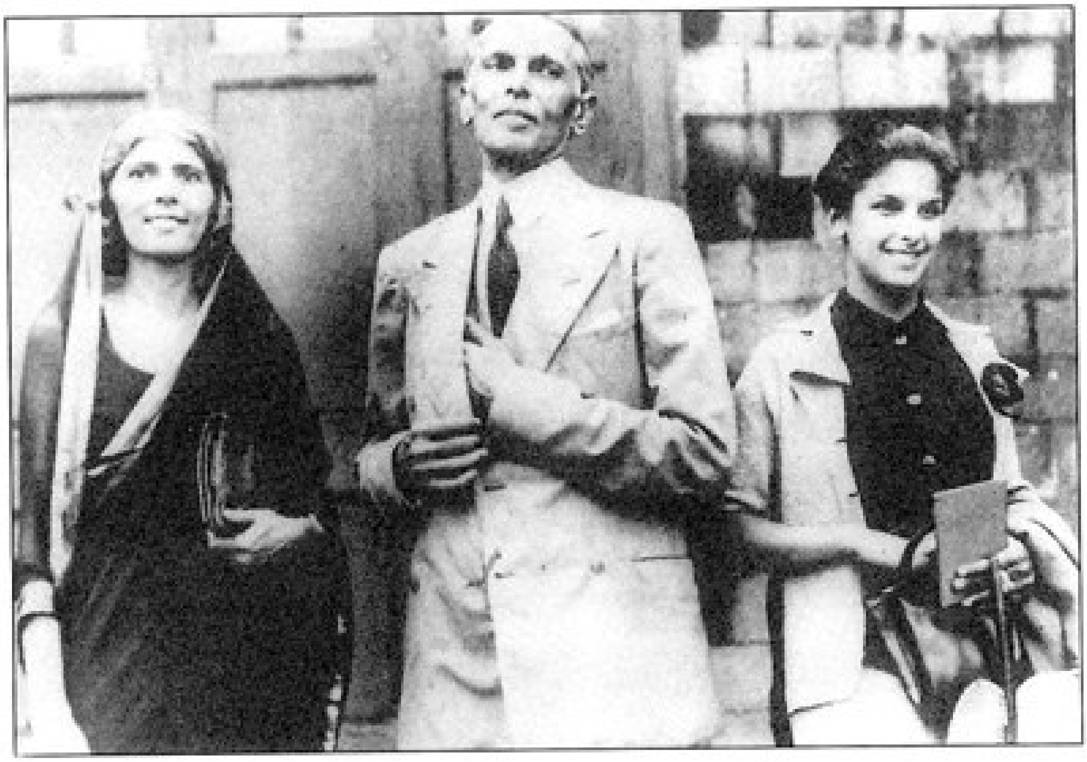

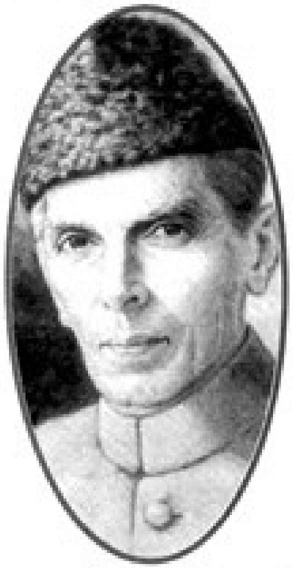

قائداعظم محمد علی جناح اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور اپنی اکلوتی بیٹی دینا کے ہمراہ۔

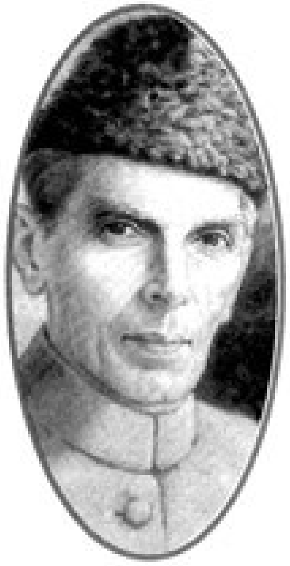

ایک عالی ظرف

ہم قائداعظم کے انگریز سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو کے قلم سے ان کی زندگی کے آخری دنوں کی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔ ہیکٹر بولائتھو لکھتے ہیں:

"اسٹیٹس مین" کے ایڈیٹر سے رخصت ہوتے وقت قائداعظم نے کہا: "مسٹر اسٹیفنز' آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے اپنی طبیعت میں خاصا افاقہ محسوس ہو رہا ہے۔ در حقیقت اب میری حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں حال میں بہت بیمار رہا ہوں' لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب میں جلد تھک جاتا ہوں۔"

پھر ان کے حسین اور باریک ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں زیرلب مسکرائے' پھر بولے: "یہ تو عمر کا تقاضا ہے۔ اب میں جوان نہیں ہوں اور مجھ پر ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ ہے...... جب میں تھک جاتا ہوں تو آرام کر لیتا ہوں۔ یہ بہت آسان نسخہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنی صحت برقرار رکھنے کیلئے کیا کرنا چاہئے' لہذا میں اپنے معالجوں سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے گھر جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بات کا بتنگڑ بنائیں' یہ مجھے ناگوار

گزرتا ہے۔ نہیں نہیں، میں بالکل بیمار نہیں تھا۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

ہیکٹر بولا تھو لکھتے ہیں: ہر آدمی کی شخصیت کے بے شمار متنوع پہلو ہوتے ہیں اور جن لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے ان میں سے ہر ایک کو اس شخصیت کا رنگ جدا نظر آتا ہے۔ یہی حال محمد علی جناح کا تھا۔ ان کی سیرت اور مزاج کے متعلق ان کے شناساؤں میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ انتہائی دیانتدار انسان تھے اور ساری عمر کسی نے ان کی دیانت پر شبہ نہیں کیا۔ سر اسٹیفر ڈ کرپس انہیں 1930ء سے جانتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ "جناح انتہائی راست باز اور خوددار شخص تھے۔ ان سے معاملہ کرنا اسی لیے دشوار تھا کہ وہ اپنے مقصد کو ترک کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتے۔"

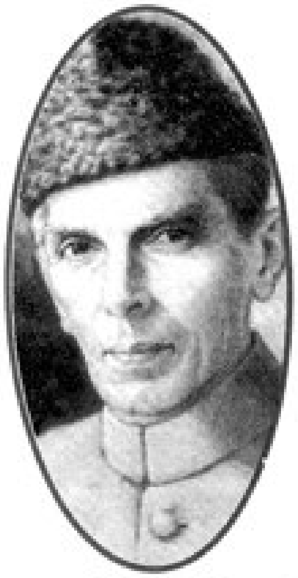

فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلیک کہتے ہیں: "میں مسٹر جناح کا بڑا مداح تھا۔ وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے اور دھن کے پکے تھے۔ کوئی چیز ان کی غیر معمولی قوت ارادی کو دبا نہ سکتی تھی۔"

لارڈ ویول کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں ان سے قائد کے متعلق رائے پوچھی گئی تو انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "ان سے معاملہ کرنا واقعی بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اپنی بات پر ڈٹ جانے والے تھے۔"

قیام پاکستان کے بعد بہت سے پاکستانی نوجوانوں کو قائداعظم کے قریب رہ کر ان کی خدمت کا موقع ملا۔ یہ سب بہت مخلص تھے لیکن کچھ سہمے سہمے معلوم ہوتے تھے۔ ایک صاحب جو ان کے سیکرٹری رہ چکے ہیں، کہتے ہیں:

"قائد اگر کبھی گرم جوشی کا اظہار کرتے بھی تھے تو بہت سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر۔"

ایک اور صاحب، جو آخری زمانے میں قائد کی خدمت میں رہے، کہتے ہیں: مجھے جب ان کی خدمت کا موقع ملا اس وقت وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور تھک چکے تھے۔ میرے دل

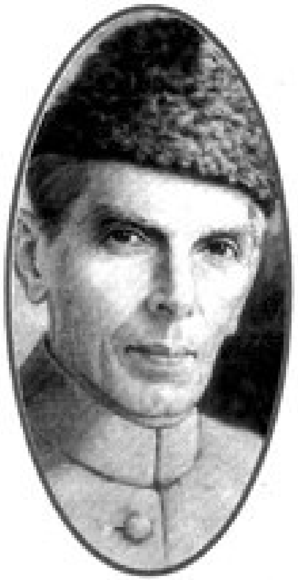

میں ان کیلئے جو جذبے تھے ان سب پر قائداعظم کا رعب حاوی ہو گیا۔ تاہم ان میں بہت سی خوبیاں ایسی تھیں جو دوسروں کو ان کا گرویدہ بنا دیتیں۔ بعض وقت جب وہ غصے میں ہوتے تو میری بات سننا بھی گوارا نہ کرتے اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے لوٹا دیتے۔ لیکن اس کے بعد اکثر وہ خود فون کر کے مجھے بلاتے اور پھر بڑی شفقت سے معذرت کرتے۔ ایک بار انہوں نے کہا: ”میں بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں اور بعض وقت جھنجھلا جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم معاف کر دو گے۔“

یہ ان کی عالی ظرفی تھی، ورنہ میں تو ان کی خفگی کو بھی اپنے لیے باعث عزت سمجھتا تھا۔

قائداعظم کی بیٹی مسز نیویل وادیا نے اپنے والد کے متعلق کہا: ”میرے والد مغرور ضرور تھے، لیکن تہذیبی آداب سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے غصے کے بہت سے قصے مشہور ہیں، لیکن اگر آپ غور سے ان کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ پہلے دوسرے آدمی نے ان سے بدتمیزی کی اور انہیں غصہ دلایا اور پھر جواب میں وہ بھی اس سے غصے سے پیش آئے۔“

☆......☆......☆

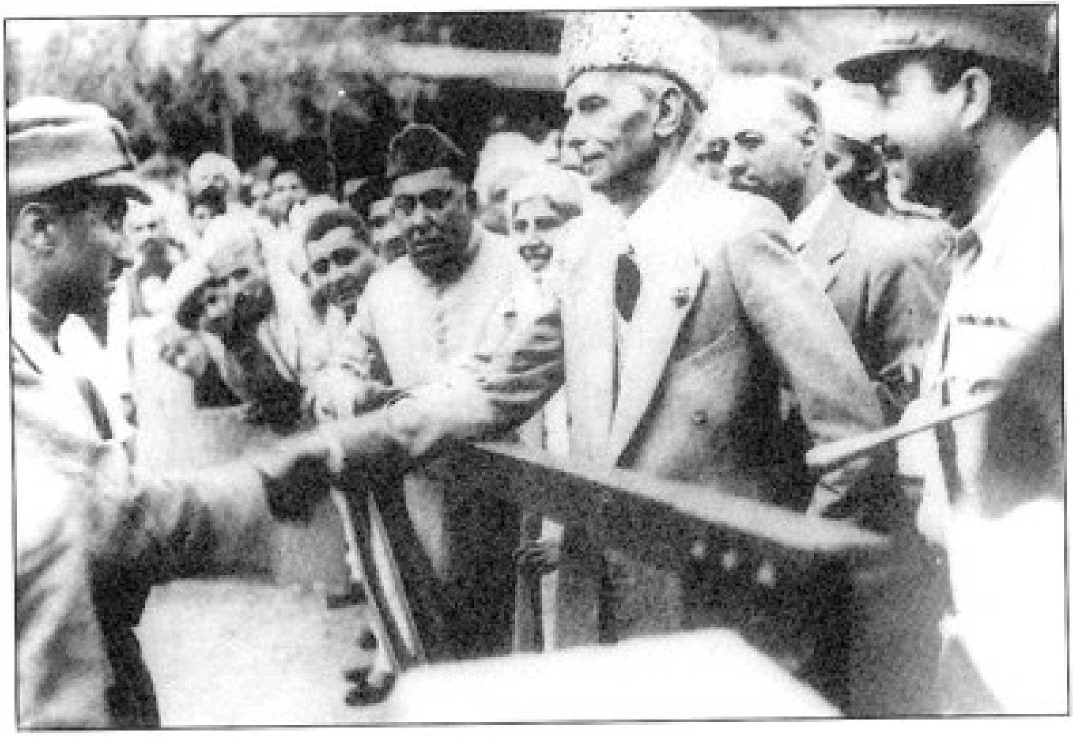

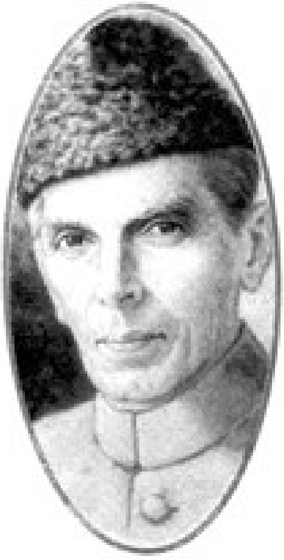

طورخم کی سرحد پر قائداعظم محمد علی جناح خیرسگالی کے طور پر افغان فوجی سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔

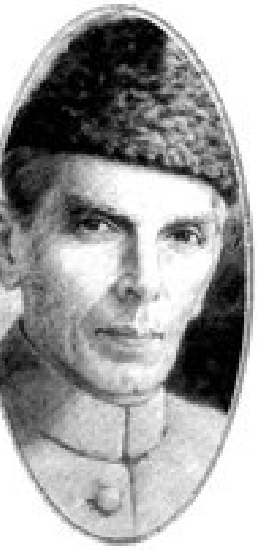

رشوت سے نفرت

قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو کی زبانی ان کی زندگی کے آخری دنوں کی داستان:

انگریز مصنف لکھتے ہیں: "یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص اشارتاً بھی کوئی ایسی بات کہتا جو قائد کو ناگوار ہوتی تو وہ بلا تامل اسے ڈانٹ دیتے۔ کہتے ہیں کہ برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ریمزے میک ڈانلڈ نے ایک مرتبہ ان سے کہا: "ہم اب جلد ہندوستان کو خودمختار کرنا چاہتے ہیں اور مجھے چند ایسے ہندوستانیوں کی تلاش ہے جو صوبائی گورنر بنائے جاسکیں۔" اس پر قائد نے برجستہ سوال کیا: "جناب کیا آپ مجھے رشوت دینا چاہتے ہیں؟"

قائد اپنے مداحوں سے بھی زیادہ مروت اختیار نہ کرتے تھے' ان کی جو بات انہیں ناپسند ہوتی' اس پر فوراً ڈانٹ دیتے۔ ایک مرتبہ جب وہ لندن سے بمبئی روانہ ہو رہے تھے تو ہوائی اڈے پر انہیں ایک بوڑھا مسلمان ملا جو لندن کے مشرقی سرے سے ہوائی اڈے تک محض اس لئے آیا تھا کہ قائداعظم سے مصافحہ کر سکے۔ اڈے پر کوئی شخص اسے قائداعظم کے پاس لے گیا اور انہیں بتایا کہ وہ کئی پونڈ خرچ کر کے ٹیکسی میں شہر سے آیا تھا۔ قائد نے اپنے بوڑھے معتقد

سے ہاتھ ملالیا لیکن فہمایشی لہجے میں کہا:

''آپ کو اس قدر فضول خرچی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مسلمان قوم کو کفایت شعاری سیکھنی چاہئے۔ بہر حال آپ کا بہت شکریہ!''

قائد اعظم جذباتی اور کھوکھلی مدح سرائی کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایک چھوٹے سے شہر میں دورے پر گئے جہاں کسانوں کے ایک بہت بڑے جلوس نے ان کا استقبال کیا' اور ''مولانا محمد علی جناح زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ یہ مذہبی لقب قائد کو پسند نہ آیا اور انہوں نے جلوس کو ٹھہرالیا۔ پھر انہوں نے انگلی اٹھا کر ہجوم کو اشارہ کیا اور کہا: ''مجھے مولانا کہہ کر ہرگز نہ پکاریں۔ میں آپ کا سیاسی لیڈر ہوں' مذہبی پیشوا نہیں۔ آپ مجھے ''مسٹر جناح'' یا ''محمد علی جناح'' کہیں۔''

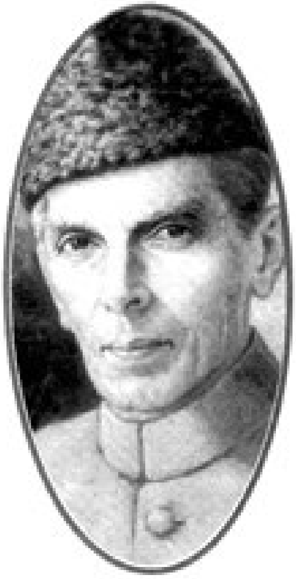

عورتوں کے ساتھ قائد عموماً بڑی مروت سے پیش آتے تھے۔ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے ایک نوجوان لڑکی ان سے ملی اور چند دن بعد اس نے ایک معمر خاتون کو ازراہ مذاق یہ بتایا کہ مجھے مسٹر جناح کے حسین ہاتھوں سے عشق ہو گیا ہے۔ خاتون نے یہ راز قائد اعظم پر فاش کر دیا اور وہ اس سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ دوسرے دن قائد اعظم گھڑ دوڑ دیکھنے ریس کورس گئے تو دیکھا کہ ان کے بازو کی نشست پر وہی لڑکی بیٹھی ہے۔ انہوں نے شرارتاً اس کی طرف دیکھا اور بولے: ''بی بی اب گھڑ دوڑ دیکھنا' میرے ہاتھوں کو نہ گھورتی رہنا۔'' ان کے لہجے میں شفقت اور خواتین سے گفتگو کرنے میں ملائمت تھی جو بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

جو معمر خواتین قائد سے ملتی تھیں' وہ اکثر ان کے غیر معمولی بشرے سے متاثر ہوتی تھیں اور انہیں اس لئے بھی پسند کرتی تھیں کہ دوستانہ محفلوں میں قائد دوسروں سے بڑے لطف اور خوش خلقی سے پیش آتے تھے۔ لیڈی ویول کہتی ہیں کہ ''میں جناح کو حسین ترین

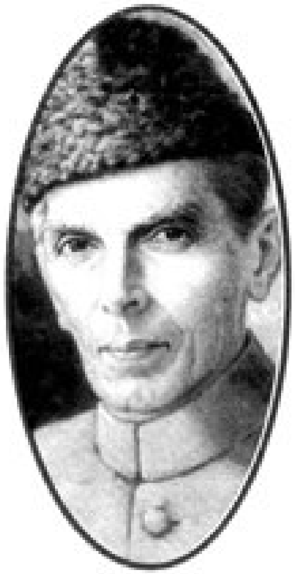

24،نومبر 1942ء،کو قائداعظم جالندھر ریلوے سٹیشن پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس میں شرکت کیلئے تشریف لا رہے ہیں۔

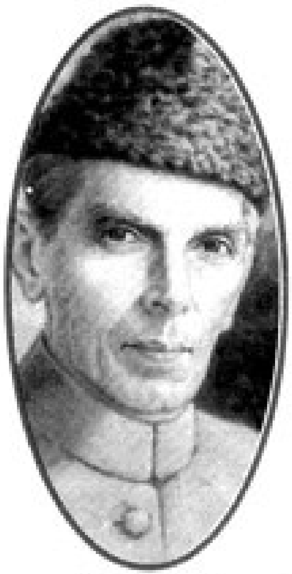

نوجوانوں کی اُمید

قائداعظم کی زندگی سے 'آخری دنوں کی روداد۔ مصنف ہیں ان کے مشہور سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قائد کی زندگی کا آخری سال کراچی میں گزرا' لیکن وہ ایک مرتبہ بھی نیو نہم روڈ کا وہ گھر دیکھنے نہ گئے جہاں 71 برس قبل انہوں نے جنم لیا تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بڑے فخر سے اپنے پرشکوہ سرکاری محل سے نکل کر اس مکان تک جاتا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ پھر اس کی بالائی منزل کے دو کمروں پر نظر ڈال کر کہتا: "میرے سفر زندگی کا آغاز اس مقام سے ہوا تھا' مگر میں نے آخر کار ایک قوم کی تشکیل کی اور اس کیلئے ایک آزاد مملکت قائم کر دی۔" لیکن قائد کے ذہن میں شاید اس قسم کا کوئی خیال کبھی نہ آیا ہوگا۔ ماضی ان کیلئے ایک مردہ اور بے جان چیز تھی اور انہیں اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

1948ء کی فروری اور مارچ میں بھی قائد حسب معمول سخت محنت سے کام کرتے رہے۔ وہ روزانہ کئی گھنٹے دفتر میں بیٹھتے اور بڑی سنجیدگی' تندہی اور یکسوئی سے کام کرتے۔ اس

زمانے میں جو صاحب ان کے سیکرٹری تھے' وہ کہتے ہیں:

"قائداعظم کی سنجیدگی کا اثر ہم سب پر پڑا۔ ہم کسی قسم کی تفریح یا ہنسی مذاق سے اپنے کام کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ نئے قانون جب توثیق کیلئے قائداعظم کی خدمت میں پیش کئے جاتے تو قائد ان کا ایک ایک فقرہ بغور پڑھتے اور اکثر شکایت کرتے کہ "عبارت بھونڈی اور الفاظ کا انتخاب ناقص ہے۔" مجھے جب کوئی بل لے کر ان کی خدمت میں جانا ہوتا تو میں خوب تیار ہو کر جاتا گویا میں وزیر ہوں اور بل کا مسودہ میں نے ہی تیار کیا ہے۔ بل کو پڑھ کر وہ اس قسم کی ہدایتیں کرتے:

"اس کے متن کی مزید تقسیم کر کے زیادہ دفعات قائم کرو۔"

"یہ بل واپس بھیج دو' تاکہ از سر نو لکھا جائے۔"

بعض موقعوں پر میں عرض کرتا: "یہ قانون بہت ضروری ہے اور اس کی توثیق میں مزید تاخیر نہ ہونا چاہیے۔"

اس پر وہ اکثر ڈھیل دے دیتے اور بل پر دستخط کر دیتے۔ لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ چوکس رہتے اور اکثر کہا کرتے: "یہ لوگ ہڑبڑی مچا کر مجھ سے کوئی کام نہیں کرا سکتے۔ میں عجلت میں کوئی دستخط نہیں کروں گا۔ یہ قانون اور ضابطے کی بات ہے۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔"

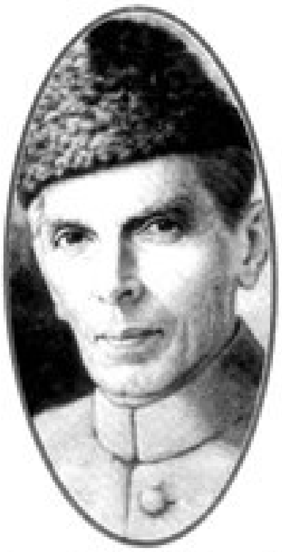

اپنی زندگی کے آخری پانچ سات مہینوں میں قائداعظم کا دائرۂ فکر و عمل بہت وسیع ہو گیا۔ کشمیر کا سنگین مسئلہ اب ہندوستان اور پاکستان تک محدود نہ تھا۔ 30 دسمبر 1947ء سے یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں زیر بحث تھا اور دنیا کے تمام ملکوں کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

مارچ کے مہینے میں قائداعظم نے اپنی قوم کو متحد کرنے کیلئے ایک اور قدم اٹھایا۔ اپنی ناتوانی اور علالت کے باوجود وہ قریب دو ہزار میل کا ہوائی سفر کر کے مشرقی پاکستان پہنچے اور کوئی

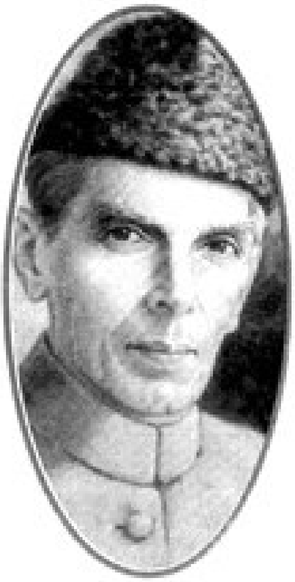

دن وہاں ٹھہرے۔اس اثنا میں انہوں نے متعدد تقریریں کیں اور کئی سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں شریک ہوئے۔ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب میں جو باتیں انہوں نے کیں 'ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار واختیار ملنے سے قائداعظم کے انداز فکر پر مطلق اثر نہ پڑا تھا۔انہوں نے کہا:

"میرے نوجوان دوستو! میں نے دس برس بڑے خلوص اور وفاداری سے تمہاری خدمت کی ہے اور تمہارے لئے میرے دل میں کوئی جذبہ بجز محبت اور شفقت کے نہیں۔یہی جذبہ آج مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں تمہیں تھوڑی سی تنبیہہ بھی کر دوں۔اگر تم کسی سیاسی جماعت کے چکر میں پڑ گئے اور اسے اس بات کی اجازت دی کہ وہ تمہاری مدد سے اپنا الو سیدھا کرے'تو تم سخت نقصان اٹھاؤ گے۔"

☆......☆......☆

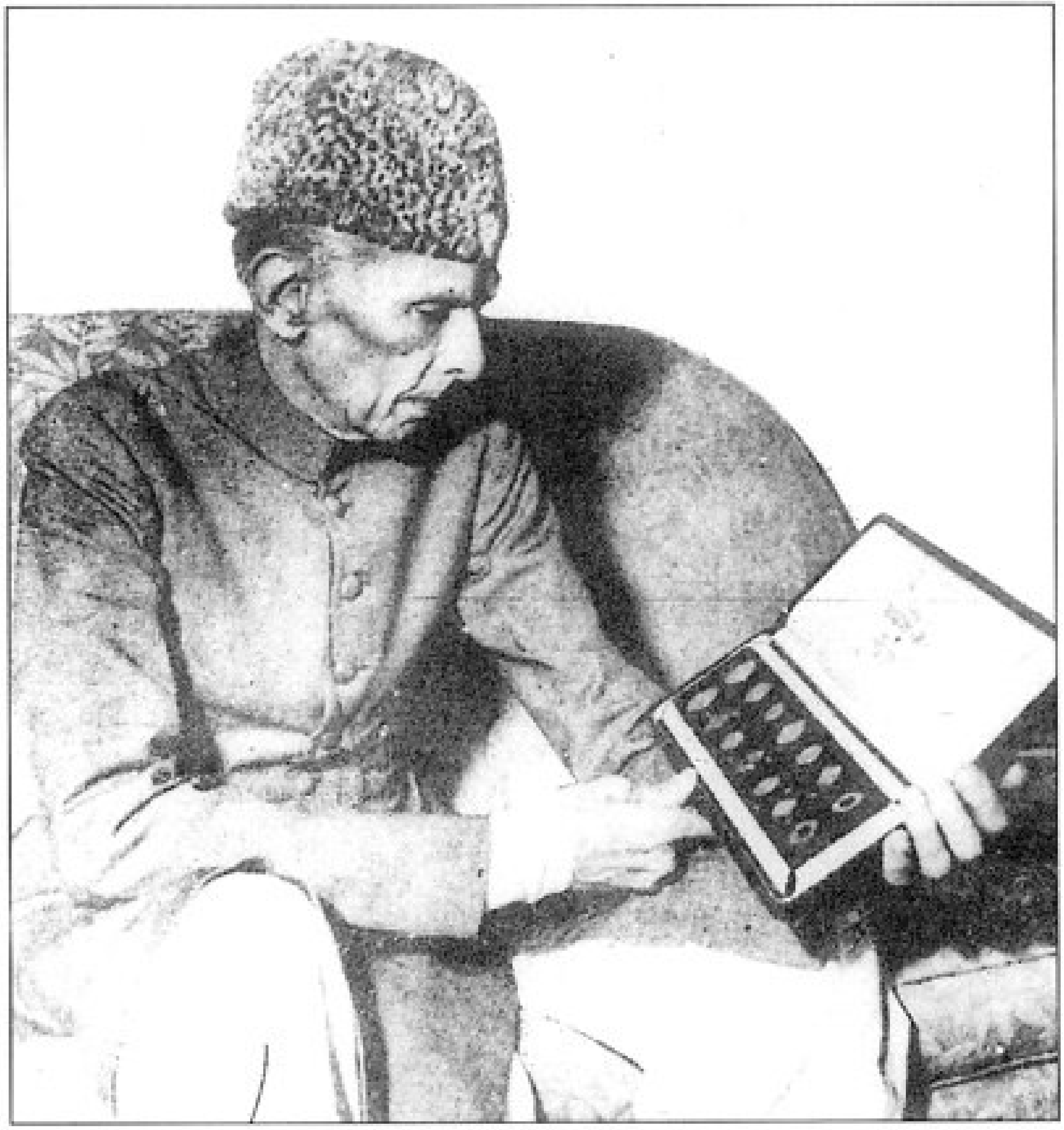

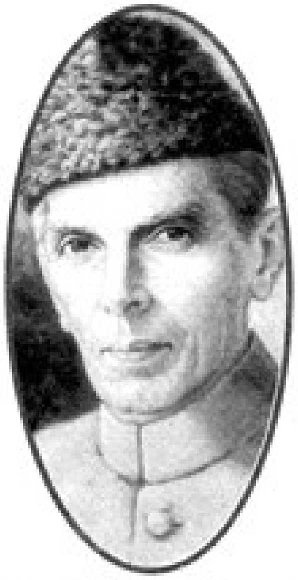

قائداعظم پاکستان کے نئے سکے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

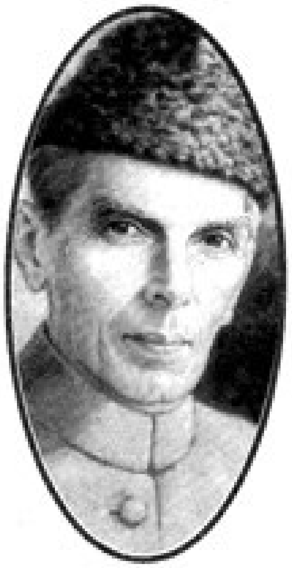

ماتحت عملے کی یادیں

داستان حیات قائد اعظم کی، قلم ہیکٹر بولائتھو کا۔ وہ لکھتے ہیں:

1948ء میں مشرقی پاکستان سے واپسی کے چند ہی دن بعد قائد اعظم صوبہ سرحد کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ 15 اپریل سے 22 اپریل تک وہ وہاں رہے اور وہاں بھی تقریروں اور تقریبوں کا وہی سلسلہ رہا۔ کراچی واپس آئے تو طبیعت پھر بگڑ گئی اور وہ اس قابل نہ رہے کہ زیادہ دیر تک دفتر میں بیٹھ کر کام کر سکیں۔ ان کے سیکرٹری کا کہنا ہے:

"ان دنوں وہ زیادہ تر نیچے کی منزل میں اپنے کمرے میں رہتے، لیکن اخبار بینی کے شوق میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ خبروں سے دلچسپی کا اب بھی یہ عالم تھا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹیلی پرنٹر پر جو خبریں آتیں ان کا پلندہ تھوڑی دیر بعد ان کو پیش کیا جاتا۔ وہ کاغذ لے کر صوفے پر دراز ہو جاتے اور اسے اپنی انگلیوں پر گھما گھما کر خبریں پڑھتے جاتے۔"

قائد اعظم کی زندگی کے آخری چند مہینوں میں جو لوگ ان کے مہمان رہے ان میں سر فرانسس موڈی بھی تھے۔ ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"میں نے مئی کے آخر میں چند دن ان کے ساتھ قیام کیا۔ وہ بہت بیمار تھے اور زیادہ تر بستر ہی میں رہتے۔ آخری روز پنجاب کی وزارت کے معاملے میں میرا اور ان کا سخت اختلاف ہوا۔ لیکن دو گھنٹے بعد جب میں روانہ ہونے لگا تو انہوں نے اٹھ کر مجھے خیر باد کہا اور بڑے تپاک سے رخصت کیا۔"

مئی کے مہینے میں قائداعظم نے لیفٹیننٹ مظہر احمد کو اپنا نیول اے ڈی سی مقرر کیا اور وہ قائد کی رحلت تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ جون میں قائداعظم مع اپنے عملے کے زیارت چلے گئے۔

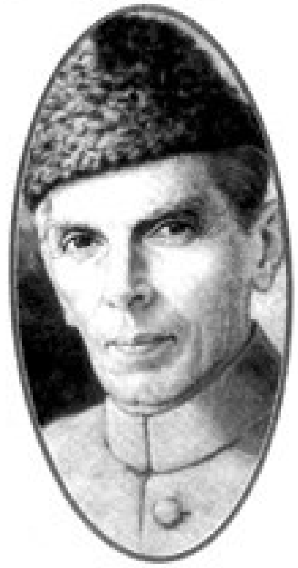

زیارت کوئٹہ سے ستر میل دور ایک پر فضا مقام ہے۔ قائداعظم کے وہاں قیام کا حال لیفٹیننٹ مظہر احمد نے یوں بیان کیا ہے:

"جس بنگلے میں قائداعظم کا قیام تھا وہ پہاڑوں کے درمیان خاصی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے احاطے میں پھلوں کے درخت ہیں اور ایک چمن ہے جو جنیپر (Juniper) اور جنگلی لیونڈر (Lavender) کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے گورنر جنرل کا نیلا پرچم بنگلے پر نصب کر دیا اور ہمارا خیال تھا کہ اب قائداعظم کچھ دن مکمل طور پر آرام کریں گے، لیکن محنت ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور آرام کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ہر روز کراچی سے ان کی ڈاک سیاہ صندوقوں میں آتی جن پر M.A.J کی سنہری مہر لگی ہوتی تھی۔ یہ صندوق سرکاری کاغذوں سے بھرے ہوتے تھے۔ قائداعظم ان کے مطالعے میں مصروف رہتے اور ان کی پتلی پتلی انگلیاں ان میں الجھی رہتیں۔ میرے ذہن میں قائداعظم کی جو تصویریں محفوظ ہیں ان میں یہ تصویر سب سے زیادہ صاف ہے۔"

"اپنے عملے کے ساتھ قائداعظم کے تعلقات بالکل رسمی انداز کے تھے اور میں ہر وقت ان سے سہارہتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی ان کا رویہ نرم ہو جاتا اور وہ بیٹھ کر ہمیں قصے سناتے۔ یہ قصے وہ

اکثر اس نیت سے سناتے کہ ہم ان سے استفادہ کریں اور سبق حاصل کریں۔ عموماً قصہ شروع کرنے سے پہلے وہ انگلی اٹھاتے اور اس سے ہماری طرف اشارہ کر کے بات شروع کرتے۔"

"قائداعظم کا نحیف و لاغر جسم دیکھ کر ہم سب کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ ایک روز صبح انہوں نے کہا کہ اب دن میں سردی زیادہ ہونے لگی ہے اور انہیں چند اونی بنیانوں کی ضرورت ہے۔ میں نے تھوڑی سی آزادی لیتے ہوئے کہا' جناب آپ کے لیے تو زنانہ ناپ کی بنیان ڈھونڈنا پڑے گی۔"

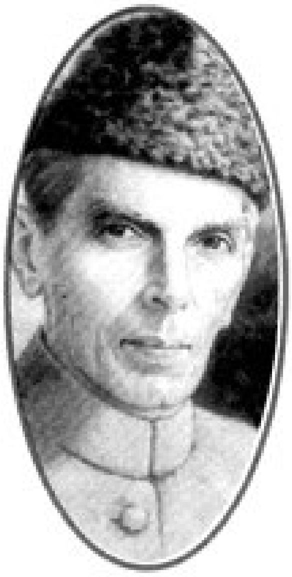

یہ سن کر وہ مسکرا دیئے۔ میں کوئٹہ جا کر ان کے لیے بنیانیں لے آیا' لیکن پہلی ہی دھلائی میں ان میں سوراخ ہو گئے۔ میں انہیں بدلوانے کے لیے پھر دکان پر لے گیا' لیکن وہاں اس قسم کی اور بنیانیں نہ تھیں اور دکاندار نے انہیں رفو کروا دیا۔ قائداعظم اس سے مطمئن نہ ہوئے' ان کا خیال تھا کہ قیمت میں کچھ کمی ہونی چاہئے۔ دکاندار راضی ہو گیا اور میں نے پانچ روپے اس سے لے کر قائداعظم کو لوٹا دیئے۔ اس پر قائد نے خوش ہو کر کہا:

"شاباش! تم ابھی سے روپے کی قدر کرنا سیکھو۔"

☆......☆......☆

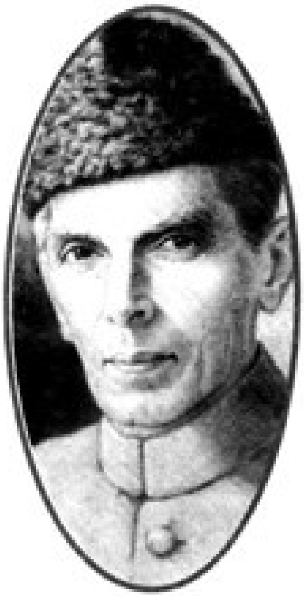

قائداعظم سٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر زاہد حسین کے ہمراہ سٹیٹ بینک کی عمارت میں داخل ہو رہے ہیں۔

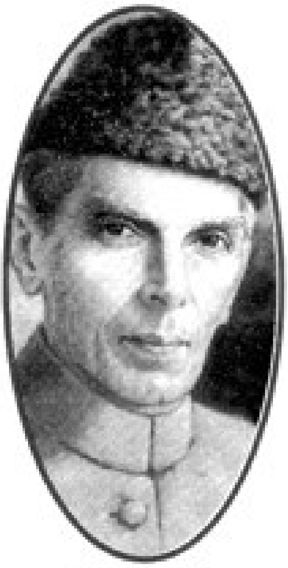

معاشی نظام پر تقریر

قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولا تھو بانئ پاکستان کی زندگی کے آخری دنوں کا تذکرہ۔ میں مزید لکھتے ہیں:

"جن دنوں قائداعظم زیارت میں تھے' انہی دنوں کراچی میں گورنر جنرل کی کوٹھی کے قریب پاکستان کے سٹیٹ بینک کی شاندار عمارت مکمل ہوئی۔ یہ بینک ملک کی اقتصادی خود مختاری کا نشان تھا اور قائداعظم کو پاکستان کی بقا پر جو یقین کامل تھا' یہ عمارت اس کا ایک شاندار مادی مظہر تھی۔ قائداعظم کی طبیعت ابھی تک ناساز تھی مگر وہ اس پر مصر تھے کہ بینک کا افتتاح خود کریں گے۔ جب ان کی افتتاحی تقریر لکھ کر تیار ہو گئی تو ان کے اے ڈی سی نے یہ صلاح دی کہ تقریر کا مسودہ کراچی بھیج دیا جائے اور افتتاح کے وقت گورنر جنرل کی طرف سے وزیراعظم اسے پڑھ دیں۔ قائداعظم نے کوئی جواب نہ دیا لیکن ہاتھ کے اشارے سے تجویز رد کر دی۔ یہ دیکھ کر اے ڈی سی کمرے سے باہر چلا گیا۔ دو دن بعد قائداعظم کوئٹہ پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی واپس ہوئے۔ سٹیٹ بینک کا افتتاح ان کی زندگی کا آخری اہم کام تھا۔

کراچی ریڈیو سٹیشن کے دفتری ریکارڈ روم میں قائداعظم کے اس افتتاحیہ خطبے کا

ایک گراموفون ریکارڈ موجود ہے۔ اس میں ان کی آواز باریک ہے اور بڑھاپے کے باعث کرخت ہے لیکن ادائیگی' آواز کے اتار چڑھاؤ اور وقفوں کی مناسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔ تقریر کا پہلا فقرہ بہت خوب ہے۔ اس کی عبارت تو سادہ سی ہے' لیکن انہوں نے جس انداز سے' مناسب وقفے دے دے کر اسے پڑھا اس سے اس فقرے میں خاص اثر پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا:

"جناب گورنر صاحب' بینک کے ناظمین' خواتین و حضرات! سٹیٹ بینک کا افتتاح ہمارے ملک کی مالی اور اقتصادی خود مختاری کا نشان ہے اور مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ میں خود یہ رسم ادا کر رہا ہوں۔" تقریر ختم کرتے ہوئے قائداعظم نے اس دور کی عالمگیر افراتفری پر آخری مرتبہ اظہار خیال کیا:

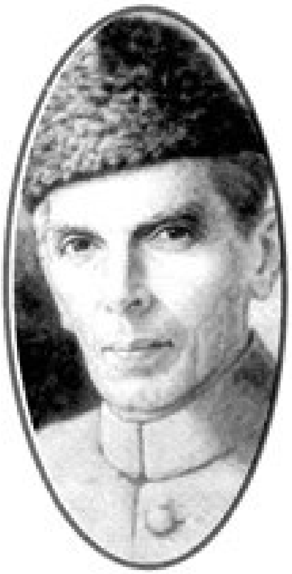

"مغرب کے اقتصادی نظام نے ساری دنیا کے لیے بعض ایسے پیچیدہ مسئلے پیدا کر دیئے ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا بلکہ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصیبتیں دنیا کو تیزی سے بربادی کی طرف لے جا رہی ہیں اور کوئی معجزہ ہی اسے تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام نہ معاشی عدل کے تقاضے پورے کر سکا' نہ بین الاقوامی مخاصمت کا مداوا کر سکا بلکہ گزشتہ نصف صدی میں جو دو عالمگیر جنگیں ہوئی ہیں' ان کی ذمہ داری زیادہ تر اسی اقتصادی نظام پر ہے۔ صنعتی معاملات میں مغربی ممالک کو بلاشبہ باقی دنیا پر فوقیت حاصل ہے' لیکن اس کے باوجود مغربی دنیا کی حالت جتنی ابتر آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ ہمارا اقتصادی نصب العین یہ ہے کہ ہمارے عوام ہر طرح مطمئن اور خوش و خرم ہوں۔ مغرب کے اقتصادی نظریے اور اس کا معاشی نظام ہمارے درد کا درماں نہیں اور ان کے ذریعے ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے مخصوص تصورات و مقاصد کے مطابق اپنے اقتصادی نظام کی تشکیل کریں اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نمونہ پیش کریں جو انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کا آئینہ دار ہو۔ اس طرح وہ مشن بھی پورا ہو جائے گا جس کے لیے ہم نے بہ حیثیت مسلمان اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے اور ہم دنیا کو امن و آشتی کا راستہ بھی دکھا سکیں گے۔ اسی راستے میں انسانیت کی نجات

ہے اور اسی کے ذریعے بنی نوع انسان کو خوشحالی اور مسرت نصیب ہو سکتی ہے۔"

سٹیٹ بینک کے افتتاح کی رسم شاہانہ ٹھاٹھ سے ادا ہوئی۔ قائداعظم اور ان کی ہمشیرہ گھوڑے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ سے بینک کی عمارت تک گئے۔ یہ گاڑی ان سرکاری سواریوں میں سے تھی جو انگریزوں کے زمانے میں وائسرائے کے لیے مخصوص تھیں اور تقسیم ہند کے وقت دہلی سے کراچی آئی تھی۔ اسے چھ گھوڑے کھینچ رہے تھے اور اس کا محافظ دستہ شوخ سرخ رنگ کی وردیاں پہنے تھا جو انگریزوں کے عہدِ حکومت میں وائسرائے کے باڈی گارڈ پہنا کرتے تھے۔ اس روز کراچی کے لوگوں نے پہلی اور آخری مرتبہ اپنے مسیحا کو شاہانہ کروفر سے نکلتے دیکھا۔ ایک لطیفہ اس موقع پر یہ ہوا کہ جب جلوس گورنر جنرل کی کوٹھی سے نکلنے والا تھا تو قائداعظم نے جھک کر اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا: "کرنل نولز" مجھے امید ہے کہ ان گھوڑوں کو اس سفر کے لیے کافی مشق کرا لی گئی ہے۔" ہم سب یہ سن کر ہنس پڑے۔ قائد کا مطلب تھا کہ کہیں گھوڑے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر بدک نہ جائیں۔ اس یادگار دن کے آخری قابلِ ذکر واقعات لیفٹیننٹ مظہر احمد نے یوں بیان کیے ہیں:

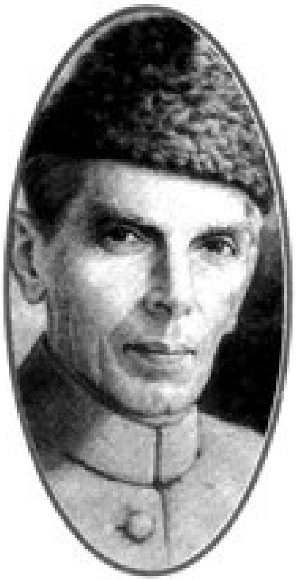

"واپسی پر قائداعظم جب گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے لگے تو وہ بہت نحیف اور تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ہزاروں آدمی ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور شاید وہ انہیں چھونا چاہتے تھے، لیکن ہم رکاب سواروں نے انہیں روک دیا۔ جو لوگ سواری سے ذرا قریب تھے انہوں نے اپنے ہاتھ گاڑی کی طرف بڑھا دیئے گویا اسی طرح ان کی خوشی پوری ہو جائے گی۔ گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر میں قائداعظم کے ہمراہ اوپر گیا اور پھر ہم دونوں داہنے ہاتھ کو مڑ گئے جدھر قائد کا کمرہ تھا۔ چند قدم آگے جا کر انہوں نے مجھے رخصت کر دیا۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو قائداعظم لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت بیمار ہیں لیکن مجھے یہ جرأت نہ ہوئی کہ واپس جا کر ان کی مدد کروں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس مداخلت کی ہرگز اجازت نہ دیں گے۔"

☆......☆......☆

قائداعظم کراچی میں 25 دسمبر کو اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ رہے ہیں، محترمہ فاطمہ جناح بھی خوشگوار موڈ میں ان کے ہمراہ ہیں۔

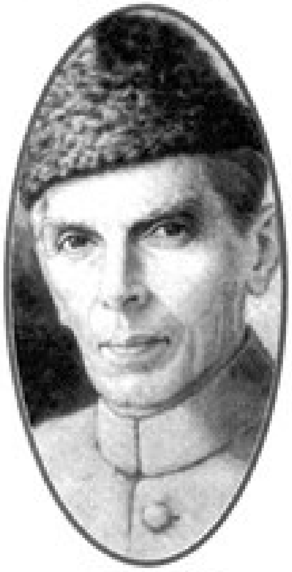

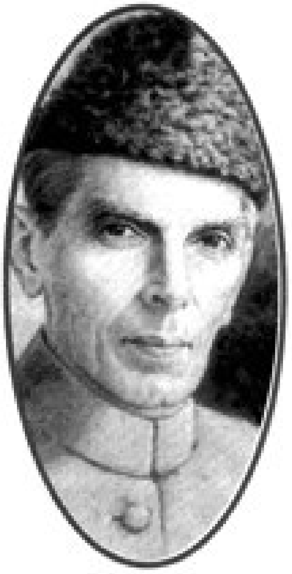

ڈاکٹر سے سوال و جواب

قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو کے قلم سے قائد کی زندگی سے فکر انگیز واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ بولائتھو کی کتاب کا آخری باب ہے "موت کے سائے میں" وہ لکھتے ہیں:

"انسان کی پوری شخصیت اور سیرت عالم نزع میں اس کے قول و فعل اور حرکات و سکنات میں جھلکتی ہے۔ یہ مقولہ قائداعظم محمد علی جناح پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ آخری دنوں میں ان کا وزن گھٹ کر صرف ستر پونڈ رہ گیا تھا لیکن ان کا نحیف ولاغر جسم اب بھی جاندار معلوم ہوتا تھا اور آنکھوں میں وہی پرانی چمک باقی تھی۔ اس زمانے میں جو لوگ قائد کے اردگرد تھے ان کا خیال ہے کہ قائداعظم کی جسمانی توانائی ختم ہو چکی تھی لیکن وہ محض اپنی زبردست قوت ارادی کے بل پر زندہ تھے۔"

ان کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کا کہنا ہے کہ "وفات سے پہلے کئی سال تک قائداعظم اور ان کے ڈاکٹروں کے درمیان برابر کشمش رہی۔ ڈاکٹر کہتے کہ زیادہ محنت آپ کیلئے خطرناک ہے 'لہٰذا آپ کو چند گھنٹے کام کرنے کے بعد دیر تک آرام کرنا چاہئے لیکن قائد کا عمل ہمیشہ اس

کے برعکس ہوتا' حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ان کی صحت کیلئے سخت مضر ہے۔"

مس فاطمہ جناح جب ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہتیں تو قائداکثر انکار کر دیتے اور کہتے: "مجھے بہت کام کرنا ہے' میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔" سٹیٹ بینک کا افتتاح کر کے قائداعظم زیارت لوٹ گئے اور 23 دن کے بعد بمشکل اس پر راضی ہوئے کہ ایک ڈاکٹر مستقل طور پر ان کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا جائے۔ اس اہم اور مشکل کام کیلئے لیفٹیننٹ کرنل الٰہی بخش کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ڈاکٹر لندن کے گائز ہسپتال کے سند یافتہ تھے اور ان دنوں لاہور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے۔ بعد میں ان کا انتقال 1960ء میں ہوا۔ انہوں نے ایک کتاب قائداعظم کے آخری ایام میں بھی لکھی ہے۔

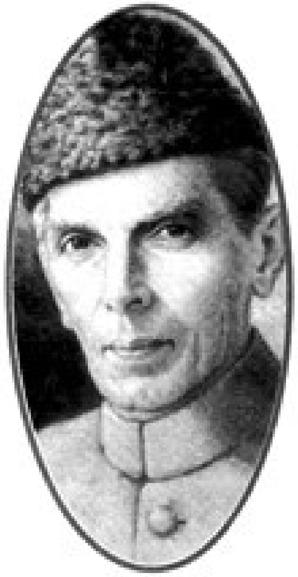

ڈاکٹر الٰہی بخش نے لاہور سے آکر 24 جولائی کو پہلی مرتبہ قائداعظم کا معائنہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم بہت کمزور ہو چکے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ راکھ کا سا ہو گیا ہے۔ لیکن قائداعظم اب بھی شکست کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے اپنے معالج سے کہا: "میں کسی خطرناک مرض میں مبتلا نہیں ہوں۔ کام زیادہ کرتا ہوں اور مجھے فکریں بھی بہت ہیں' اس کی وجہ سے مجھے معدے کی شکایت اور تکان رہتی ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے میں روزانہ چودہ گھنٹے کام کر رہا ہوں اور مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہوا۔"

اس کے بعد قائد نے اپنی گزشتہ بیماریوں اور علاج کی داستان تفصیل سے اپنے ڈاکٹر کو سنائی۔ اس وقت بھی ان کا انداز بیان اس جاں بلب بیمار کا سا نہیں تھا جو خود اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہو' بلکہ وہ اس وکیل کی طرح بات کر رہے تھے جو جانتا ہو کہ اس کے مقدمہ میں زیادہ جان نہیں مگر پھر بھی برابر بحث کیے جا رہا ہو' بڑی محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ انہوں نے کہا: "گزشتہ چند سال سے ہر برس مجھے کھانسی اور بخار کی شکایت ہو جایا کرتی ہے۔ بمبئی میں میرے معالجوں کی تشخیص یہ تھی کہ نرخرے کی نالیوں پر ورم آجاتا ہے۔ پچھلے دو سال میں یہ تکلیف

کے برعکس ہوتا' حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ان کی صحت کیلئے سخت مضر ہے۔"

مس فاطمہ جناح جب ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہتیں تو قائداکثر انکار کر دیتے اور کہتے :"مجھے بہت کام کرنا ہے' میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔" سٹیٹ بینک کا افتتاح کر کے قائداعظم زیارت لوٹ گئے اور 23 دن کے بعد بمشکل اس پر راضی ہوئے کہ ایک ڈاکٹر مستقل طور پر ان کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا جائے۔ اس اہم اور مشکل کام کیلئے لیفٹیننٹ کرنل الٰہی بخش کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ڈاکٹر لندن کے گائز ہسپتال کے سند یافتہ تھے اور ان دنوں لاہور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے۔ بعد میں ان کا انتقال 1960ء میں ہوا۔ انہوں نے ایک کتاب قائداعظم کے آخری ایام میں بھی لکھی ہے۔

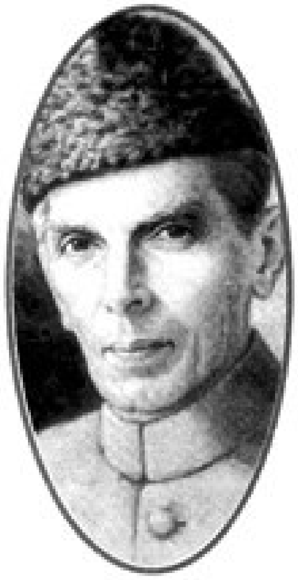

ڈاکٹر الٰہی بخش نے لاہور سے آکر 24 جولائی کو پہلی مرتبہ قائداعظم کا معائنہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم بہت کمزور ہو چکے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ راکھ کا سا ہو گیا ہے۔ لیکن قائداعظم اب بھی شکست کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے اپنے معالج سے کہا:"میں کسی خطرناک مرض میں مبتلا نہیں ہوں۔ کام زیادہ کرتا ہوں اور مجھے فکریں بھی بہت ہیں' اس کی وجہ سے مجھے معدے کی شکایت اور تکان رہتی ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے میں روزانہ چودہ گھنٹے کام کر رہا ہوں اور مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہوا۔"

اس کے بعد قائد نے اپنی گزشتہ بیماریوں اور علاج کی داستان تفصیل سے اپنے ڈاکٹر کو سنائی۔ اس وقت بھی ان کا انداز بیان اس جاں بلب بیمار کا سا نہیں تھا جو خود اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہو' بلکہ وہ اس وکیل کی طرح بات کر رہے تھے جو جانتا ہو کہ اس کے مقدمہ میں زیادہ جان نہیں مگر پھر بھی برابر بحث کئے جا رہا ہو' بڑی محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ انہوں نے کہا: "گزشتہ چند سال سے ہر برس مجھے کھانسی اور بخار کی شکایت ہو جایا کرتی ہے۔ بمبئی میں میرے معالجوں کی تشخیص یہ تھی کہ نرخرے کی نالیوں پر ورم آجاتا ہے۔ پچھلے دو سال میں یہ تکلیف

خاصی بڑھ گئی ہے۔ کھانسی' بخار کی شکایت اب جلد ہونے لگی ہے اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ تکان بھی پہلے کی بہ نسبت اب بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ دوران گفتگو ایک ایک فقرے کے بعد قائد کا دم پھول جاتا اور وہ بے چینی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے۔ پھر اپنی حالیہ تکلیف کا حال بیان کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا: "قریب تین ہفتے ہوئے مجھے سردی لگ گئی اور کھانسی بخار کی تکلیف شروع ہوگئی۔ اس کیلئے کوئٹہ کے سول سرجن نے پینسلین کی گولیاں تجویز کیں۔ اس وقت سے میں پابندی سے یہ گولیاں کھا رہا ہوں۔ اس سے زکام میں افاقہ ہے اور حرارت بھی کم ہوگئی ہے لیکن نقاہت اب بھی بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری صحت میں کوئی بنیادی نقص نہیں۔ یہ بلغم غالباً میرے پیٹ سے آتا ہے اور اگر میرا پیٹ ٹھیک ہو جائے تو بہت جلد میں صحت یاب ہو جاؤں گا۔"

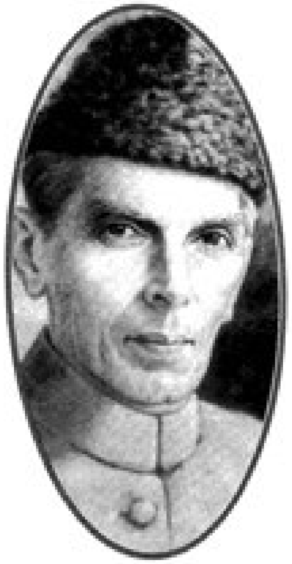

☆......☆......☆

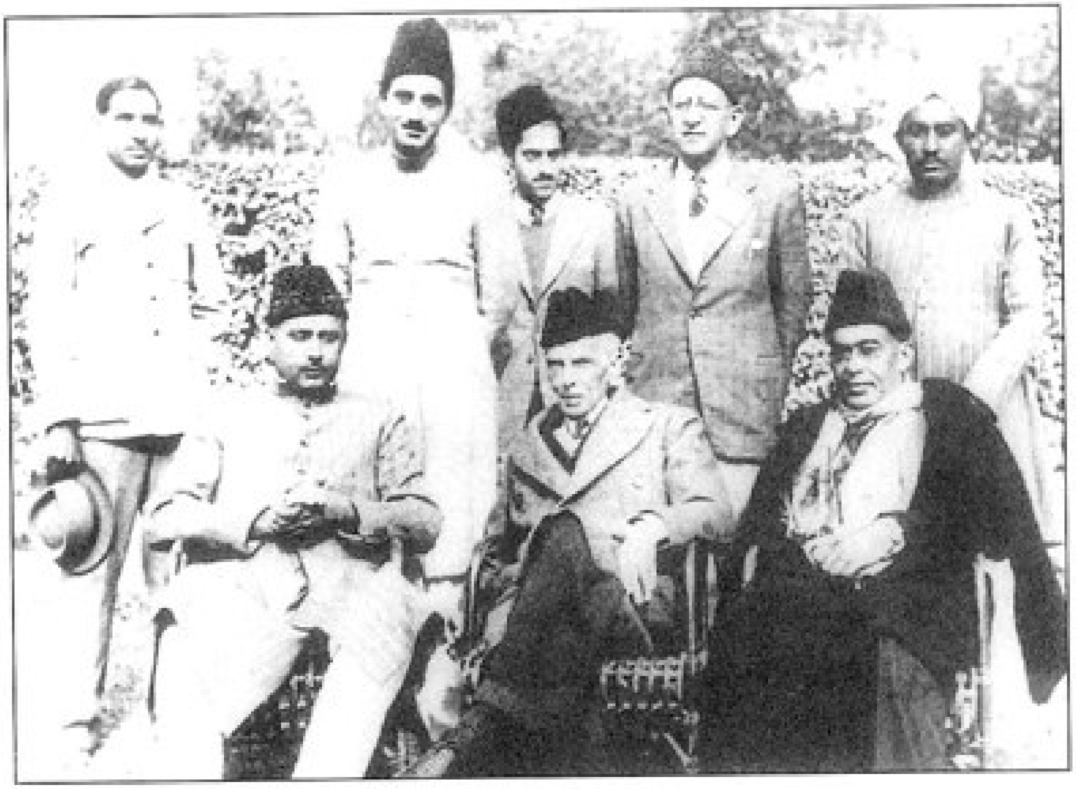

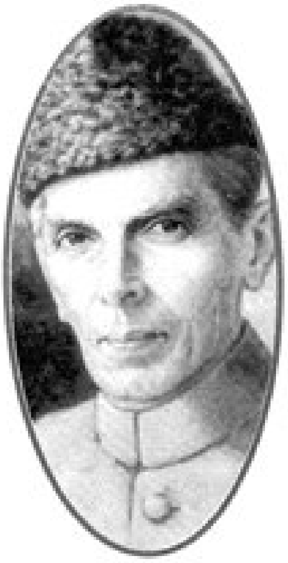

قائداعظم ملک فیروز خاں نون اور نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ کے ہمراہ۔

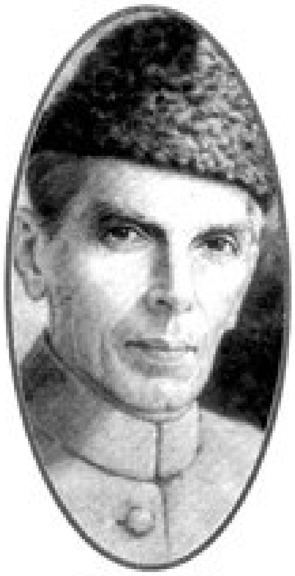

کفایت شعاری کی نصیحت

ہم ذکر کر رہے تھے قائداعظم کی بیماری کا اور حوالہ تھا ہیکٹر بولائتھو کی کتاب ”محمد علی جناح“ کا۔ بانیٔ پاکستان کے آخری ایام کے حوالے سے بولائتھو لکھتے ہیں:

”قائداعظم کے معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش زیارت پہنچے تو قائد کے بارے میں اب تک کی تشخیص سے بالکل متفق نہ تھے۔ انہوں نے چند اور ڈاکٹروں کو مدد کے لیے طلب کیا اور سب نے مل کر قائداعظم کا مکمل طبی معائنہ کیا۔ اس معائنے کا نتیجہ سخت مایوس کن نکلا۔ کرنل الٰہی بخش کو شروع سے یہ اندیشہ تھا کہ قائداعظم پھیپھڑوں کے کسی مہلک مرض میں مبتلا ہیں اور خود مریض کو بھی اس کا احساس تھا۔ اب طبی معائنے کے نتیجے سے کرنل کی رائے کی تصدیق ہو گئی۔

کرنل الٰہی بخش اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں: ”قائداعظم کو یہ منحوس خبر سنا کر میں نے اپنی نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ خبر سن کر ان کے سکون میں بالکل خلل نہ پڑا اور انہوں نے پوچھا: ”کیا آپ نے مس فاطمہ جناح کو خبر دی؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولے:

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آخر وہ خاتون ہیں۔ بہر حال' جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ علاج میں کتنا عرصہ لگے گا۔ میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں اور آپ بلا جھجک ساری حقیقت مجھے بتا دیجیے۔"

ڈاکٹر نے قائداعظم کو سب کچھ بتا دیا' ساری تفصیلات اور مرض کی سنگینی' لیکن ان کی ضد میں فرق نہ آیا۔ پہلے تو انہوں نے نرس رکھنے سے انکار کر دیا' وہ چاہتے تھے کہ صرف ان کی ہمشیرہ ان کی دیکھ بھال کریں۔ بالآخر ایک لیڈی کمپاؤنڈر بلائی گئی۔ اس نے آکر سب سے پہلے ان کا درجہ حرارت اور نبض دیکھی' لیکن جب مریض نے اس سے پوچھا کہ انہیں کتنی حرارت ہے تو نرس نے ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر بتانے سے انکار کر دیا۔ قائداعظم خود فطرتاً آئین اور ضابطے کے بڑے پابند تھے' علاج معالجے کے معاملے میں اس عورت کی آئین پسندی دیکھ کر خوش ہوئے۔

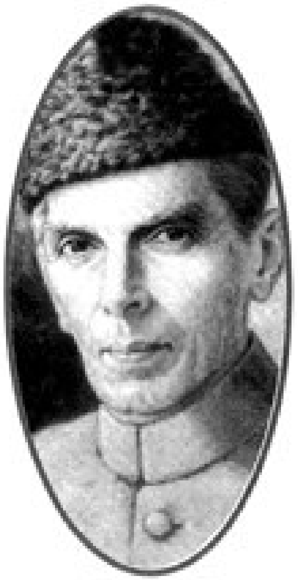

پھر شب خوابی کے لباس کے سلسلے میں وہ کرنل الٰہی بخش سے بحث میں الجھ پڑے۔ بات بہت معمولی تھی۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا: "جناب نائٹ ڈریس کے طور پر یہ ریشمی لباس جو آپ پہن رہے ہیں آپ کے لیے بہت باریک ہے اور آپ کو سردی لگ جانے کا خطرہ ہے۔"

اس پر قائد نے کہا: "فی الحال تو میرے پاس صرف ریشمی لباس ہے' لیکن میرا ارادہ ہے کہ رات کے استعمال کے لیے چند جوڑے کھدر کے بھی بنوالوں۔"

ڈاکٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا اور کہا: "جناب' سوتی کپڑوں سے کام نہ چلے گا۔ آپ کو گرم لباس کی ضرورت ہے اور آپ کی اجازت کے بغیر میں نے تیس گز گرم وائیلا کپڑے کا آرڈر کراچی بھیج دیا ہے۔"

یہ سن کر قائداعظم نے اور تو کچھ نہ کہا' لیکن آئندہ کے لیے ڈاکٹر کو ہدایت کی کہ خرچ کے معاملے میں محتاط رہیں۔ وہ بولے: "ڈاکٹر' میری ایک بات مانو۔ جب بھی کسی چیز پر روپیہ

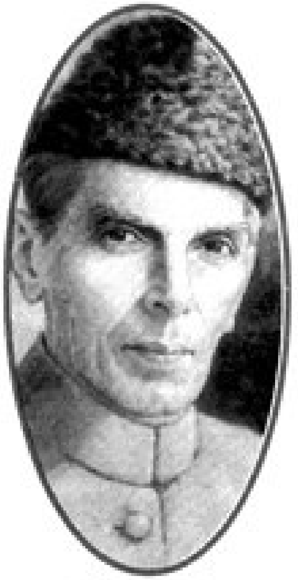

صرف کرو تو یہ اچھی طرح سوچ لو کہ اس خرچ کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

کرنل الٰہی بخش کرکٹ کے کھلاڑی بھی تھے' اس لیے ارادے کے مضبوط تھے۔ انہوں نے جواب دیا:

"جناب آپ کے علاج کے سلسلے میں جب بھی کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو اسے آپ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے کئی دفعہ اس پر اچھی طرح غور کر لیتا ہوں۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ آپ کو گرم کپڑوں کی سخت ضرورت ہے۔"

قائداعظم نے مسکرا کر کہا: "بہت اچھا' مجھے منظور ہے۔"

زیارت کے اس بلند بنگلے میں قائداعظم موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اور اس سے کئی سو میل دور کراچی میں ان کے وزیراعظم اور حکومت کے دوسرے ارکان بے چینی سے ان کی خیریت کی خبروں کے منتظر رہتے۔ جس دن کرنل الٰہی بخش نے قائد کی بیماری کی تشخیص والی "منحوس خبر" قائداعظم کو سنائی اس کے تین روز بعد لیاقت علی خاں زیارت آئے اور آدھ گھنٹے تک قائداعظم کے پاس رہے۔

پھر وہ کرنل الٰہی بخش صاحب کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ ان کی کیا تشخیص ہے۔

کرنل الٰہی بخش کا خیال تھا کہ ان کو حکومت نے نہیں بلکہ مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کے علاج کے لیے طلب کیا ہے' لہٰذا ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ وزیراعظم کو اپنی تشخیص سے مطلع کریں۔"

☆......☆......☆

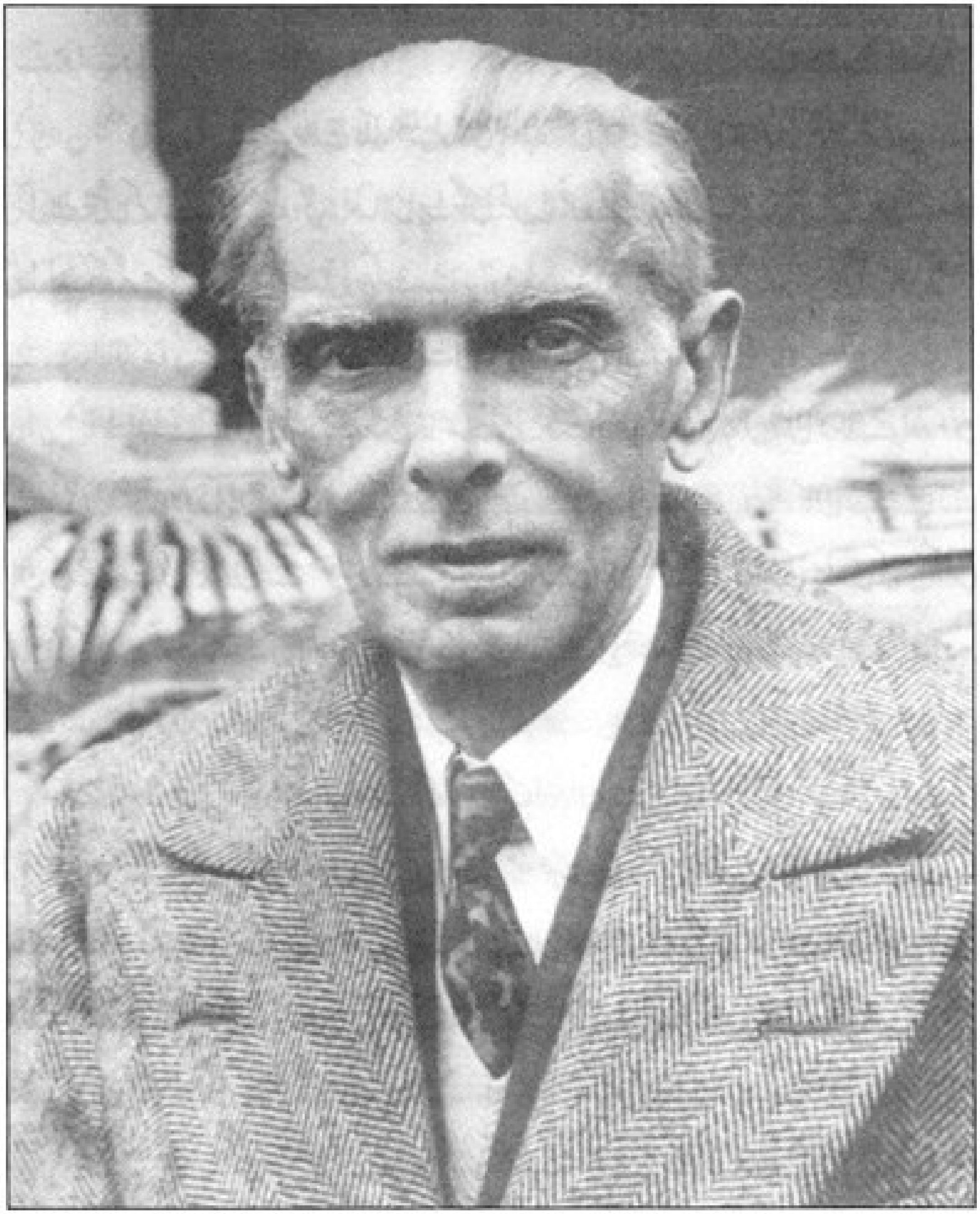

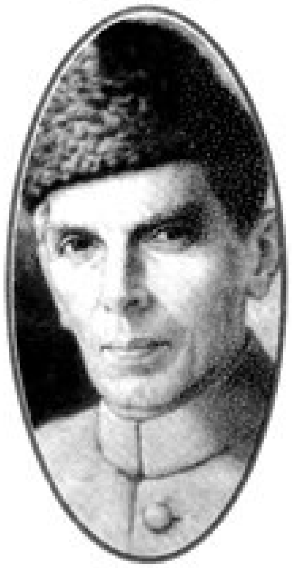

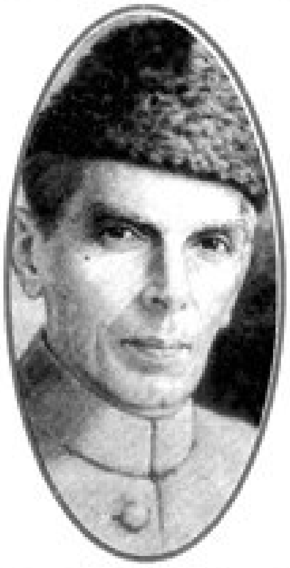

بیماری کی تشخیص

قائداعظم کے آخری دنوں کا تذکرہ' کتاب ہے ''محمد علی جناح'' مصنف ہیکٹر بولائتھو۔ گزشتہ بابت میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں زیارت جاکر قائداعظم کے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش سے پوچھتے ہیں کہ قائد کا حال کیسا ہے؟

لیاقت علی خان نے پوچھا: ''آخر آپ کو کس مرض کا شبہ ہے؟''

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے جواب دیا: ''ابھی تو مجھے آٹھ دس امراض کا شبہ ہے' جب تک میں تصدیق نہ کرلوں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ڈاکٹر کا لہجہ بات کو ٹالنے کا تھا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ مرکزی حکومت کے سیکرٹری جنرل' چودھری محمد علی بھی تھے۔ انہوں نے الٰہی بخش سے کہا: ''آپ کا فرض ہے کہ آپ وزیراعظم کو ٹھیک بتائیں کہ قائداعظم کس مرض میں مبتلا ہیں۔ حکومت کے ارکان کو ہر بات کیلئے تیار رہنا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا: ''آپ صحیح فرماتے ہیں' لیکن میں مجبور ہوں کہ اپنے مریض کی اجازت کے بغیر ان کے مرض کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا۔''

دوسرے دن صبح قائداعظم نے اپنے معالج سے پوچھا: ''وزیراعظم میرے بارے میں آپ سے کیا پوچھ رہے تھے؟'' ڈاکٹر نے جواب میں کہا کہ انہوں نے وزیراعظم کو کچھ نہیں بتایا۔ قائداعظم یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے: ''آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں مملکت کا سربراہ ہوں اور جب میں مناسب سمجھوں گا تو خود اپنے لوگوں کو اپنی بیماری کی نوعیت سے مطلع کروں گا۔''

29 جولائی کو قائد کے ایکسرے کے پرنٹ تیار ہوئے اور ان سے معلوم ہوا کہ مریض کے پھیپھڑوں کی حالت ڈاکٹروں کے اندازے سے کہیں زیادہ خراب ہے۔

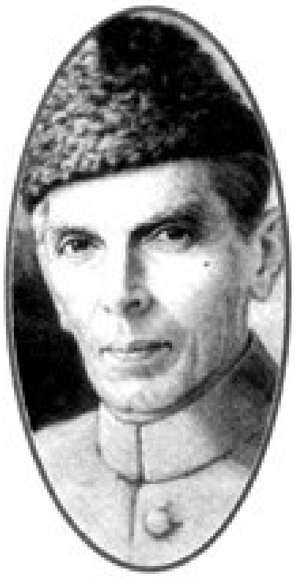

اسی دن سسٹر فلس ڈنہم جو کوئٹہ کے سول ہسپتال میں نرسنگ سپرنٹنڈنٹ تھیں' قائداعظم کی تیمارداری کیلئے زیارت پہنچیں۔ پہلے دن ہی نرس کی اپنے مریض سے تکرار ہوگئی۔ نرس نے تکیے برابر کرنا چاہے تو قائداعظم نے انہیں روک دیا اور بولے: ''مجھے اسی طرح رہنے دو۔'' نرس نے کہا: ''بہت اچھا' اگر آپ کو میری خدمت کی ضرورت نہیں تو مجھے بھی اس پر اصرار نہیں۔ لیکن ڈاکٹر کا حکم ہے......''

قائد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے: ''مجھے کوئی حکم نہیں دے سکتا۔''

اس پر سسٹر ڈنہم نے 'حکم' کا لفظ واپس لے لیا اور کہا: ''ڈاکٹر صاحب نے درخواست کی ہے کہ......''

پھر قائداعظم نے دوا پینے سے انکار کیا تو ان کی نرس نے ان کو خوش کرنے کی کوشش کی اور بولیں: ''جناب اب مان بھی جائیے۔ مجھے امید ہے کہ تھوڑے ہی دن میں آپ میرے طور طریقے قبول کرلیں گے اور میں آپ کے۔''

قائداعظم نے جواب دیا: ''میرے طور طریقے کوئی انوکھے نہیں البتہ ان کو سمجھنے کیلئے صرف عقل سلیم کی ضرورت ہے۔''

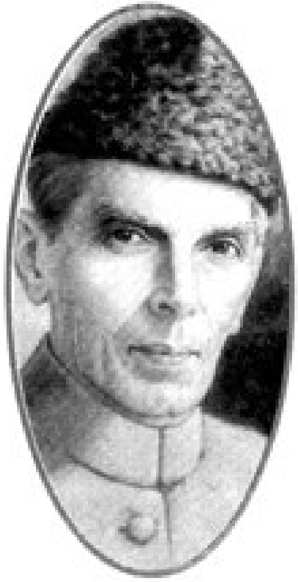

چار دن کی خدمت کے بعد سسٹر ڈنہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ قائداعظم کی تیمارداری ان کے بس کی بات نہیں اور انہوں نے کرنل الٰہی بخش سے کہا کہ ان کی جگہ کوئی مرد خدمت گار رکھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن جب کرنل صاحب نے یہ تجویز قائداعظم کے سامنے پیش کی تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا:

"میں کسی اور کو نہیں رکھنا چاہتا' سسٹر ڈنہم کو ٹھہرنا ہوگا' وہ مجھے پسند ہیں' کیونکہ اپنے فرض کو جانتی ہیں اور بہت اصول پرست ہیں۔"

اس کے بعد جب سسٹر ڈنہم اپنے مریض کے کمرے میں آئیں تو ان کے ہاتھ میں برش اور کنگھا تھا۔ قائد انہیں دیکھ کر مسکرائے اور اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔ نرس نے ان کے بالوں میں برش پھیرنا شروع کیا تو قائد لطیف انداز میں کہنے لگے: "کیا تم میرے سر کا گنجا حصہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟" پھر انہوں نے بڑی شفقت سے نرس کا شکریہ ادا کیا۔

☆......☆......☆

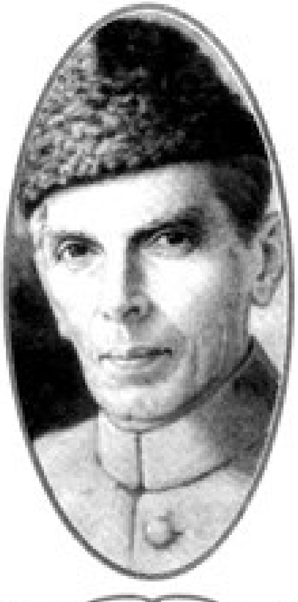

قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح آزادی کی تقریب میں تشریف لا رہے ہیں۔

سٹریچر سے نفرت

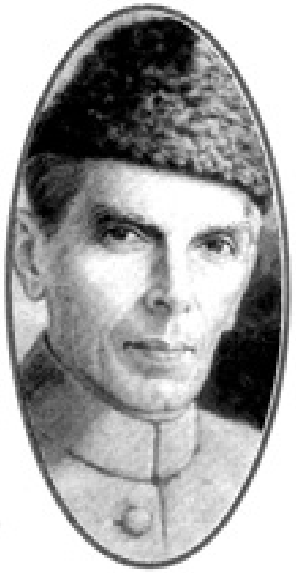

تذکرہ ہو رہا ہے قائداعظم کے آخری ایام کا اور حوالہ ہے ہیکٹر بولائتھو کی کتاب ”محمد علی جناح“ کا۔

بولائتھو لکھتے ہیں: 9 اگست کو ڈاکٹروں کی یہ رائے ہوئی کہ زیارت کی بلندی مریض کے حق میں اچھی نہیں اور انہیں کوئٹہ منتقل کر دینا چاہیے۔ 12 تاریخ کو لیفٹیننٹ مظہر احمد ساری رات سفر کے اہتمام میں مصروف رہے۔ دوسرے دن صبح جب قائداعظم کو بتایا گیا کہ اب روانگی کا وقت آگیا ہے تو انہوں نے کہا: ”میں کپڑے بدلنا چاہتا ہوں۔ شب خوابی کا لباس پہن کر میں ہرگز گھر سے نہیں نکلوں گا۔“

اس پر قائد کو وہ نیا کوٹ پیش کیا گیا جو انہوں نے کراچی میں سلوایا تھا اور پہلے کبھی نہ پہنا تھا۔ پھر قائد نے اپنے پمپ جوتے پہنے اور اس کے بعد اپنے اِکے کی سرمئی ریشمی ڈوری گلے میں ڈالی۔ قائد نے یک چشمہ لگانا پچاس سال قبل شروع کیا تھا' جب وہ لندن میں زیرِ تعلیم تھے اور پیدل اپنی درسگاہ سے کنگسٹن میں اپنی قیام گاہ تک جایا کرتے تھے۔ آج بیماری کے سائے میں

بھی قائد اپنا ایک چشمہ نہ بھولے۔ نوجوانی میں پہلی دفعہ اسے لگا کر انہیں جو خوشی ہوئی ہو گی اس کی یاد شاید آج تازہ ہو گئی ہو گی۔

قائد اپنا اِکا گلے میں ڈال چکے تو انہیں ایک سفید رومال دیا گیا جسے انہوں نے اپنی انگلیوں میں دبا لیا۔ پھر مظہر احمد نے دو پٹھان خدمت گاروں کی مدد سے قائد اعظم کا نحیف جسم اٹھا کر سٹریچر پر رکھ دیا اور اسے نیچے لے گئے۔

لیفٹیننٹ مظہر احمد کہتے ہیں: "جب میں نے قائد اعظم کو اٹھا کر موٹر میں لٹایا تو وہ مجھ سے اتنے قریب تھے کہ ان کا رخسار میرے رخسار کے برابر تھا اور میں ان کی سانس کی ہلکی ہلکی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے انہیں گدے پر لٹا دیا' لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ آرام سے نہیں لیٹے ہیں۔ میں ابھی تک انہیں پکڑے ہوئے تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ انہیں ذرا ہٹا کر ایسی جگہ لٹاؤں جہاں انہیں پوری طرح آرام مل سکے۔ اسی اثنا میں انہوں نے مجھ سے کہا: "مظہر' تمہارا سانس پھول رہا ہے' اور میرا بھی یہی حال ہے۔ ذرا ٹھہر کر ستا لو۔" میں کچھ دیر ٹھہر گیا اور پھر انہیں اٹھا کر آرام سے لٹا دیا۔ پھر میں نے ان سے پوچھا:

"جناب! اب آپ آرام سے ہیں؟"

اس پر وہ مسکرائے اور پوچھا: "میرا رومال کہاں ہے؟"

میں نے رومال ڈھونڈ کر انہیں دیا۔ پھر عملے کے باقی سب لوگ موٹروں میں بیٹھ گئے اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ "جب ہم کوئٹہ کی ریذیڈنسی میں پہنچے تو میں قائد اعظم کو ان کے بستر پر لے گیا۔ میں نے انہیں لٹایا تو وہ مسکرا دیئے لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔"

16 اگست کو کرنل الٰہی بخش نے اپنے مریض کو یہ خوشخبری سنائی کہ ان کے پھیپھڑے کی حالت اب پہلے کی نسبت چالیس فیصد بہتر ہے۔ اس پر قائد اعظم نے پوچھا "سو فیصد اصلاح کب تک ہو جائے گی؟"

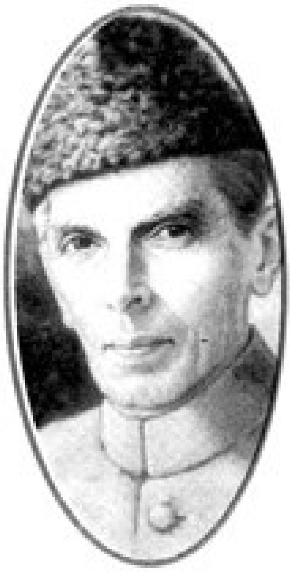

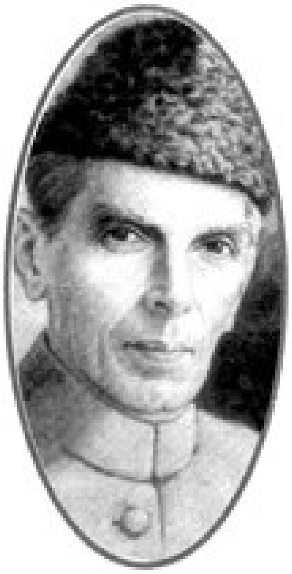

دو دن بعد ان کی حالت اتنی سدھر گئی کہ انہوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا اور روزانہ ایک گھنٹہ سرکاری کاغذات کے مطالعے پر صرف کرنے لگے۔ انہی دنوں چودھری محمد علی کراچی سے آ کر پھر قائداعظم سے ملے اور انہیں دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ ”ان کی کیفیت اب پہلے سے بہت بہتر ہے اور بحیثیت مجموعی وہ روبہ صحت معلوم ہوتے ہیں۔“

تھوڑے دن بعد قائداعظم اس قابل ہو گئے کہ اٹھ کر کمرے میں چند قدم چل سکیں۔ انہوں نے اسپاگیٹی (Spaghetti)، انگور اور آڑو کھائے اور کراچی واپس جانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگائی کہ ”مجھے وہاں بیساکھیوں کے سہارے نہ چلنا پڑے۔ میں ہرگز پسند نہیں کرتا کہ لوگ مجھے سٹریچر پر ڈال کر موٹر سے میرے کمرے تک لے جائیں۔“

یہ عزم ان کی دلیری کا آخری مظاہرہ تھا۔

☆......☆......☆

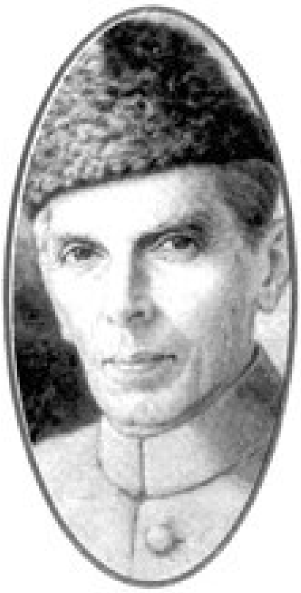

قائداعظم اپنے پوٹریٹ پر دستخط کرتے ہوئے۔

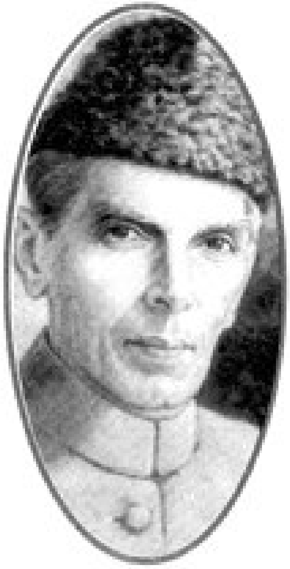

آخری الفاظ......کشمیر

ہیکٹر بولائتھو اپنی کتاب "محمد علی جناح" میں لکھتے ہیں: "29 اگست کو یکایک قائد کی قوت ارادی جواب دینے لگی اور انہوں نے کرنل الٰہی بخش سے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ پہلی مرتبہ زیارت آئے تھے تو میری خواہش تھی کہ میں زندہ رہوں۔ لیکن اب مجھے اس کی کچھ فکر نہیں کہ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں۔"

بعد میں کرنل الٰہی بخش نے اپنی ڈائری میں لکھا: "میں نے دیکھا کہ قائد کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ میں اس مایوسی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ خود انہوں نے وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کا مقصد زندگی اب پورا ہو چکا ہے۔ لیکن اس توجیہہ سے میری تسلی نہ ہوئی' بلکہ محسوس ہوا کہ یہ بات محض مجھے ٹالنے کو کہی گئی ہے۔ اصل وجہ میرے لئے معمہ بنی رہی۔ میں دل میں یہی سوچتا رہا کہ کیا پانچ ہفتے پہلے ان کا کام مکمل نہ ہوا تھا؟ کیا ان پانچ ہفتوں میں انہوں نے کوئی کام ایسا کیا تھا جس نے انہیں یہ احساس دلا دیا کہ ان کا مقصد زندگی اب مکمل ہو گیا ہے؟ ان سوالوں کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا' لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ کوئی بات ان دنوں میں ایسی ہوئی

ہے جس نے ان کے عزم زندگی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔"

5 ستمبر کی شام کو قائداعظم کو نمونیا ہو گیا۔ تین دن تک ان کا بخار چڑھتا گیا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے چینی کا دورہ بھی پڑتا تھا۔ اس حالت میں وہ اکثر بڑبڑاتے رہتے اور اس طرح ان خیالات کا سراغ ملتا جو اس وقت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں کارفرما تھے۔ اس حالت میں جو آخری فقرے ان کی زبان سے نکلے وہ کشمیر کے متعلق تھے۔ اچانک ان کی آواز اونچی ہو گئی اور انہوں نے غصے سے کہا: "آج کشمیر کمیشن نے مجھ سے ملاقات کیلئے وقت لیا تھا۔ وہ اب تک کیوں نہیں آئے، وہ کہاں ہیں؟"

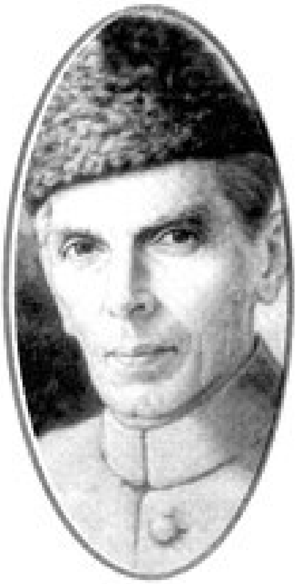

10 ستمبر کو کرنل الٰہی بخش نے مس فاطمہ جناح کو مطلع کر دیا کہ ان کے بھائی اب چند دن کے مہمان ہیں۔

دوسرے دن کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر تین طیارے اترے جن میں قائداعظم کا حسین وائیکنگ بھی تھا۔ قائداعظم کو اسٹریچر پر ڈال کر ہوائی جہاز تک پہنچایا گیا۔ جہاز کے انگریز پائلٹ اور اس کے باقی عملے نے صف میں کھڑے ہو کر گورنر جنرل کو سلامی دی۔ قائداعظم نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اٹھا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر ہوائی جہاز روانہ ہو گیا اور چند لمحوں میں کوئٹہ کے ناہموار پہاڑوں کے اوپر 7 ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔

سہ پہر کو سوا 4 بجے جہاز کراچی کے قریب ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ 13 مہینے پہلے اسی مقام پر ہزاروں پاکستانی اپنے مسیحا و رہبر کا استقبال کرنے جمع ہوئے تھے۔ آج صرف چند آدمی وہاں موجود تھے کیونکہ قائداعظم کی آمد صیغہ راز میں رکھی گئی تھی، حتیٰ کہ وزیراعظم کو بھی کوئٹہ سے فون پر ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ قائداعظم کے استقبال کیلئے ہوائی اڈے پر نہ آئیں۔

جہاز کے پاس ملٹری سیکرٹری کرنل نولز نے قائداعظم کے اسٹریچر کو ہوائی جہاز سے باہر جاتے ہوئے دیکھا، اور جب اسٹریچر کا رخ سورج کی طرف ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ

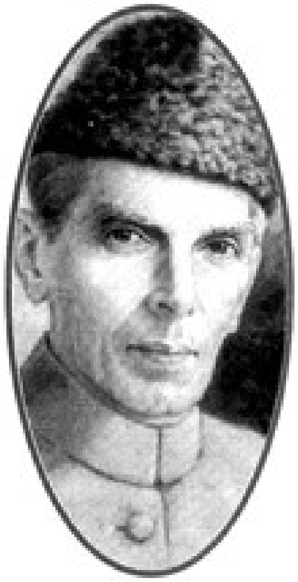

قائداعظم نے اپناہاتھ چادر میں سے نکالااور آہستہ سے اٹھاکراپنی آنکھوں پر رکھ لیاتاکہ سورج کی روشنی ان پر نہ پڑے۔

اسٹریچر ایک فوجی ایمبولینس میں رکھ دیا گیا' پھر مس فاطمہ جناح اور سسٹر ڈنہم بھی اس میں سوار ہو گئیں اور ایمبولینس شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ لیکن تھوڑی دور جاکر' مہاجروں کی ایک گنجان بستی سے ذرا آگے 'اس کاانجن بگڑ گیا۔ایک گھنٹے تک ڈرائیور گاڑی ٹھیک کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا' مگر وہ درست نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ شہر سے دوسری ایمبولینس آ گئی۔

☆......☆......☆

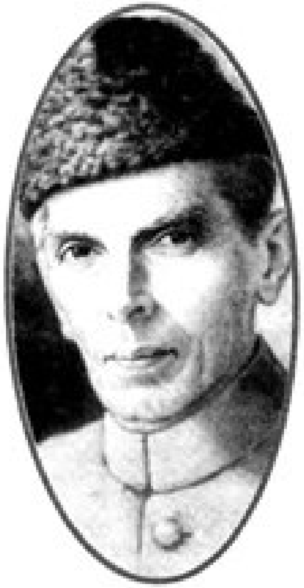

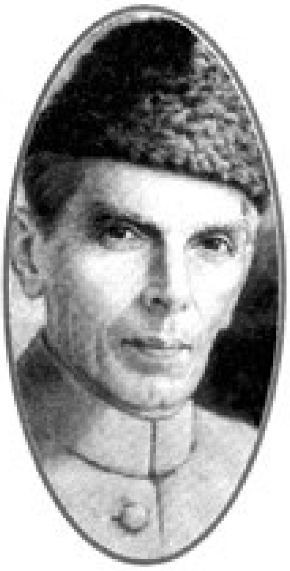

اور ایمبولینس خراب ہوگئی

ہم ہیکٹر بولائتھو کی کتاب محمد علی جناح سے اقتباسات کا جائزہ لے رہے تھے' جو بانیٔ پاکستان کی زندگی کے آخری ایام پر روشنی ڈالتے ہیں۔

انگریز سوانح نگار لکھتا ہے: ''مسٹر ڈنہم نے کراچی میں سڑک پر قائداعظم کی ایمبولینس کی خرابی کے بعد اس قیامت کی گھڑی کا حال یوں بیان کیا ہے:

''ہم مہاجروں کی بستی اور اس کی کیچڑ سے زیادہ دور نہ تھے' اور مکھیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ میں نے گتے کا ایک ٹکڑا ڈھونڈ نکالا اور اس سے مسٹر جناح کے منہ پر پنکھا جھلنے لگی تاکہ مکھیاں نہ بیٹھنے پائیں۔ چند منٹ تک ان کے پاس میرے سوا کوئی نہ تھا اور اس اثنا میں انہوں نے میری دلجوئی اس انداز سے کی کہ میں ساری عمر نہیں بھول سکتی۔ انہوں نے اپنا بازو چادر میں سے نکالا اور اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے' لیکن ان کی آنکھوں سے ان کے جذبہ تشکر کا پوری طرح اظہار ہو رہا تھا۔ میں ان کی جو کچھ خدمت کر سکی تھی یہ ایک نگاہ اس کا مکمل صلہ تھی۔ اس سے بہتر صلہ مجھے کیا مل سکتا تھا۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ

قائداعظم کی ساری روح ان کی آنکھوں میں اتر آئی ہے۔"

دوسری ایمبولینس پر سفر کی آخری منزل شروع ہوئی۔ اس وقت بہت سے لوگ ہوا خوری کیلئے سڑک پر نکل آئے تھے' لیکن چونکہ ایمبولینس پر کوئی پرچم نہ تھا' اس لئے کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ چھ بج کر دس منٹ پر ایمبولینس گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئی اور قائداعظم کو اوپر ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹروں اور نرس نے انہیں ایک مقوی قلب دوا پلانے کی کوشش کی' لیکن دوا حلق میں اترنے کے بجائے ان کے دہانے سے بہہ کر باہر گر گئی۔

کراچی کے گرجا گھر نے سات کا گھنٹہ بجایا' پھر چند منٹ بعد شہر بھر کے مؤذن اپنی اپنی مسجدوں کے میناروں پر سے مسلمانوں کو مغرب کی نماز کیلئے بلانے لگے۔

ڈاکٹروں نے قائداعظم کے پلنگ کی پائنتی ذرا اونچی کر دی تاکہ دل کی طرف دوران خون تیز ہو جائے۔ پھر انہوں نے ایک انجکشن لگانا چاہا' لیکن قائد کے جسم کی رگیں بے جان ہو چکی تھیں۔ نو بج کر پچاس منٹ پر کرنل الٰہی بخش نے جھک کر آہستہ سے کہا:

"جناب! ہم نے آپ کو طاقت کا انجکشن لگایا ہے اور انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس پر قائداعظم نے اپنے سر کو جنبش دی اور پھر آخری مرتبہ ان کی آواز سنائی دی:

"نہیں' اب میں نہیں بچوں گا۔" اس گفتگو کے تیس منٹ بعد وہ اس دنیا سے سدھار گئے۔

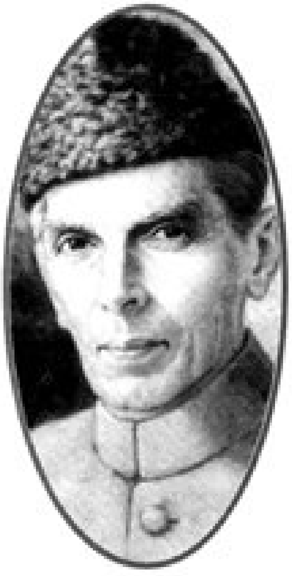

بولائتھو نے لکھا: اس سانحہ عظیم کی خبر رات ہی میں بازاروں سے نکل کر سارے شہر میں پھیل گئی۔ کچھ لوگ آہ و بکا کر رہے تھے اور کچھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گورنمنٹ ہاؤس کی اونچی دیواروں کے قریب ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔ شام کو جو ہوا چل رہی تھی' وہ اب بند ہو چکی تھی اور رات بہت گرم تھی۔ ہجوم میں جو لوگ دیوار سے سب سے زیادہ قریب تھے' انہوں نے اسے ہاتھ لگایا اور دعائیں پڑھتے رہے۔

بولائتھو لکھتا ہے:

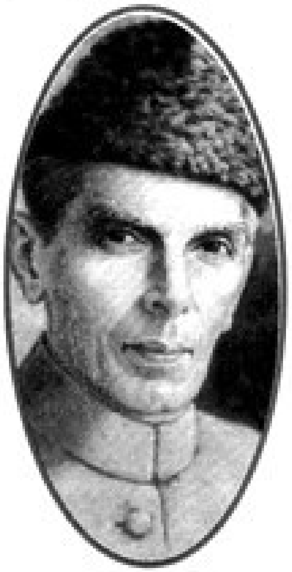

”ذرا دیر بعد ایک شخص آہستہ آہستہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کفن اور ایک چھوٹی سی بوتل تھی۔ کفن کو آبِ زمزم میں ڈبویا گیا تھا اور بوتل میں عطر تھا۔ یہ شخص کچھ عرصہ قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کرنے مدینے گیا تھا۔ وہاں اس موقع پر جو عطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر چھڑکا گیا تھا اس میں سے تھوڑا سا وہ تبرکاً بوتل میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ قائداعظم کو کفن پہنا دیا گیا اور پھر یہی عطر اس کفن پر چھڑکا گیا۔

لڑکپن کے دنوں میں محمد علی جناح نے ہمیشہ مٹی میں کھیلنے سے پرہیز کیا تھا اور اپنے ہاتھوں اور دامن کو گرد و غبار سے بچایا تھا۔ لڑکپن کا یہ حوصلہ اور غرور تمام عمر اُن میں باقی رہا اور موت کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ بارہ ستمبر کی صبح کو وہ آخر اسی خاک میں مل گئے جس سے ساری عمر دور رہے تھے۔

☆......☆......☆

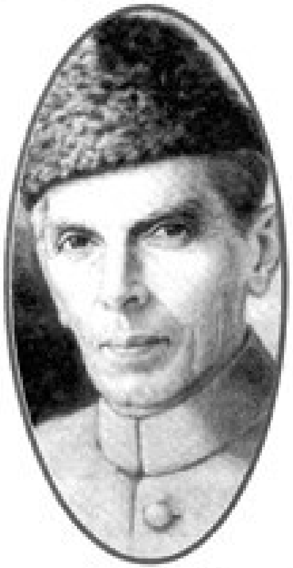

آل انڈیا مسلم لیگ سیشن مارچ 1940ء لاہور

(دائیں سے بائیں) نواب صدیق علی خاں' لیاقت علی خاں' شاہنواز ممدوٹ' میاں بشیر احمد' قائد اعظم محمد علی جناح' سر سکندر حیات' سر سعد اللہ کے بیٹے کو گود میں لئے ہوئے مولوی فضل اے حق' خضر حیات' میاں عبدالحئی' چودھری خلیق الزماں (کھڑے ہوئے) نوابزادہ شیر علی خاں' عبداللہ ہارون' میاں امیر الدین' عبدالرؤف' سر سعد اللہ' قاضی عیسیٰ' ملک برکت علی اور سردار اورنگزیب۔

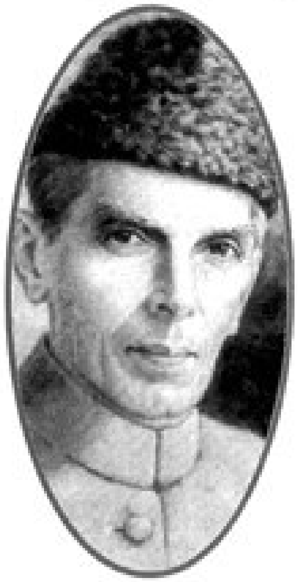

پہلی ملاقات اور قائد کا دکھ

گزشتہ دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا' جس کا ایک مضمون قائداعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری جناب فرخ امین کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ نومبر 1948ء میں لکھا گیا اور بعد میں 15 روزہ "خدمت" لاہور میں یکم ستمبر 1974ء کو شائع ہوا۔ یہ تحریر اس قابل ہے کہ اسے من و عن قوم کے سامنے پیش کیا جائے۔ فرخ امین لکھتے ہیں:

11 ستمبر کی اس سوگوار گھڑی سے' جب ہمارے قائداعظم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا' ہر طرح کے لوگ چھوٹے بڑے' امیر غریب مجھ سے اپنے مرحوم محبوب قائد کے متعلق سوال پر سوال کر رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں:

ہمیں تو ان کی بیماری تک کا علم نہیں تھا۔ آخر یہ اچانک ہوا کیسے؟" وفات سے پہلے ان کی حالت کیا تھی؟"

"ان کی آخری گھڑیاں کس طرح کٹیں؟"

دراصل میری خوش نصیبی مجھے قائداعظم کے قریب لائی۔ پاکستان کی عارضی

حکومت کے قیام کے چار دن بعد 23 جولائی 1947ء کو نئی دہلی میں حکم ملا کہ میں ٹھیک دس بجے چودھری محمد علی صاحب سیکرٹری جنرل پاکستان سے ملوں۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا اور انہوں نے مجھے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری منتخب کر کے قائداعظم کی خدمت میں پہنچنے کا حکم دیا۔ میں زندگی کے اس غیر معمولی تغیر پر مسرور بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی' مسرور تو اس لیے کہ کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے قوم کے معمار اور مملکت کے بانی قائداعظم کی خدمت کا موقع ملے لیکن اس مسرت کے ساتھ مجھے تھوڑی سی پریشانی بھی تھی۔

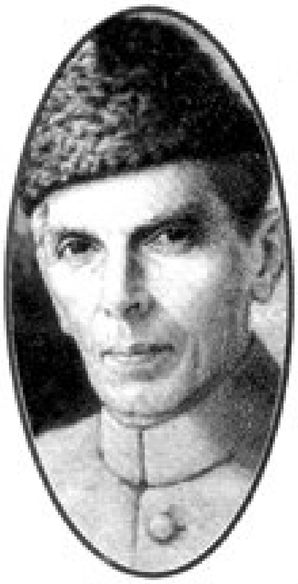

اب تک میں نے قائداعظم کو دور سے جلسوں' منبروں اور اسمبلی کے ایوانوں میں دیکھا تھا اور ان کا گرویدہ تھا لیکن اتنی بڑی ہستی سے اس قدر قریب ہونا ذرا مختلف بات تھی اور اسی لیے جب میں دہلی میں اورنگزیب روڈ کی طرف جا رہا تھا تو میری رفتار میں ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ تھی۔ وہاں پہنچ کر اپنا کارڈ بھجوایا۔ شاید میرے پہنچنے کی اطلاع قائداعظم کو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ مجھے فوراً اندر طلب فرمایا اور میں ذرا سی دیر میں قائداعظم کے سامنے کھڑا تھا۔

فرخ امین لکھتے ہیں: یہ لمحہ میری زندگی کا اہم ترین لمحہ ہے۔ قائداعظم صوفے پر تشریف فرما تھے اور سگار پی رہے تھے۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ گھبراہٹ اب بھی مجھ پر غالب تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے قائداعظم مجھ سے کیا خدمت لیں گے لیکن قائداعظم کے مخصوص مشفقانہ انداز نے بہت جلد میری گھبراہٹ ختم کر دی۔ پہلے انہوں نے مجھ سے میری تعلیم' ملازمت اور کراچی جانے کے متعلق کچھ سوالات پوچھے اور پھر خطوں اور تاروں کے اس ڈھیر کی طرف جو گورنر جنرل کے تقرر پر دنیا کے مختلف حصوں سے قائداعظم کے پاس آئے تھے' اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا تم مہربانی کر کے ان پر ایک نظر ڈال لو گے؟" یہ بات قائداعظم نے ایسے لہجے اور

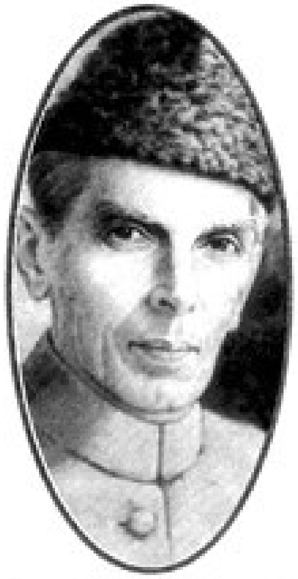

انداز میں فرمائی کہ جو تھوڑی بہت گھبراہٹ اب تک مجھ پر طاری تھی وہ یک لخت رخصت ہو گئی۔

اس کے دو ہفتے بعد ہم کراچی پہنچ گئے اور آتے ہی سرکاری مصروفیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ 14 اگست کو جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے فرمایا تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔

اسمبلی کا یہ اجلاس کراچی میں ان کی پہلی سرکاری مصروفیت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ فضا قائداعظم زندہ باد' پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ اس دل افروز منظر سے قائداعظم بھی متاثر تھے۔ انہوں نے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”ہمارے پاس انسانی قوت کا کتنا شاندار سرمایہ ہے۔ اگر ہم ان کے جوش کو صحیح راہوں پر لگا سکیں تو پاکستان یقیناً دنیا کی نمایاں مملکتوں میں سے ایک ہو گا۔“

☆......☆......☆

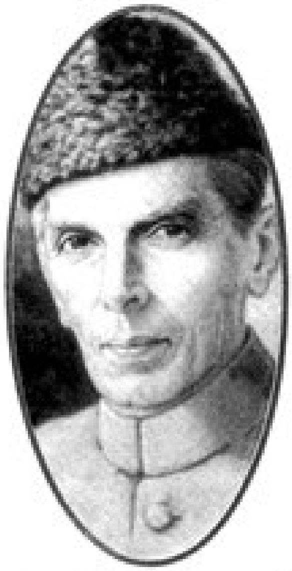

پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم کو گارڈ آف آنر پیش کیا جارہا ہے۔

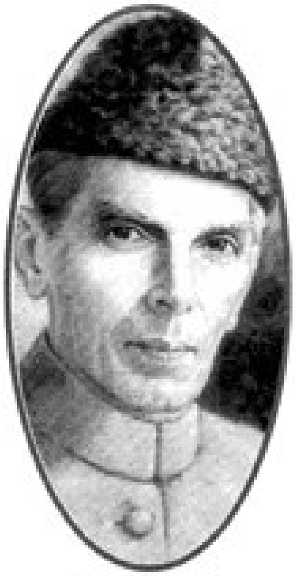

اندر کا دکھ

قائداعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین نے اپنی یادداشتوں میں قائداعظم کے اس کرب اور اندرونی دکھ کا بڑے مؤثر انداز میں تذکرہ کیا ہے جسے وہ سب سے پوشیدہ لئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ فرخ امین لکھتے ہیں:

ہم اسٹریچن روڈ پر وائی ایم سی اے کی عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس عمارت کو دیکھ کر قائداعظم نے فرمایا:

"وائی ایم سی اے تنظیم کی ایک بڑی اچھی مثال ہے۔ تھوڑے سے آدمیوں نے دنیا کے کونے کونے میں اس کی شاخیں قائم کرلی ہیں۔"

اس کے بعد باتوں باتوں میں قائداعظم پارسیوں کے متعلق فرمانے لگے کہ "یہ تھوڑے سے لوگ محض اپنی جانفشانی اور تنظیم کی بدولت عزت اور دولت دونوں کے مالک ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے لوگوں کو صحیح تربیت دے کر منظم کرسکیں تو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کرسکتے ہیں۔"

گورنر جنرل بننے کے بعد قائداعظم نے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کیا اور آخر ان کی یہ شدید محنت ان کی موت کا باعث بنی۔ پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی دو مہینے ان کے لیے انتہائی مصروفیت اور پریشانی کے مہینے تھے۔ یہ زمانہ تھا جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا جا رہا تھا اور مغربی پنجاب کی حکومت کو (جو 16 اگست کو مسلم لیگی وزارت کے ہاتھوں میں آئی تھی) یکایک مہاجرین کے سخت اور زبردست مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ حکومت کے قدم متزلزل تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ خدانخواستہ پاکستان اپنے قیام کی پہلی منزل میں آگے نہ چل سکے۔ قائداعظم نے اس زمانہ میں جانفشانی سے کام کیا اور اس اندیشہ ناک دور میں ان کی آواز کی یہ گرج کہ "پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے۔" لوگوں کے لیے سہارا بنی۔

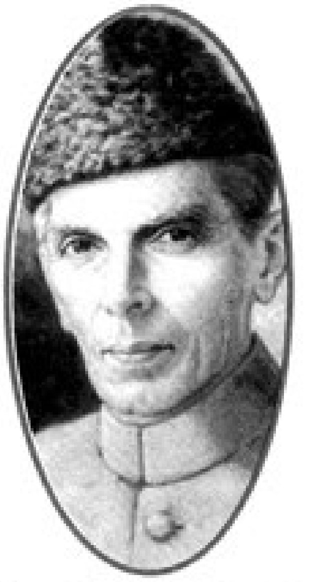

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان مستحکم ہو گیا اور مستحکم رہے گا۔ لیکن آزمائش کے اس دور کی قائداعظم کو بہت بڑی قیمت دینی پڑی۔ ان کی صحت خراب ہوگئی۔ بعض لوگ ان کے متعلق کہتے تھے کہ دوسروں کا دکھ درد محسوس نہیں کرتے۔ یہ صحیح نہیں۔ البتہ وہ فکر اور اندیشے کے ایسے موقعوں پر بھی' جب دوسروں کے کمزور اعصاب پر جذبات کا غلبہ ہو جاتا' سکون اور توازن کو قائم رکھتے۔ اپنی پریشانی ظاہر کر کے دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا باطن ان حالات سے درد و کرب میں مبتلا تھا۔ اس زمانہ میں' میں نے انہیں دو ایک بار رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں ٹہلتے دیکھا ہے۔ اسی لیے میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر ان دنوں قائداعظم کو یہ کرب نہ سہنا پڑتا تو اتنی جلدی ہم سے الگ نہ ہوتے۔ اللہ ان کی روح کو ابدی سکون دے۔

اکتوبر 1947ء میں جب وہ دوسری بار لاہور تشریف لے گئے تو انہیں نزلہ ہو گیا اور اس زمانہ میں' میں نے دیکھا کہ وہ اپنی صحت کے معاملے میں کس قدر بے نیاز تھے۔ میں نے دو

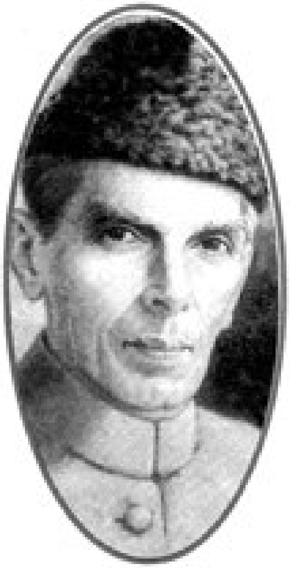

مرتبہ ان سے مؤدبانہ گزارش کی کہ اپنے لیے اچھے سے اچھا ڈاکٹر بلوانے کی اجازت دیجیے۔ لیکن دونوں مرتبہ انہوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا: ”مسٹر امین! مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں‘ میرا گلا تو بارہا خراب رہ چکا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

قائداعظم مجھے ہمیشہ امین کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ لیکن جب کوئی بات ان کے خلاف مزاج ہو جاتی تو وہ نام سے پہلے مسٹر لگا دیتے اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ جو کچھ میں نے کہا یا کیا ہے وہ ان کی مرضی کے خلاف ہے۔ چنانچہ مجھے خاموش ہو جانا پڑتا۔

قائداعظم مزاحاً فرماتے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر انہیں اپنے تجربہ کا آلۂ مشق بنائیں۔

قائد کو اس بات سے سخت نفرت تھی کہ کوئی نرس ان کی دیکھ بھال کرے اس لیے کہ اپنے ذاتی کاموں میں انہیں کسی کی مدد اچھی نہ لگتی تھی۔ شروع شروع میں ان کے کاغذات یا ان کا قلم اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیتا لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں فرمایا۔

قائداعظم اپنے خیالات اور عقائد کے معاملہ میں بڑے راسخ تھے‘ وہ صرف ایک مملکت کے گورنر جنرل ہی نہیں بلکہ قوم کے قائداعظم بھی تھے اور جانتے تھے کہ قوم کے لیے کیا چیز سب سے اچھی ہے۔ گو میں ان کا ادنیٰ خادم تھا‘ وہ ہمیشہ میرے نقطۂ نظر کو سنتے اور اپنا خاصا وقت صرف کر کے مجھے میرے خیال کی کوتاہیوں سے آگاہ کرتے۔

☆......☆......☆

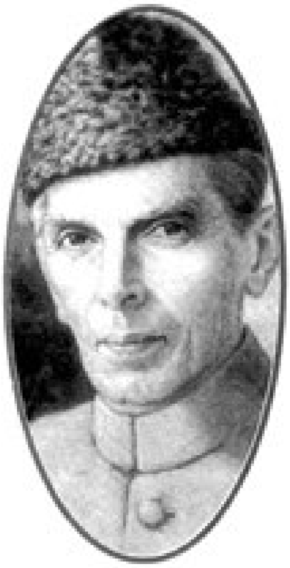

قائداعظم پاک بحریہ کے دستے کا معائنہ کر رہے ہیں۔

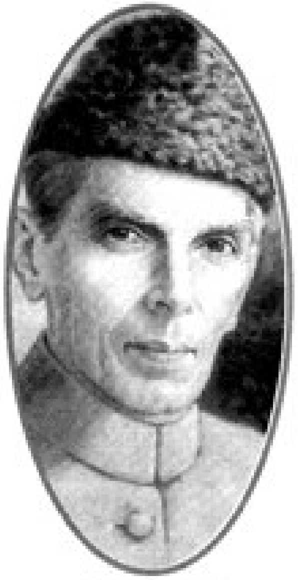

اعتماد کا شہنشاہ

ہم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم کے پہلے ملٹری سیکرٹری کرنل برنی کی یادداشتوں کے حوالے سے بعض واقعات کو دیکھ رہے تھے۔ کرنل برنی لکھتے ہیں:

"ان دنوں میں قائداعظم کے ساتھ کبھی نہتا باہر نہیں جاتا تھا کیونکہ کچھ دہشت پسندوں نے دھمکی دی تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ قائداعظم کا کام تمام کردیں گے۔"

7 ستمبر 1948ء کو شیخ کویت کے اعزاز میں قائداعظم نے ایک دعوت دی، جس میں چوٹی کے صرف پچاس اکابرین مدعو تھے۔ دعوت بڑے خوشگوار ماحول میں ’سوئمنگ پول کے کنارے ہورہی تھی۔ اسی اثنا میں باہر پھاٹک پر ایک مشتعل ہجوم نے مظاہرہ کیا۔ میں دعوت میں سے اٹھ کر باہر گیا تو دیکھا کہ مرکزی سیکرٹریٹ کے تین سو اہلکار جمع ہیں اور قائداعظم سے ملاقات کا مطالبہ کررہے ہیں۔

میں نے مظاہرین سے درخواست کی کہ وہ اپنے دو ایک رہنما منتخب کرلیں جو آکر ان کا مدعا بیان کریں مگر جلد ہی یہ اندازہ ہوا کہ اس ہجوم کا کوئی رہنما نہ تھا۔ وہ سب مشرقی پنجاب میں

اپنے عزیزوں کے قتل عام کی افواہیں سن کر گورنمنٹ ہاؤس پر چڑھ دوڑے تھے۔ ان کی حالت واقعی قابل رحم تھی اور میں نے پہلے ہی پولیس کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ پہنچ جائے اور انہیں قابو میں کرے تا کہ وہ صبر اور تحمل سے کام لیں۔

مظاہرین اس بات پر مصر تھے کہ جب تک قائداعظم خود آکر ان سے بات نہ کرلیں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے۔ آخر کار قائداعظم اٹھ کر بالائی منزل کے برآمدے پر آئے اور ہجوم سے مختصر خطاب کیا۔ انہوں نے مظاہرین کو بتایا کہ "آپ کے عزیزوں کو بچا کر پاکستان لانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ پھر انہوں نے ہجوم کو نظم وضبط کی تلقین کی اور کہا کہ وہ فوراً گورنمنٹ ہاؤس کے میدان کے باہر چلے جائیں کیونکہ یہاں غیر ملکی مہمانوں سے بات چیت جاری ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ تاثر لیں کہ پاکستانی ڈسپلن کے پابند نہیں ہوتے۔"

"اس پر ہجوم نے "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگائے اور سب لوگ مزید شور و شغب کئے بغیر باہر چلے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مسٹر جناح کا اپنی قوم پر زبردست اثر ہے۔ ان کے بعد کوئی پاکستانی رہنما شاید یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔"

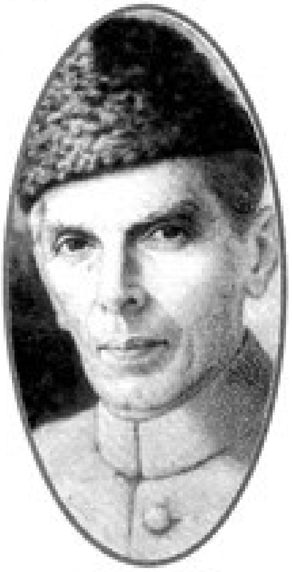

قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو ان دنوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قائداعظم اب بہت تھک چکے تھے، لیکن وہ اپنی تھکن کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے۔ شاید انہوں نے اپنے آپ کو بھی یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اب بھی توانا ہیں اور سخت محنت کر سکتے ہیں۔ وہ روز رات گئے تک اپنے دفتر میں کام کرتے اور اپنی اپیلوں اور پیغاموں سے مہاجرین کی تالیف قلب کی کوشش کرتے رہتے۔ ہندوستان سے روز بروز زیادہ تشویشناک خبریں آرہی تھیں۔ 7/ستمبر کو ان کے ملٹری سیکرٹری نے اپنی ڈائری میں یہ بھی لکھا کہ گزشتہ ہفتہ دہلی کے مسلمانوں پر بہت سخت گزرا۔ بلوائیوں کے منظم جتھے مسلمانوں کی دکانوں میں گھس آئے اور انہیں لوٹ لیا۔ سڑکوں پر انہوں نے چلتی ہوئی موٹروں کو روک لیا اور جو

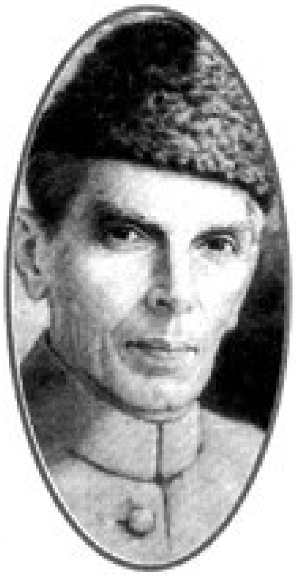

مسلمان دکھائی دیا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دہلی میں ان چند دنوں کے دوران ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار کے درمیان مسلمان مارے گئے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"اس نئی ریاست کی تشکیل میں یوں بھی ہزار دقتیں تھیں۔ اب ستم بالائے ستم یہ کہ لاکھوں بے خانماں افراد کی حفاظت اور بحالی کی ذمہ داری بھی پاکستان کے سر پر آپڑی ہے۔ ہمیں ہزاروں مفلس پناہ گزینوں کیلئے کھانے اور دواؤں کا انتظام کرنا ہے اور لاکھوں اجڑے ہوئے مسلمانوں کو ہندوستان سے لاکر پاکستان میں بسانا ہے۔ یہاں تو ان کے رہنے کیلئے گھر بھی نہیں ہیں۔"

☆......☆......☆

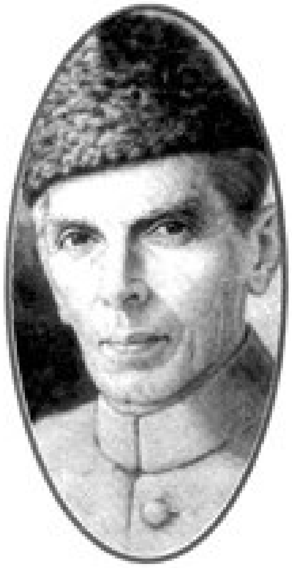

قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل پاکستان حلف اٹھا رہے ہیں۔

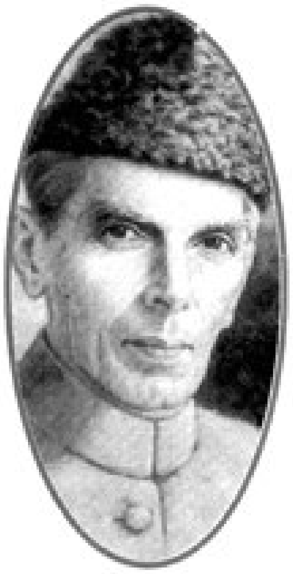

بے خوف انسان

پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر قائداعظم کے انگریز ملٹری سیکرٹری کرنل ای ایس ٹی جے برنی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے:

قیام پاکستان کے بعد لاہور کے دورے میں موٹر میں مسٹر جناح نے مجھ سے دل کھول کر باتیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ ”میں اپنی ہمشیرہ کا بہت ممنون ہوں‘ جنہوں نے برسوں اتنے خلوص سے میری خدمت کی اور پاکستانی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد میں ان کی رہنمائی کی۔“

کرنل برنی لکھتے ہیں: قائداعظم اور میرے درمیان صرف ایک مسئلے پر اختلاف پیدا ہوا اور عرصے تک جاری رہا۔ ہندوستان اور پاکستان میں جنونیوں کی کمی نہ تھی اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو موقع ملنے پر کسی لیڈر کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ مجھے اس خطرے کا احساس تھا اس لئے میں نے قائداعظم سے اجازت چاہی کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ایک اونچی دیوار اس طرح تعمیر کروائی جائے کہ جس حصے میں قائداعظم کا قیام تھا وہ بالکل الگ اور محفوظ ہو جائے۔ جب یہ تجویز پہلی دفعہ قائداعظم کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا:

"یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو میری حفاظت کا اتنا خیال ہے، لیکن آپ نے اس سے پہلے جو گورنر جنرل دیکھے ہیں میری حیثیت ان سے بہت مختلف ہے۔ میں اسی ملک کا باشندہ اور اسی قوم کا فرد ہوں۔ مجھے اپنے لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔"

میں اس بات سے مطمئن نہ ہوا اور کہا:

"ممکن ہے کہ کوئی متعصب یا جنونی ہندو آپ پر گولی چلا دے۔" مسٹر جناح نے پھر یہی جواب دیا کہ "میں اپنے ملک میں، اپنی ہی قوم کے لوگوں کے درمیان ہوں اور مجھے کسی طرح کا خطرہ نہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ میں بہر حال اس کو فضول خرچی سمجھتا ہوں۔"

اس آخری فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی نجی زندگی کی طرح سرکاری معاملات میں بھی وہ روپیہ خرچ کرنے میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھے۔

کرنل برنی لکھتے ہیں، میری میعاد ملازمت اب ختم ہونے والی تھی۔ مسٹر جناح نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی جگہ کسی موزوں افسر کی تلاش کریں۔"

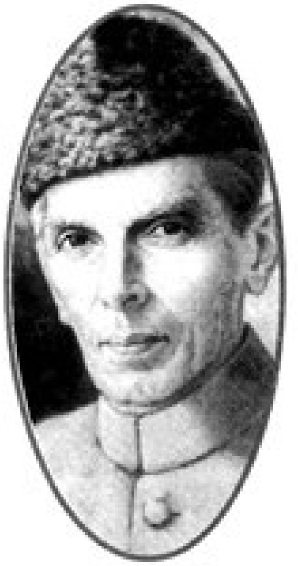

اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں حفاظتی دیوار بنوانے میں کامیاب نہ ہو سکوں گا اور اس ناکامی کا غم دل میں لئے ہوئے اپنی خدمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا لیکن چند ہی دن قبل ایک ایسا حادثہ ہوا کہ قائداعظم کو میری تجویز منظور کرنا پڑی۔

30 جنوری کو دہلی میں مہاتما گاندھی قتل کر دیئے گئے۔ اس روز قائداعظم شہر سے کچھ دور سمندر کے کنارے اپنے ایک بنگلے میں مقیم تھے اور اس سانحے کی خبر انہیں وہیں ملی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ ہاؤس لوٹ آئے اور جب سیڑھیوں پر پہنچے تو مجھ سے کہا: "جو دیوار تم نے تجویز کی تھی اس کی تعمیر شروع کرا دو۔"

23 جولائی 1947ء کو کرنل نے اپنی ڈائری میں لکھا: "پہلی ملاقات ہی سے میں نے مسٹر جناح کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کی۔ انہوں نے انگریز قوم کا ذکر اتنے خلوص کے

ساتھ کیا کہ میں ان کی پیش کش کو رد نہ کر سکا اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ میں ان کی ہر ممکن خدمت کروں گا۔"

پانچ ہفتے بعد، کراچی پہنچ کر، کرنل برنی نے لکھا:

"آج رات کے کھانے پر مسٹر جناح نے اپنی آپ بیتی بڑی تفصیل اور دل سوزی سے ہمیں سنائی۔ ان کی دیانت داری اور خلوص نے گورنمنٹ ہاؤس کے تمام افسروں اور اہلکاروں کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔"

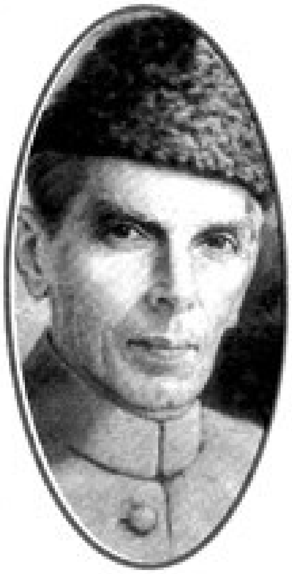

کرنل برنی کی ڈائری تاریخ پاکستان کے شروع کے چند مہینوں پر مشتمل ہے، جو ہر لحاظ سے بہت اہم تھے۔ 29 اگست کو انہوں نے لکھا:

"گزشتہ دو ہفتوں میں سرحد کے دونوں طرف بڑے ہولناک مظالم ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں اکثر لوگ بری طرح دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں ہزاروں پناہ گزیں خیموں میں پڑے ہیں۔ ان کے گھر پھونک دیئے گئے ہیں اور ان کا سارا مال و اسباب ان سے چھن چکا ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے پر مطلق اعتبار نہیں رہا۔

☆......☆......☆

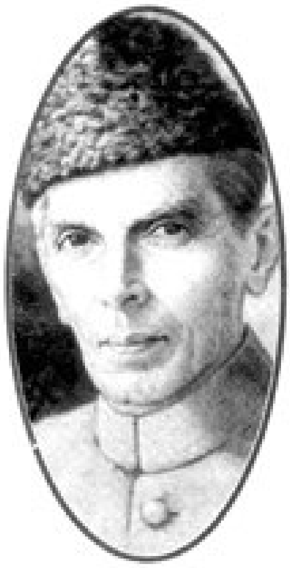

قائداعظم اپنی ہمشیرہ مادرملت محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ۔

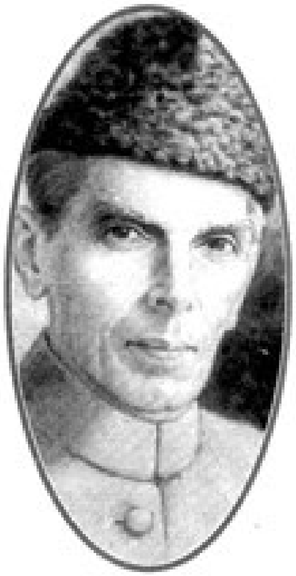

ایک بڑا آدمی

قائداعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری جناب فرخ امین کی یادداشتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قائد عموماً معاملات کا فیصلہ خاصے سوچ بچار کے بعد کرتے، لیکن ہمارے خلوص کی قدردانی کی خاطر کبھی کبھی ہماری بات مان کر اپنے کسی چھوٹے موٹے فیصلے میں تبدیلی بھی فرما لیتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ مئی 1948ء میں وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے افتتاح کے لیے کاکول جانے والے تھے کہ ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ وہ جانے پر مصر تھے، نہ صرف اس لیے کہ وہ وہاں جانے کا فیصلہ فرما چکے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ انہیں اپنے کسی پروگرام میں تبدیلی کرنا بے حد ناگوار ہوتا تھا۔ لیکن ہم سب کا خیال تھا کہ انہیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ہماری بات مان لی اور آخری وقت کاکول جانے کا خیال ترک کر دیا۔

قائداعظم سے میرے تعلقات محض ایسے نہیں تھے جو گورنر جنرل اور اس کے سٹاف کے درمیان ہونے چاہئیں۔ بعض اوقات بے تکلفی کے لمحوں میں قائداعظم شفقت اور کرم

کا مجسمہ ہوتے تھے۔ خصوصاً ایسے لمحوں میں مجھ پر ان کے الطاف بے پایاں ہوتے تھے۔ اکثر مجھے یہ سعادت نصیب ہوتی کہ وہ مجھ سے اپنے خیالات اور رجحانات کے متعلق گفتگو فرمانے لگتے۔

ہم لوگ لاہور میں تھے۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہوگئی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک دن قائداعظم فرمانے لگے کہ مسلمان قوم کی ایک بہت بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کو خود ہم ہی میں سے ایسے غدار مل جاتے ہیں جو آسانی سے ان کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ایک اور موقع پر ایسے مسلمان لوگ گفتگو کا موضوع بن گئے جنھوں نے جنگ کے زمانے میں جنگی ملازمتیں کرلیں اور اپنے انگریز افسروں کو خوش کرنے کی امید میں شراب خوری کے عادی ہوگئے۔ اس سلسلہ میں قائداعظم نے فرمایا:

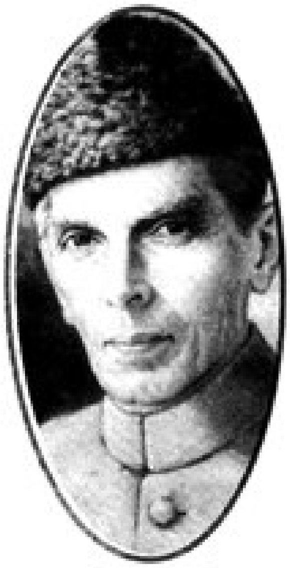

”یہ انسانی کردار کی انتہائی پستی ہے کہ وہ ایسی رکیک حرکتیں کرکے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اسے قابلیت کے ساتھ اور اچھی طرح انجام دیں۔ دیر یا سویر ان کی محنت کا انعام ضرور ملتا ہے، کوئی آقا یا حکومت کسی مستحق ملازم کو ترقی کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتا۔ اگر سرکاری ملازم اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اونچے مرتبے یا ترقی حاصل کرنے کے لیے سفارشوں اور سازشوں سے کام لینا چھوڑ دیں تو اقربا پروری اور دوست نوازی کا خاتمہ ہوجائے اور ہماری سیاسی زندگی کہیں زیادہ صحت مند عناصر سے معمور ہوجائے۔“

ایک دن کا ذکر ہے کہ قائداعظم بے حد مسرور معلوم ہو رہے تھے۔ فرمانے لگے:

”زیارت مجھے بہت پسند ہے، اسے ایک خوبصورت شہر بنایا جاسکتا ہے۔ جس میں ہر جگہ بڑے بڑے آرام دہ ہوٹل، خوبصورت بنگلے، پارک، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ باغیچے ہوں۔“ اس کے بعد مسکرا کر فرمایا:

”تمہیں معلوم ہے میں اسی طرح کے خواب دیکھتا ہوں، لیکن کبھی کبھی میرے یہ

خواب پورے بھی ہو جاتے ہیں۔ پاکستان بھی کبھی اسی طرح کا خواب تھا۔ اسی طرح کا یہ خواب زیارت کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ ایک دن یہ خواب بھی پورا ہو کر رہے۔"

قائداعظم کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ مجھے جتنا عرصہ ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ زمانہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں، لیکن ان بیش بہا لمحوں کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

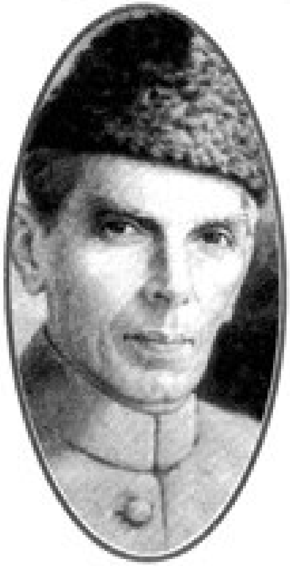

☆......☆......☆

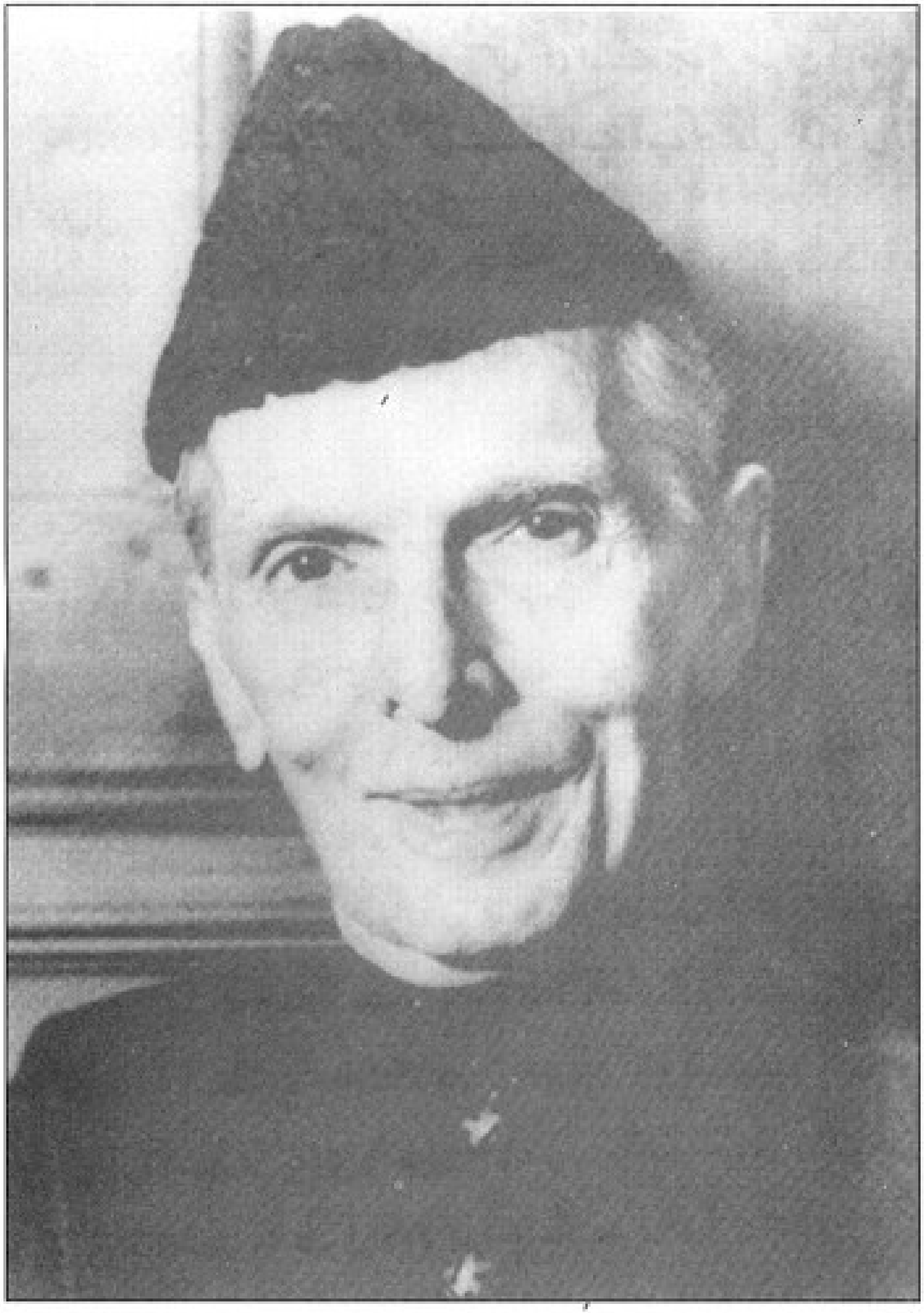

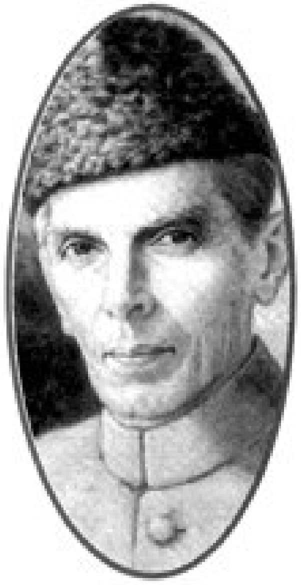

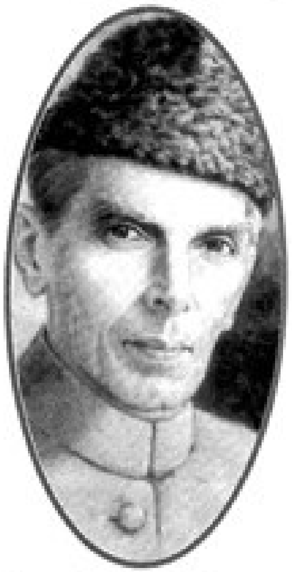

اور عینک گر پڑی

قائداعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین لکھتے ہیں کہ قائداعظم کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت جس سے لوگ ناواقف ہیں وہ ان کی حس مزاح ہے، کبھی کبھی کھانے کی میز پر وہ ہمیں لطیفے اور دلچسپ قصے سناتے، قائداعظم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ مجھے اب تک یاد ہے۔

قائد نے کہا: "انگلستان کے کسی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر گاڑی معمول سے ذرا زیادہ ٹھہر گئی۔ ایک ہندوستانی جج نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اترا اور سیدھا ان جج صاحب کی طرف آکر ان سے پوچھنے لگا: "گاڑی کب چھوٹے گی؟" جج نے جواب دیا: "مجھے کیا معلوم؟" اس پر انگریز نے کہا: "لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے' کیا تم سٹیشن ماسٹر نہیں ہو؟" اس پر جج نے جھنجھلا کر جواب دیا: "نہیں' میں سٹیشن ماسٹر نہیں ہوں۔" انگریز بولا: "اگر نہیں ہو تو ایسے معلوم کیوں ہوتے ہو' اور لباس ویسا کیوں پہن رکھا ہے۔"

قائداعظم کی آخری بیماری کے حالات لوگوں کو عام طور پر معلوم ہیں۔ ہوا یوں کہ

کراچی میں جب قائداعظم نے کسی طرح بھی سرکاری کام کرنا کم نہ کیا' یہاں تک کہ جب ڈاکٹروں کے مشوروں سے وہ تبدیلئ آب و ہوا کے خیال سے دو ایک دن کے لیے ملیر جا کر رہتے تو وہاں بھی کام کرنا یا لوگوں سے ملنا بند نہ کرتے۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے وہ 25 مئی کو کوئٹہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن اسی آرام کے زمانہ میں پاکستان کے سٹیٹ بینک کا افتتاح کرنے کی غرض سے جون کے آخر میں کراچی تشریف لائے اور یہاں کے مختصر قیام میں اتنا کام کیا کہ جب وہ بلوچستان واپس پہنچے تو وہ سارے اچھے اثرات جو ایک مہینے کے آرام سے پیدا ہوئے تھے زائل ہو چکے تھے۔ کام کی زیادتی نے انہیں پھر تھکا دیا تھا۔ وہ بیمار ہو گئے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اس زمانہ میں قائداعظم کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی خاطر خدا جانے کتنے دن رات اپنے اور قائداعظم کے کمرے کے درمیان آتے جاتے گزارے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے قائداعظم سے کہا:

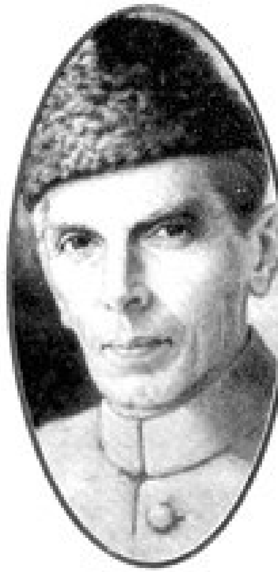

"قائداعظم جو پاکستان آپ نے اتنی طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے' اسے مضبوط بنانے کے لیے ہمیں ابھی دس برس تک آپ کی ضرورت ہے۔" میں نے سنا ہے کہ ابھی ڈاکٹر صاحب اپنا جملہ پورا نہیں کر سکے تھے کہ قائداعظم نے فرمایا:

"میں اپنا کام کر چکا اب مجھے مرنے کا رنج نہیں ہوگا۔ لیکن میں زیارت میں نہیں مرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اُسے اپنے وہی الفاظ فرمائے جو بعد میں یوم استقلال کے پیغام میں دہرائے گئے ہیں: "آپ کے پاس اب سب کچھ ہے۔ ایک آزاد اور خودمختار ملک' جس میں آپ زندگی کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں سوائے کوئلے اور لوہے کے' لیکن یہ چیزیں بھی آپ اپنی فاضل پیداوار کے بدل میں دوسرے ملکوں سے حاصل کر سکتے ہیں اور ممکن ہے پہاڑوں کے نیچے یہ بھی مل جائیں۔ اب یہ کام نئی نسل کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور اسے مضبوط بنائے۔"

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ قائداعظم ایک دن کوئی سرکاری کاغذ ملاحظہ فرما رہے تھے‘ ان کی عینک پھسل کر نیچے گر پڑی۔ انہوں نے اُسے اٹھا کر پھر لگا لیا۔ لیکن وہ پھر پھسل گئی۔ ایک مرتبہ قائداعظم نے میری طرف نظر اٹھائی جیسے وہ متوقع ہوں میں کچھ کہوں‘ میں نے عرض کیا: ”قائداعظم آپ کی عینک ڈھیلی ہو گئی ہے۔“ انہوں نے فرمایا: ”ہاں میرا خیال تھا کہ یہاں آکر میں ذرا توانا ہو جاؤں گا لیکن اس کے برخلاف میں دبلا ہوتا جا رہا ہوں۔“

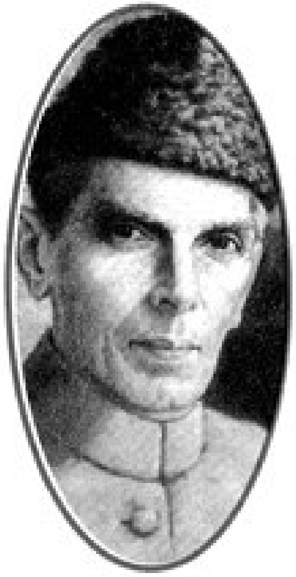

بیماری کے پورے زمانے میں قائداعظم نے اس وقت تک سرکاری کاموں کا سلسلہ جاری رکھا‘ جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی۔ ہم انہیں کاموں کی اطلاع نہ دیتے‘ لیکن اگر انہیں پتہ چل جاتا تو وہ کام کرنے پر مصر ہوتے۔ مجھے آج تک ان کی ایک بات یاد ہے۔ کہنے لگے: ”ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے‘ اتنا ہی زیادہ پاکیزہ‘ خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت میں ابھریں گے۔ جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔“

مجھے آج تک ان کی زندگی کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے‘ جب انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے سر محمد ظفراللہ خان کو پورے اختیارات دینے کے لیے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کئے۔

☆......☆......☆

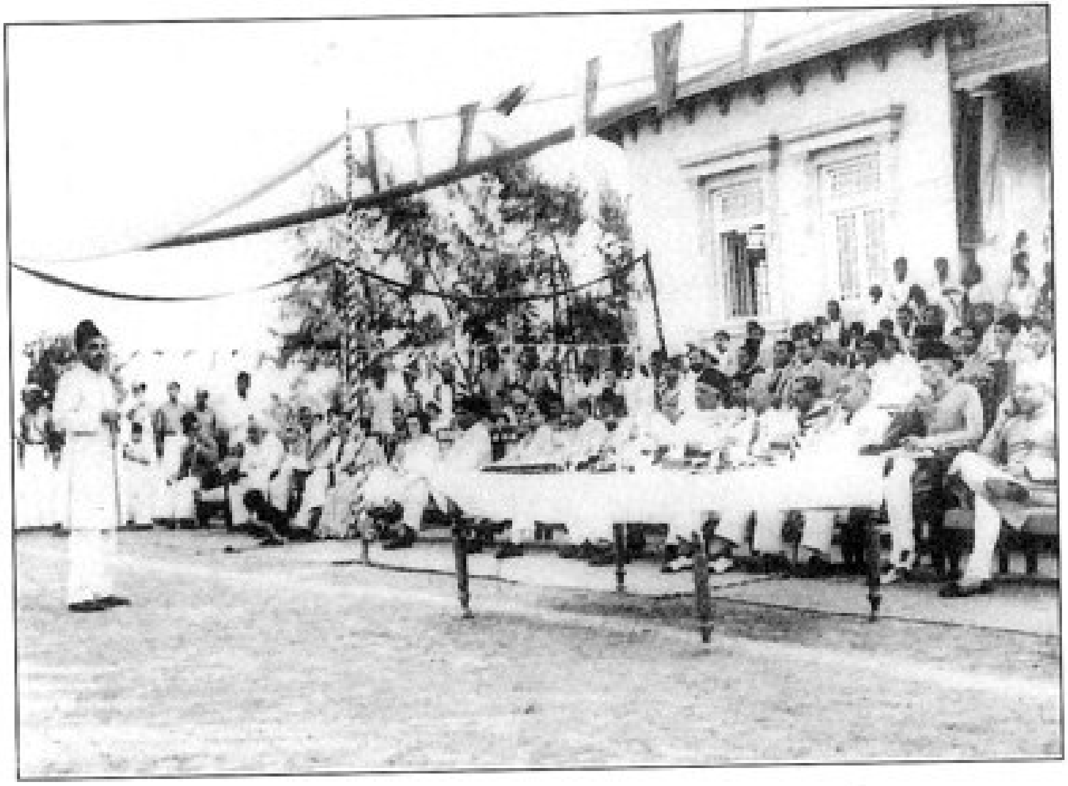

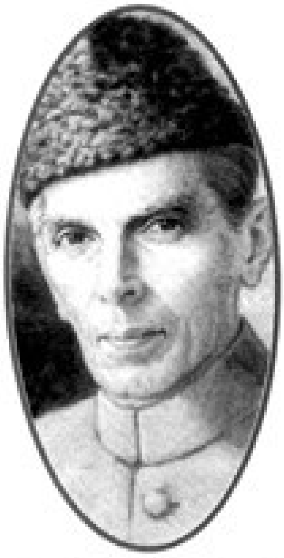

قائداعظم گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں ہونے والی ایک تقریب میں شریک ہیں

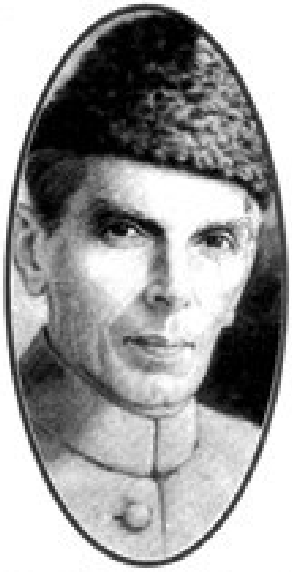

آخری فائل پر دستخط

قائداعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین آخری فائل پر دستخط کا واقعہ کچھ یوں لکھتے ہیں:

"قائداعظم اپنی مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس پر نظر ڈال کر قائداعظم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا: "امین! کچھ نظر نہیں آرہا۔" میں نے یہ سمجھ کر کہ روشنی کی کمی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، بجلی روشن کردی۔ قائداعظم نے پھر نظر ڈالی لیکن پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا سی دیر میں نظر ہٹالی اور میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ کاغذ پڑھنے میں انہیں اب بھی دقت ہو رہی ہے۔ کمرے کے بائیں طرف ایک کھڑکی تھی۔ اس پر ایک موٹا سا پردہ پڑھا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس جاکر میں نے پردہ سرکا دیا کہ باہر سے روشنی آسکے۔

اس مرتبہ بھی قائداعظم کاغذ کی عبارت اچھی طرح نہ پڑھ سکے، میرا دل کہہ رہا تھا کہ یااللہ یہ کیا ہوا۔ اتنے میں قائد نے مجھے دیکھا اور فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل

کی۔ میں نے ان کی پسلیوں کے پیچھے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے سہارا دیا اور پیچھے کی طرف دو تکیے رکھ کر انہیں بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن قائداعظم کے لیے یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ وہ اس طرح بیٹھ کر کاغذ پر دستخط کر سکیں۔ اس صورتحال سے انہیں بڑی الجھن ہوئی۔ وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے سہارا دو تاکہ میں پوری طرح بیٹھ سکوں۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے سے ان کے جسم کو اور سیدھا کیا' میں ان کے سامنے کی طرف کھڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ ان کی دونوں پسلیوں کے نیچے تھے۔ اس طرح اگر وہ کاغذ پر دستخط بھی کرنا چاہتے تو میرے دونوں ہاتھ ان کے لیے رکاوٹ پیدا کرتے۔ اس لیے میں نے ان کے جسم کو ایک ہاتھ سے روکا اور پیچھے کی طرف جا کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے سنبھال لیا۔

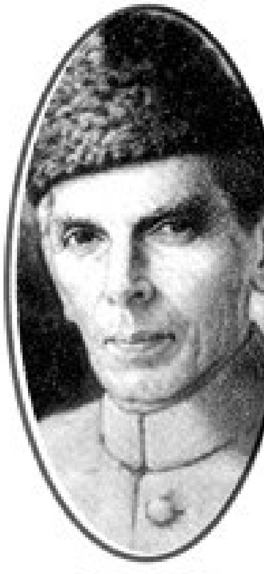

اس وقت میرے دل کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے میں نے شیشے کی بہت نازک سی چیز پکڑ رکھی ہے اور میری ذرا سی کوتاہی سے بھی اس نازک شیشے میں بال پڑ جائے گا۔ قائداعظم نے فرمایا: "کانپ کیوں رہے ہو مضبوطی سے پکڑو۔" یہ لفظ تحکمانہ انداز میں فرمائے گئے تھے۔ لیکن آواز میں کسی قدر ضعف تھا۔ اس طرح قائداعظم نے بڑی مشکل سے اس کاغذ پر دستخط کیے۔ اس دستخط کا نقش اب بھی میرے سامنے ہے۔ ان میں قائداعظم کے پچھلے دستخطوں کی سی استواری نہ تھی۔ اس وقت میرا دل رو رہا تھا۔ یہ نحیف جسم اور ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ' جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھا تھا اس شخص کا تھا' جس نے برسوں ہندوستانی اور انگریزی سیاستدانوں کا مقابلہ کیا اور جس نے منتشر مسلمانوں کو ایک منظم اور طاقتور بنایا' میں رو پڑا کہ آج اس کی یہ حالت ہے۔

جب وہ کاغذ پر دستخط کر چکے تو قطعی تھک چکے تھے۔ انہوں نے بڑے دردناک انداز میں فرمایا: "امین! میں بھی ہانپ رہا ہوں اور تم بھی ہانپ رہے ہو۔" میرا سانس بے شک تیز تھا لیکن اس لیے نہیں کہ قائداعظم کو سہارا دینے سے تھک گیا تھا۔ میں اس لیے ہانپ رہا تھا کہ

اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اور میرے جسم سے ملحق پاکستان کی سب سے محبوب شخصیت تھی۔ وہ شخصیت جس کے ایک اشارے پر لاکھوں آدمی اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جائیں' اور اس وقت ان کی یہ حالت تھی کہ وہ بیماری کے ہاتھوں بے بس تھے۔ اس ساری صورتحال نے میرے ذہن میں جو اضطراب پیدا کیا تھا' وہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے قائداعظم کو بستر پر لٹاتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

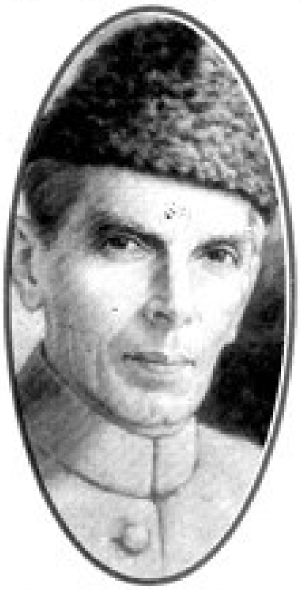

اس کے بعد سے میری کوشش یہ ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو میں قائداعظم کی خدمت میں نہ جاؤں۔ اس لیے کہ وہ جونہی مجھے دیکھتے تو انہیں کوئی نہ کوئی سرکاری کام یاد آجاتا اور اس کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے۔ 10 ستمبر کو کوئٹہ میں انہوں نے مجھے طلب فرمایا اور پوچھا: "کیا سب کچھ تیار ہے' میں آج ہی کراچی جانا چاہتا ہوں۔ "کراچی پہنچ کر قائداعظم کو ملیر کے جس مکان میں ٹھہرنا تھا وہاں کے سارے انتظام مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ہم 15 سے پہلے وہاں نہیں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں قائداعظم۔ "لیکن اس بات نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کی حالت اس قدر نازک ہے' پھر بھی ان کے دل سے مملکت کے کاموں کا خیال نہیں جاتا۔ اگلے دن ہم کوئٹہ سے چل دیے۔

کراچی پہنچنے کے کچھ دیر بعد ان کی حالت خراب ہو گئی۔ میں آخر وقت تک ان کے پاس ہی تھا۔ رات کو 10 بجکر 10 منٹ پر ڈاکٹر نے ان سے کہا: "قائداعظم آپ زندہ رہیں گے۔" قائداعظم بولے: "نہیں' اب نہیں۔" اور اس کے 15 منٹ بعد وہ نہیں رہے۔

ملت کا بانی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہم سے رخصت ہو کر وہ فنا نہ ہونے والوں میں جا ملا۔ قائداعظم کے آخری لمحات بے حد پر سکون تھے۔ موت کی آغوش میں ہمیشہ کی طرح خاموش اور پر عظمت نظر آ رہے تھے۔

☆......☆......☆

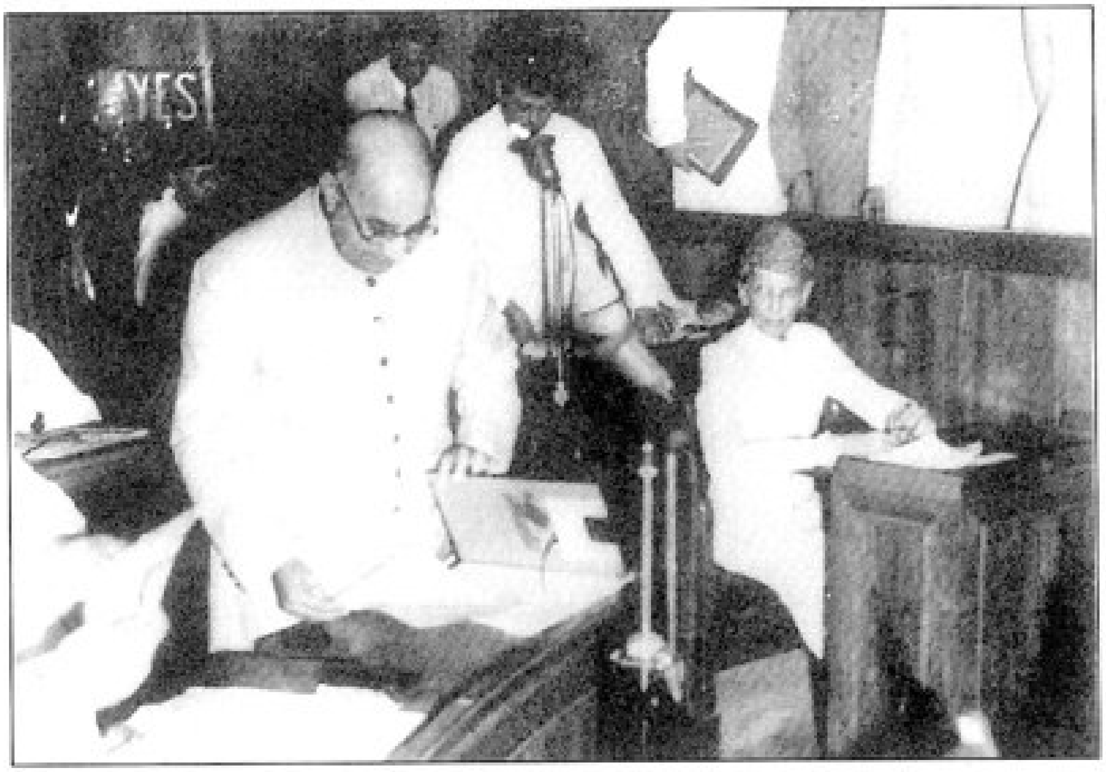

قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خاں 1947ء میں دستور ساز اسمبلی میں۔

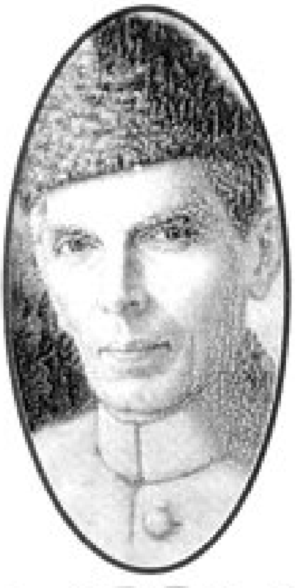

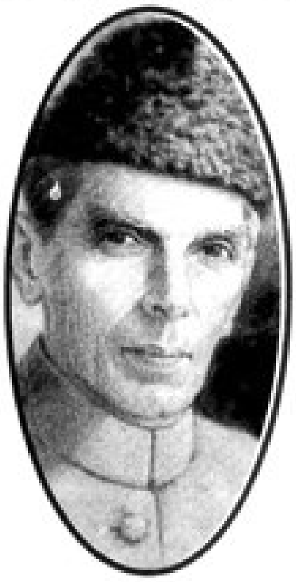

قائدملت کا خراج تحسین

قائداعظم کی وفات پر ان کے سب سے عزیز ساتھی اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں نے ریڈیو پاکستان سے 12 ستمبر 1948ء کو ساڑھے آٹھ بجے رات ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس تقریر کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ قائدملت نے قائداعظم کے بارے میں کہا:

"ہماری ملت کے رہبر، ہماری مملکت کے سردار اور پاکستان کے معمار آج ہم سے علیحدہ ہوگئے ہیں۔ ہمارے محترم اور محبوب قائداعظم ملت اسلامیہ کو داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدائے تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ اس وقت جبکہ پاکستان بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو قائداعظم کی رہبری اور دانش کی ضرورت تھی وہ ہم سے علیحدہ ہو جائیں۔

قدرتی بات ہے کہ یہ صدمہ ہم پر انتہائی غم طاری کر دے لیکن رنج والم کی گھڑی میں ہر پاکستانی سے اپیل ہے کہ وہ اس دلی درد سے متاثر ہو کر اپنے اوپر مایوسی کو مسلط نہ ہونے دے بلکہ اپنے دل کو مضبوط اور اپنے ارادے کو مستحکم کر کے اپنی زندگی کو پاکستان کی خدمت کے لیے

وقف کردے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ تاریخ قائداعظم کا شمار دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں کرے گی۔ دنیا میں کم آدمیوں کو یہ اعزاز نصیب ہوا ہے کہ وہ ایک عظیم الشان کام کو ہاتھ میں لیں اور اپنی ہمت، عزم اور دانش سے اس کو اپنی زندگی ہی میں پروان چڑھتے دیکھیں۔ قائداعظم نے نہ صرف پاکستان کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے پیش کیا بلکہ اس کے لیے جدوجہد کر کے دنیا میں سب سے بڑی اسلامی ریاست قائم کر دی۔

قائداعظم ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنی تمام زندگی میں انہیں ملت اسلامیہ کی بہبود ی منظور تھی اور وہ اسی کیلئے کوشاں رہے۔

قائداعظم کی رہنمائی سے پہلے بھی مسلمان اپنی خامیوں سے خوب واقف تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس انحطاط کو وہ پہنچ چکے ہیں اس سے نکل کر ترقی کی منزل پر گامزن ہوں، لیکن وہ واضح طور پر نہیں جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے جتنی جدوجہد کی اور جو جو قربانیاں دیں وہ بااثر تو ثابت ہوئیں لیکن اس حد تک نہیں کہ اپنے مقصد کو پالیں۔

قائداعظم نے اپنی جہاں بین اور دوررس نظروں سے دیکھ لیا کہ جب تک قوم کے سامنے منزل مقصود واضح طور پر نہ رکھی جائے گی اور جب تک انہیں ایک مرکز پر اور ایک ہی پرچم کے نیچے جمع نہ کیا جائے کسی چیز کے حصول کی امید بیکار ہے۔

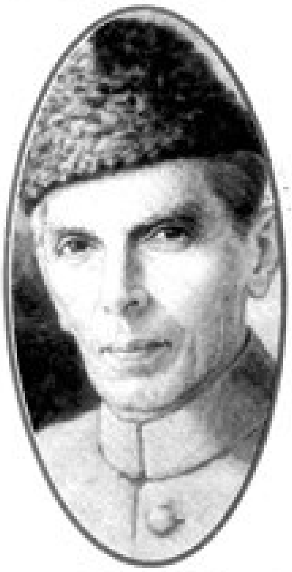

قائداعظم اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لیے کئی خداداد قوتیں رکھتے تھے۔ اول تو ان میں ایک ایسا تخیل اور سیاست پر ایک ایسا عبور تھا جو باریک بین ہونے کے باوجود گزشتہ اور آئندہ پر ایک ہی جست میں حاوی ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد انہیں اچھی طرح سے معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری منزل مقصود کون سی ہے اور ہمارا نصب العین کیا ہے۔

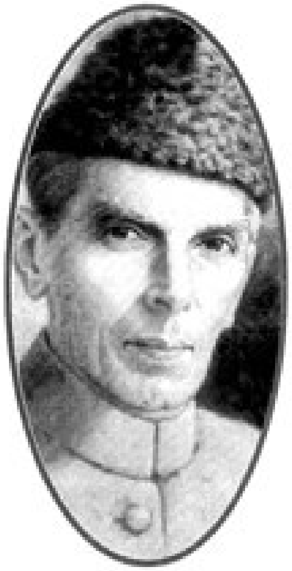

اس کے ساتھ ہی ان کو خدا نے ایک ایسا آہنی عزم عطا کیا تھا جو کسی مشکل اور رکاوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں اور قوم کو آگے لیے چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے ارادے پر ایسی مستقل مزاجی سے قائم رہتے تھے جو ہر مسلمان کے دل میں جوش اور نصرت کے جذبات کو ابھارتا تھا۔ ان کی قیادت میں ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر ہماری ملت قابو نہ پا سکے گی۔

اس فہم اور سیاست‘ اس عزم وارادے کے ساتھ قائداعظم میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ دن رات کام کر سکتے تھے اور کوئی فروعی چیز ان کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتی تھی۔ قائداعظم جس اولوالعزمی سے آخر دم تک دن رات ملت کے لیے کام کرتے رہے‘ وہ ملت اسلامیہ کے لیے ہمیشہ ایک مثال کا کام دے گی اور ہر فرد کے لیے مشعل ہدایت بنے گی۔

☆......☆......☆

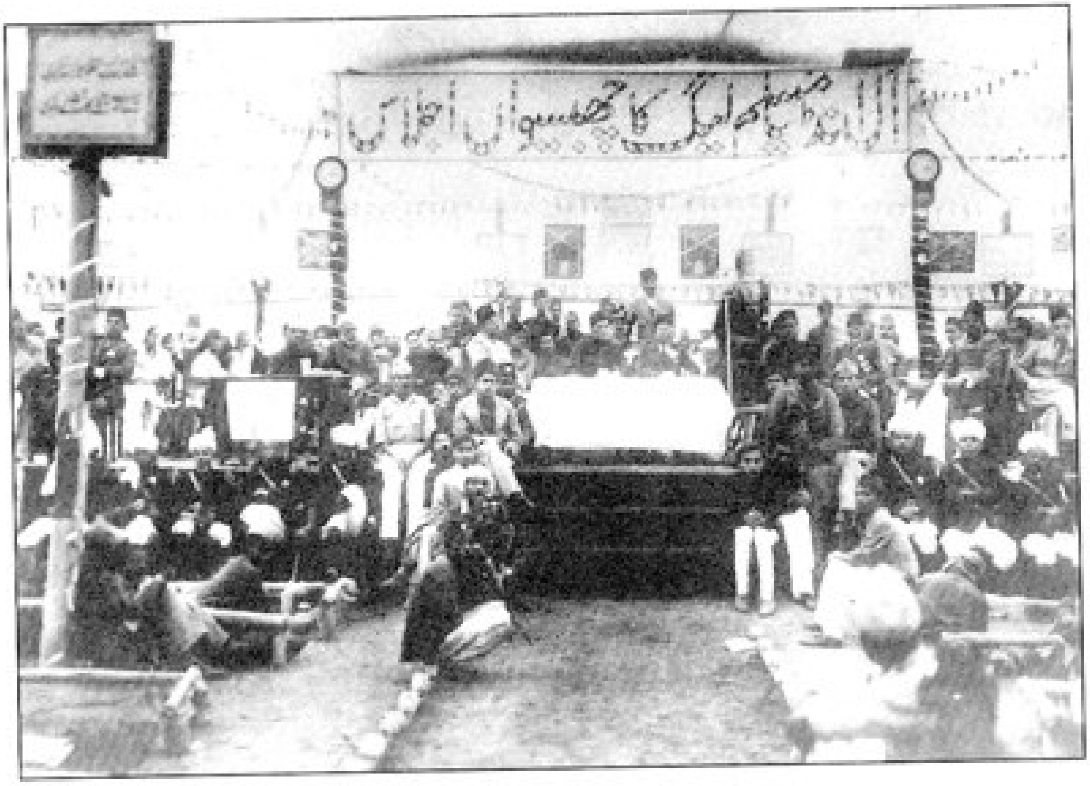

آل انڈیا مسلم لیگ کے 26ویں سالانہ اجلاس پٹنہ کا ایک منظر۔
قائداعظم اور لیاقت علی خاں سٹیج پر بیٹھے ہیں۔

قائد کا خواب

قائداعظم کی وفات پر ان کے معتمد ساتھی اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی نشری تقریر میں کہا تھا:

"قائداعظم کی ذات کے یہی کمالات تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہر مرد' عورت اور بچے کے دل میں پاکستان کے حصول کیلئے ایک گہرا جوش پیدا کر دیا۔ اسی جوش سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے ایسی قربانیاں کیں' جن کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے اور پاکستان کو حاصل کیا۔

اب جبکہ قائداعظم ہم میں نہیں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی راستے پر چلیں جو قائد دل میں رکھتے تھے تاکہ ایک دن اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکیں۔ جو لوگ ہمت اور اولوالعزمی سے کام لیتے ہیں' خدا کی مدد ہمیشہ ان کے شامل حال رہتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جس عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائداعظم نے اخوت' برابری اور آزادی کے اسلامی اصولوں پر رکھی ہے' اس کو ہم آسمان تک لے جائیں۔

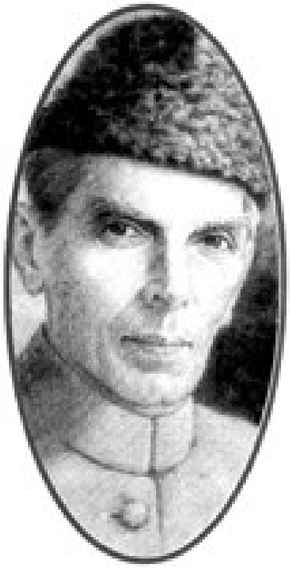

یاد رکھیں نہ صرف پاکستان قائم کرنے میں ہمیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس کے قیام کے بعد بھی ایک کے بعد دوسری مصیبت کا زیر بار ہونا پڑا۔

آج نہ صرف پاکستان ہی کے مسلمانوں کو مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے بلکہ تمام عالم کے مسلمان مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہمیں قائداعظم کی رہبری کی بہت ضرورت تھی۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ان کی فراست' ان کا تجربہ اور ان کا عزم قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہوتا۔

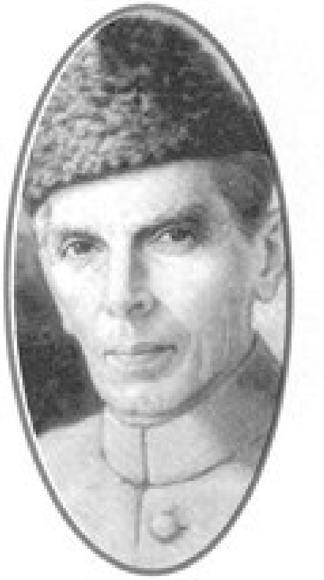

لیکن اس صدمے سے ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں وہی کرنا چاہئے جو قائداعظم کرنا چاہتے تھے یعنی پاکستان کی حفاظت اور ترقی کیلئے دن رات کی کوشش اور محنت۔ آج ہم پر فرض ہے کہ اپنے تمام تفرقے مٹا کر ایک ہو جائیں اور اپنی جانیں پاکستان کیلئے وقف کردیں۔

پچھلے بارہ سال سے جبکہ مسلم لیگ کا نیا دور شروع ہوا' مجھے قائداعظم کا رفیق کار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہمیں نشیب و فراز سے گزرنا پڑا اور کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس رفاقت کے عرصے میں جو التفات وہ مجھ سے برتتے تھے اور جس اعتماد کا ہمیشہ اظہار کرتے تھے' اس کی یاد میری زندگی کا بہترین خزانہ ہے۔ قائداعظم کی وفات سے میں اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی کا احساس کرتا ہوں لیکن اس فانی دنیا میں بقا صرف اللہ ہی کو ہے اور ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ تمام فروعی اور غیر ضروری چیزیں جو اس کو سیدھے راستے سے بھٹکا سکتی ہیں یا جو اس کی توجہ اور انہماک کو ہٹا سکتی ہیں' نظر انداز کردے' تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارے بدخواہ یہ کہہ سکیں کہ ہم اس قابل نہ تھے کہ قائداعظم ہمارے لئے اتنی قربانیاں کرتے۔

اپنے محبوب اور محترم قائداعظم کیلئے اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کا اس سے بہتر

کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اس نصب العین کو ایک لمحہ کیلئے بھی نظرانداز نہ کریں' جو قائداعظم نے ہمارے سامنے رکھا ہے اور پاکستان کو ایسی شاندار مملکت بنادیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔

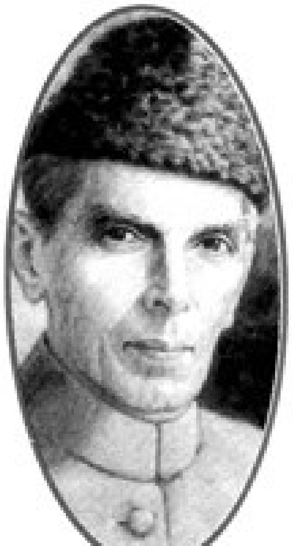

قائداعظم کی شخصیت کی راہنمائی میں قومی استقلال کے زیر اثر جو تعمیری کام حکومت پاکستان یا پاکستان کے افراد کریں گے وہ قوم کی طرف سے ہمارے محبوب رہنما کی یادگار ہو گا۔

ہم میں سے ہر ایک کو یہ جان لینا چاہئے کہ آج ہماری ملت پر امتحان کا وقت ہے اور یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ یہ امتحان نہایت کڑا ہے۔ اس امتحان میں ہم اسی حالت میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک جان و مال سے دریغ نہ کرتے ہوئے پاکستان کے تحفظ کیلئے اپنی انتہائی کوشش کرے۔ ہم اس امتحان میں ناکام نہیں رہ سکتے کیونکہ اس کے نتائج بہت ہولناک ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہماری کامیابی تمام اسلامی دنیا کیلئے بھی اشد ضروری ہے۔ اپنی غم زدہ ملت کے نام میرا یہی پیغام ہے اور میں سب سے پھر یہی درخواست کرتا ہوں کہ وہ مایوسی کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دیں اور اپنی کوشش کو دوگنا کر کے ایک عظیم الشان اور شاندار پاکستان کے اس خواب کو جو قائداعظم نے دیکھا ہے حقیقت میں بدل دیں۔

پاکستان زندہ باد۔"

یہ تھی جناب لیاقت علی خان کی قائداعظم کی وفات پر نشری تقریر۔

☆......☆......☆

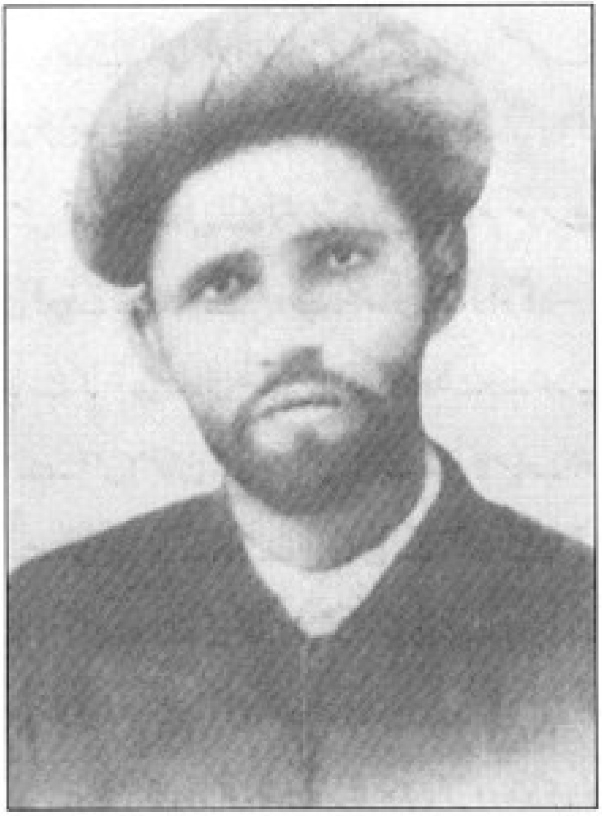

قائداعظم کے والدگرامی جناح پونجا۔

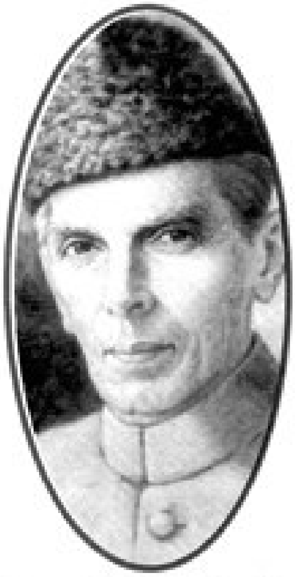

قائداعظم کے بھائی احمدعلی
اپنی بیگم ایمی کے ساتھ۔

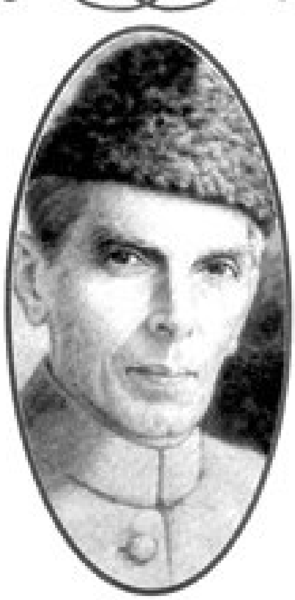

قائد کی زندگی کا مختصر نقشہ

جناب رضوان احمد کی کتاب "میرے قائداعظم" میں بانیٔ پاکستان کی زندگی کا سن وار ایک نقشہ دیا گیا ہے جو اتنا دلچسپ ہے کہ قائد کی زندگی کو جاننے کیلئے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آیئے اس نقشے کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔

1876ء: سال پیدائش، مقام کراچی، پیر کا دن، صبح کا وقت، ماہ دسمبر 25 تاریخ۔

1883ء: گجراتی کے پہلے درجے میں داخل ہوئے اور 1887ء کے اوائل میں چوتھا درجہ پاس کیا۔

1887ء: سندھ مدرستہ الاسلام میں، انگریزی کے پہلے سٹینڈرڈ میں داخل ہوئے۔ یہ 4 جولائی تھی۔ پھر بمبئی چلے گئے۔ انجمن اسلام ہائی سکول میں داخل ہوئے مگر جلد ہی کراچی واپس آگئے اور سندھ مدرستہ الاسلام میں 23 دسمبر کو دوبارہ داخلہ لیا۔

پانچویں سٹینڈرڈ میں تھے کہ 30 جنوری کو مدرسہ چھوڑا۔ شادی کیلئے گئے، شادی کے بعد کاٹھیاواڑ سے پلٹے تو چرچ مشن سکول کے چھٹے سٹینڈرڈ میں داخل ہوئے۔ یہ 8 مئی تھی۔

1893ء: جنوری میں بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہوئے تاکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

"لنکنز ان" میں داخلے کے معیار کی شرط پوری کرنے کیلئے "پیریلی منری اگزامینیشن" دیا، جو داخلے کا معیار مہیا کرتا تھا۔ مئی میں امتحان دیا اور آسانی سے پاس ہو گئے۔ بعدازاں انہیں لندن کے "لنکنز ان" میں داخلہ مل گیا۔ 5 جون کو ان کا نام رجسٹر پر لکھا گیا۔ لنکنز ان میں (جو چار "انوں" میں سے ایک تھا) داخلہ لینے کا سبب انہوں نے سیرت نبویؐ کے اس جلسے میں جو جنوری 48ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقد ہوا تھا خود یہ بتایا ہے کہ اس کے "فریسکو" میں دنیا میں بڑے بڑے مقننین اور قانون سازوں کے نام درج تھے اور ہمارے پیارے نبی رسول اللہ ﷺ کا نام نامی سرفہرست مرقوم تھا۔

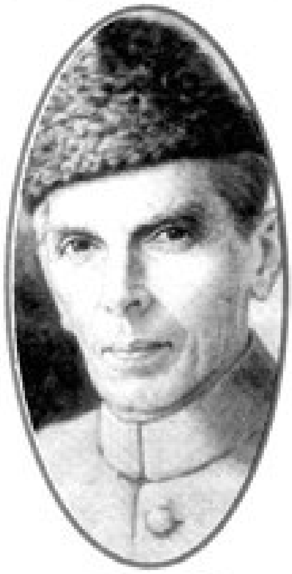

1894ء: ان کی والدہ نے انتقال کیا تو وہ لندن میں تھے۔ قائد کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ انہیں شدید صدمہ ہوا۔

1895ء: انہوں نے 35 رسل روڈ پر اقامت اختیار کی۔ اب اس علاقے کی کاؤنٹی کونسل نے اس گھر کی دیوار پر جہاں قائد کی اقامت تھی ایک یادگاری تختی نصب کروادی ہے۔ اسی سال جناح پونجا، جو نوجوان جناح کے والد تھے کراچی سے اپنے بچوں کے ساتھ مستقل طور پر بمبئ منتقل ہو گئے۔

1896ء: لنکنز ان کی کونسل میں درخواست دی کہ میرے نام میں جو "بھائی" کا لفظ ہے اس کو حذف کر دیا جائے۔ 24 اپریل کو کونسل نے اس لفظ کو حذف کر دینے کی منظوری دیدی اور مجلس وکلاء میں 29 اپریل کو بحیثیت بیرسٹر "مسٹر ایم اے جناح" کے نام سے آواز دی گئی۔ انگلستان سے وہ غالباً جولائی کے مہینے میں بمبئ روانہ ہوئے تھے کیونکہ 24 اگست کو ان کا نام بمبئ ہائیکورٹ میں بحیثیت ایڈووکیٹ درج رجسٹر ہوا۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنی رقوم لندن

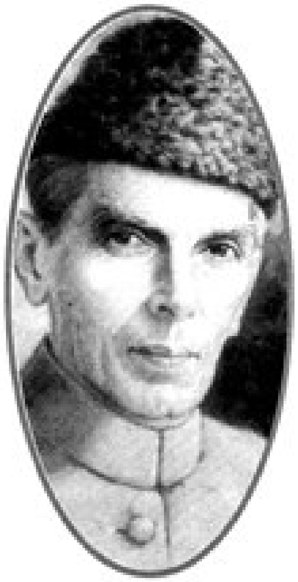

سے بمبئی ارسال کردی تھیں۔ بمبئی میں اپولو ہوٹل کے کمرہ نمبر 110 میں اقامت اختیار کی اور قانونی پیشے کا آغاز کیا۔ اپنی پریکٹس کو قائم و مستحکم کرنے کیلئے زبردست جدوجہد' صبر و تحمل اور مستقل مزاجی اختیار کی۔ ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر اسی سال کے آخر میں "اپولو بندر" کے علاقے میں ایک کمرہ لے کر منتقل ہوگئے۔

1900ء: ہمارے قائد بمبئی کے ریذیڈنسی مجسٹریٹ تین مہینے تک رہے۔ 3 مئی کو جب تین ماہ کی میعاد ختم ہوئی تو مزید تین ماہ کی توسیع ہوگئی تھی مگر انہوں نے یہ عہدہ 2 نومبر کو چھوڑ دیا حالانکہ بمبئی کے لاء ڈیپارٹمنٹ نے مستقل ملازمت کی پیشکش کی تھی۔ 25 دسمبر کو قائد نے اپنی چوبیسویں سالگرہ منائی اور پھر اپنی قانونی زندگی کا آغاز کیا۔

1902ء: ان کے والد جناح پونجا نے 17 اپریل کو انتقال کیا۔ مس فاطمہ جناح اور کم عمر احمد علی جناح کی ذمہ داریاں قائد کے سر پر آگئیں۔ انہوں نے اپنی سب سے چھوٹی بہن فاطمہ کو باندرہ کونونٹ کے بورڈنگ سکول میں داخل کیا اور چھوٹے بھائی کو انجمن اسلام سکول میں بھیج دیا۔

1903ء: قائد نے بمبئی کے بینڈ سٹینڈ میں ایک بڑا گھر لے کر رہنا شروع کیا۔

1905ء: اسی سال کے آخر میں کولابہ کے علاقے میں منتقل ہوئے' یہ علاقہ نسبتاً بہتر تھا لیکن تلاش میں رہے کہ بمبئی کے کسی بہترین علاقے میں کوئی گھر مل جائے۔

☆......☆......☆

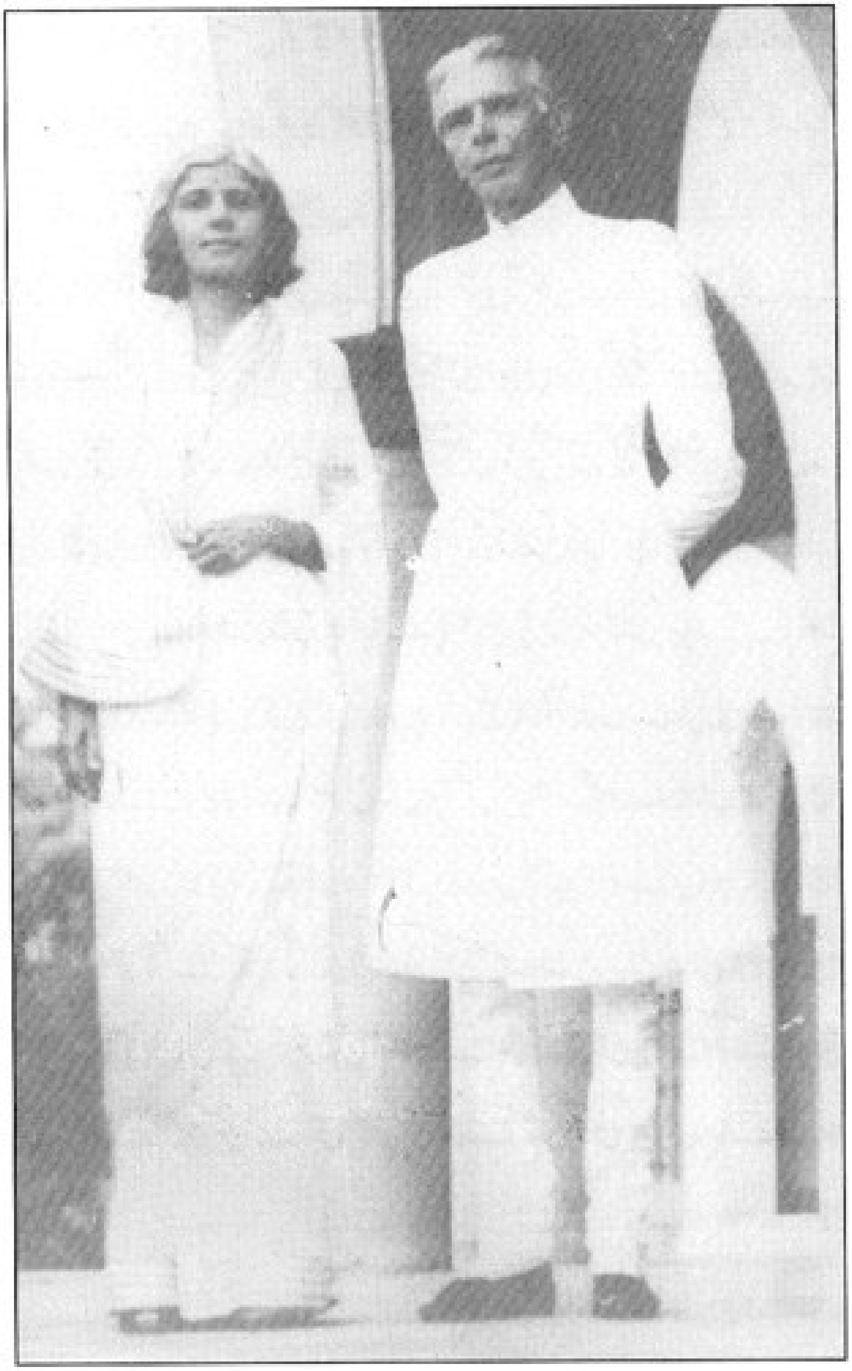

قائداعظم اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح کے ساتھ۔

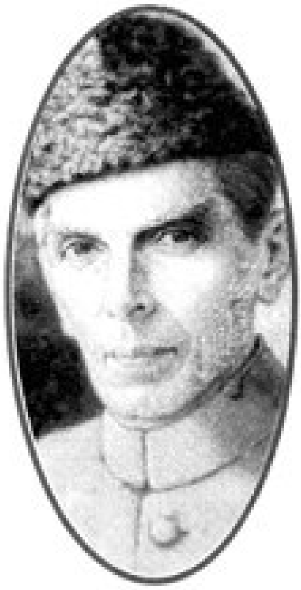

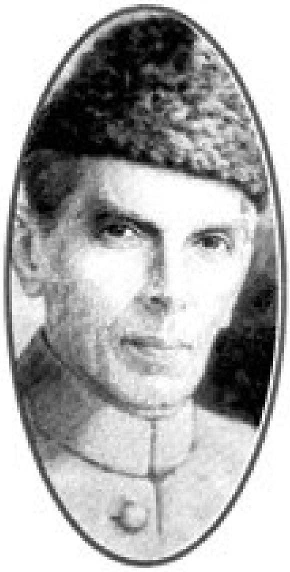

عوامی زندگی کا آغاز

ذکر ہو رہا تھا قائد کی زندگی کے سن وار نقشہ کا۔ اب آتا ہے سن 1906ء: اس سال۔ قائد نے مالابار ہلز میں ایک بنگلہ کرائے پر لیا' جو بمبئی کا بہترین علاقہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اسی علاقے میں ایک بنگلہ خرید لیا۔ اپنی عوامی زندگی کا آغاز ''مسلمان وقف علی الاولاد'' پر کانگریس کے اجلاس کلکتہ 26 دسمبر میں اپنی اولین تقریر سے کیا۔ اسی اجلاس میں انہوں نے ''سیلف گورنمنٹ اور ''تعلیم'' کے عنوانات پر بھی تقریریں کیں۔

1907ء: کانگریس کے ڈیلی گیٹس دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہ الہ آباد کے اجلاس 26 دسمبر کا واقعہ ہے۔ ایک گروہ انتہا پسندوں کا تھا' دوسرا اعتدال پسندوں کا۔ نوجوان جناح نے دوسرے گروہ کا ساتھ دیا۔

1909ء: قائد بمبئی کے مسلم حلقے سے منتخب ہو کر امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پہنچے۔

1910ء: امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے 25 جنوری کو حلف اٹھایا اور ''آنریبل'' کا سابقہ ان کے نام کے ساتھ لگا جو مدتوں ان کے نام کا جزو بنا رہا۔ جنوبی

افریقہ کے ہندوستانی مزدوروں کے مسئلے پر وائسرائے لارڈ منٹو سے 25 فروری کو بحث کی۔

26 دسمبر کو کانگریس کے اجلاس الٰہ آباد میں مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخاب پر تقریر کی۔

1911ء: ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں کی کانفرنس میں شرکت کی جو الٰہ آباد میں یکم جنوری کو اس لیے ہوئی تھی کہ مجلس قانون ساز اور ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے مسائل پر بحث و تمحیص کی جائے اور ہندو مسلم پیچیدگی کو بھی حل کیا جائے۔ انہوں نے 17 مارچ کو "مسلمان وقف ویلیڈیٹنگ بل" پیش کیا اور اس پر تقریر کی۔

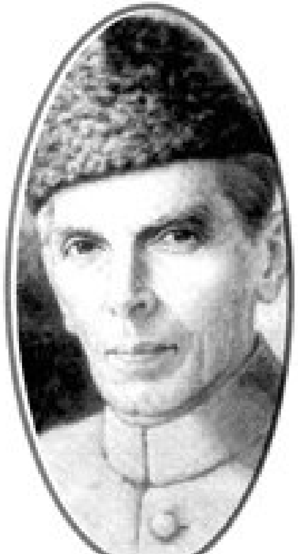

1912ء: 12 اپریل کو "ایلیمنٹری ایجوکیشن بل" پر امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کی۔ ان میں ترمیمیں پیش کیں اور مسلمانوں کے مفاد کی تجویزوں کے اندراج کی ترجمانی کی اور اعلان کیا کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو اس بل کی مخالفت کی جائے گی۔ 26 دسمبر کو بانکی پور پٹنہ کے اجلاس کانگریس میں شرکت کی۔ 28 دسمبر کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں نواب وقار الملک کی دعوت پر شرکت کی۔ 31 دسمبر کو بانکی پور کے اجلاس برائے مسلم لیگ کونسل میں خصوصی دعوت پر شریک ہوئے اور "انڈیا کیلئے موزوں سیلف گورنمنٹ" کی تجویز پہلی مرتبہ برعظیم کی سیاسیات میں پیش کی اور وہ بھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے، جس کے وہ باقاعدہ ممبر بھی اس وقت نہ تھے۔

1913ء: "مسلمان وقف ویلیڈیٹنگ بل" کے بارے میں سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کی۔ اس بل کی منظوری وائسرائے نے 7 مارچ کو دی اور یہ قانون بن گیا جو مسلمانانِ برعظیم کے حق میں عظیم الشان اہمیت کا حامل تھا۔ 22، 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں خصوصی دعوت پر شرکت کی اور اسی اجلاس میں "سیلف گورنمنٹ سوٹ ایبل ٹو انڈیا" کیلئے مسلم لیگ کا جدید نعرہ اور مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ پھر لندن روانہ ہوئے اور 25 جون کو لندن انڈین ایسوسی ایشن کے قیام پر تقریر کی۔ مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن مسجد کانپور کے سلسلے میں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے قائد کو آل انڈیا مسلم لیگ کا رکن بنایا۔ یہ 10

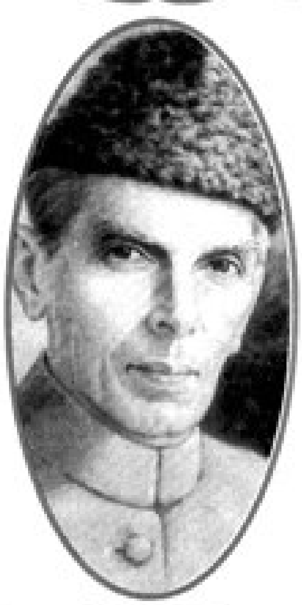

اکتوبر کا واقعہ ہے۔ لندن سے واپسی پر قائد نے انجمن ضیاء الاسلام بمبئی کے جلسے کی صدارت 20 دسمبر کو کی اور 27 دسمبر کو کانگریس کے اجلاس کراچی میں شریک ہوئے۔ کراچی سے وہ سیدھے آگرہ گئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ اب وہ اس کے باقاعدہ ممبر تھے۔

1914ء: مئی میں انگلستان جانے والے وفد میں شریک ہوئے اور 3 جون کو لندن ٹائمز میں ان کا یہ بیان شائع ہوا کہ "انڈیا غالباً برٹش امپائر کا واحد رکن ہے جو کوئی حقیقی نمائندگی نہیں رکھتا اور دنیا کا واحد مہذب ملک ہے جہاں نمائندہ حکومت کا کوئی حقیقی نظام نہیں۔"

1915ء: بمبئی کی مسلم سٹوڈنٹس یونین میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے 3 فروری کو تقریر کی۔ انہی کی کوششوں سے آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ اجلاس ایک ہی وقت میں بمبئی میں منعقد ہوئے۔ قائد کی مستحکم رائے تھی کہ سیلف گورنمنٹ کے حصول کیلئے ہندو مسلم پیکٹ لازمی شرط ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کی بناء پر ان کو "ہندو مسلم اتحاد" کے سفیر کا خطاب دیا گیا۔

1916ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی دسمبر 30 اور 31 کو صدارت کی۔ مجلس استقبالیہ کے چیئرمین نے ان کو شاندار خراج تحسین یہ کہہ کر پیش کیا کہ "اگرچہ یہ عمر کے لحاظ سے جوان ہیں، لیکن انہوں نے ملک کی عوامی زندگی میں اپنا امتیاز قائم کر لیا ہے۔" اسی سال قائد امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے دوبارہ رکن منتخب ہوئے۔ 21 اکتوبر کو بمبئی کی پراونشل کانفرنس منعقدہ احمد آباد کی صدارت کی اور مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخاب کی وکالت کی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہندو مسلم مفاہمت اور سمجھوتے کی صورت میں مشہور میثاق لکھنؤ ان کی کوششوں سے وجود میں آیا اور اس پر دستخط ثبت ہوئے۔ ہمارے قائد اس معاہدے کے ہیرو اور چیمپئن تھے۔ لہٰذا سفیر اتحاد کہلائے۔ بعد میں وہ ہندو اکثریت کی مسلمان دشمن پالیسیوں سے بدظن ہو کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔

☆......☆......☆

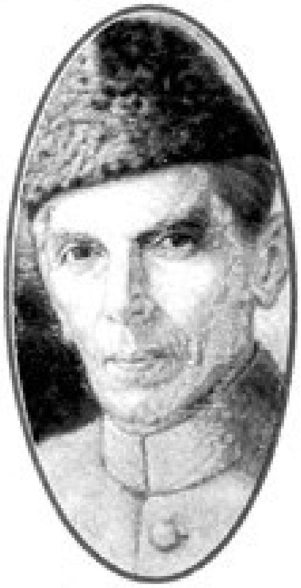

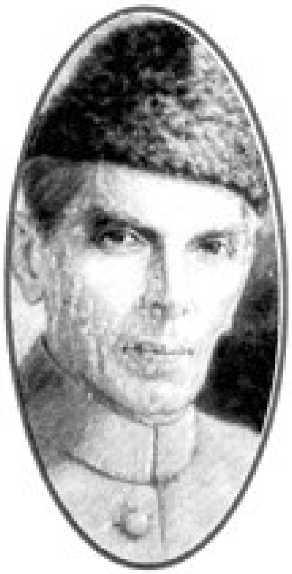

کچھ اور واقعات

قائد کی زندگی کا سن وار جائزہ جاری ہے۔

سال ہے 1917ء: اس سال موسم گرما کا کچھ وقت قائد نے دارجلنگ کی پہاڑی پر گزارا۔ اکتوبر کے مہینے میں ہوم رول لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں تقریر کی۔

1918ء: 19 اپریل کو بیگم رتی سے شادی کی۔ یہ پارسی نوجوان خاتون تھیں جنہوں نے شادی سے ایک دن قبل اسلام قبول کیا تھا۔ 10 جون کو بمبئی وار کانفرنس میں بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن سے تکرار کی۔ 17 جون کو ولنگڈن کی کارروائیوں اور ہوم رول لیگ کے اراکین کی مبینہ توہین کے خلاف احتجاج کیا اور ولنگڈن کے اعزاز میں جو الوداعی پارٹی دی جانے والی تھی اس کو روکا۔ مسٹر اور مسز جناح اس مظاہرے میں پولیس کی زیادتیوں کا نشانہ بنے۔ 11 دسمبر کو انہوں نے بمبئی کی تاریخ میں "ریڈ لیٹر ڈے" مبارک و مسعود دن قرار دیا۔ ان خدمات کے اعتراف میں جو باشندگان برعظیم کی سربلندی کے سلسلے میں انہوں نے انجام دیں بمبئی میں "جناح پبلک ہال" تعمیر کیا گیا۔ انہوں نے مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم پر تنقید کی۔ وزیر ہند' ہندوستان

آیااور وائسرائے کے ساتھ مسٹر جناح سے ملاقات کی۔

1919ء: رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے امپیریل کونسل سے 28 مارچ کو استعفیٰ دیدیا اور اس ایکٹ کو" قانون سیاہ" کا نام دیا۔ 15 اگست کو ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے دینار کھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس امر تسر منعقدہ 29 دسمبر میں شرکت کی۔ وہ اس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

1920ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے غیر معمولی اجلاس کلکتہ کی 7 ستمبر کو صدارت کی۔ جو "بینر" ان کے پہلو میں آویزاں تھے' ان پر یہ مرقوم تھا:

(الف) اپنے دین سے صداقت برتو۔

(ب) آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔

یہی سال ہے جس میں انہوں نے آل انڈیا کانگریس کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہا۔

1923ء: نومبر میں بلا مقابلہ مرکزی اسمبلی کی ممبر شپ کیلئے منتخب ہوئے۔

1924ء: 25 مئی کو معیاد صدارت ختم ہونے پر وہ مزید تین سال کیلئے مسلم لیگ پارٹی کے صدر منتخب کیے گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں اپنا خطبہ صدارت دیا۔

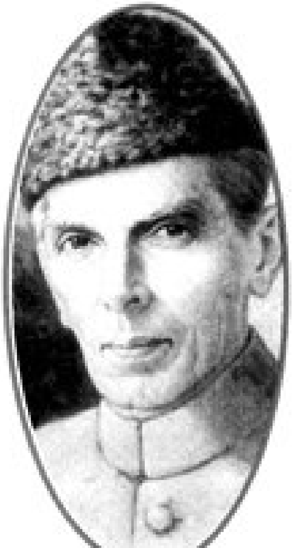

1925ء: مسلم لیگ کے اجلاس علی گڑھ میں پارٹی کے صدر کی حیثیت سے 30-31 دسمبر کو شریک ہوئے۔

1926ء: نومبر میں مرکزی اسمبلی کی ممبر شپ کیلئے بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔

1928ء: مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ سے یکم جنوری کو خطاب کیا اور اعلان کیا کہ "برطانوی حکومت کے خلاف یہ دستوری اعلان جنگ ہے کیونکہ مسلمانوں کیلئے مساوی حصہ داری سے انکار کیا گیا ہے۔ جلیانوالہ باغ جسمانی قصابی تھی اور سائمن کمیشن ہماری روح کو ذبح کرنے کی تدبیر ہے۔ ہم مسلمانوں کے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔"

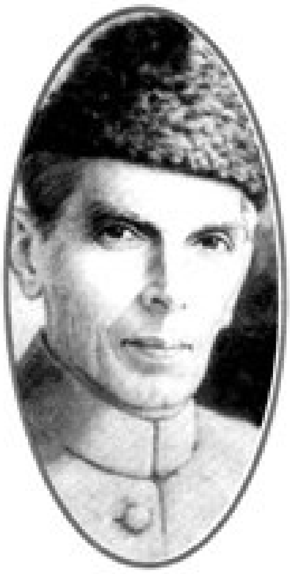

مسٹر محمد علی جناح اور ان کے قریبی رفیق مولانا محمد علی جوہر دونوں یورپ میں تھے۔ اس سال کے اواخر میں نہرو رپورٹ ان کو باہر ہی بھیجی گئی۔ ان کو ایک کاپی بحری جہاز پر ملی۔ دونوں نے نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی۔ قائد نے دسمبر میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں شرکت کی۔

1929ء: مارچ میں انہوں نے اپنے چودہ نکات مرتب کیے۔ یہ اکثریت سے مفاہمت کی ایک تجویز تھی۔ انہوں نے وزیراعظم انگلستان مسٹر ریمزے میک ڈونلڈ کو ایک خط لکھا اور گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔

1930ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے دوران، جس میں علامہ اقبال نے دسمبر میں "مسلم انڈیا وِدان انڈیا" کی تجویز پیش کی تھی، قائداعظم گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن جا چکے تھے اور وہ برعظیم کے معاملات سے اس قدر دلبرداشتہ ہو چکے تھے کہ لندن ہی میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ ایک خود اختیاری جلاوطنی تھی۔ انہوں نے لندن میں ایک گھر بھی خرید لیا اور پریوی کونسل میں بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس بھی شروع کر دی۔

1933ء: مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں جو نومبر میں ہوا، ایک گروپ نے جس کا مقصد مسٹر ایم اے جناح کی ملک میں واپسی اور متوقع موجودگی سے فائدہ اٹھانا تھا، ایک قرارداد منظور کی۔ لیگ دو گروپوں میں بٹ گئی تھی اسے یکجا کرنا تھا۔ اس مقصد کیلئے قائداعظم کو واپس ہندوستان لانے کا فیصلہ کیا گیا۔

☆......☆......☆

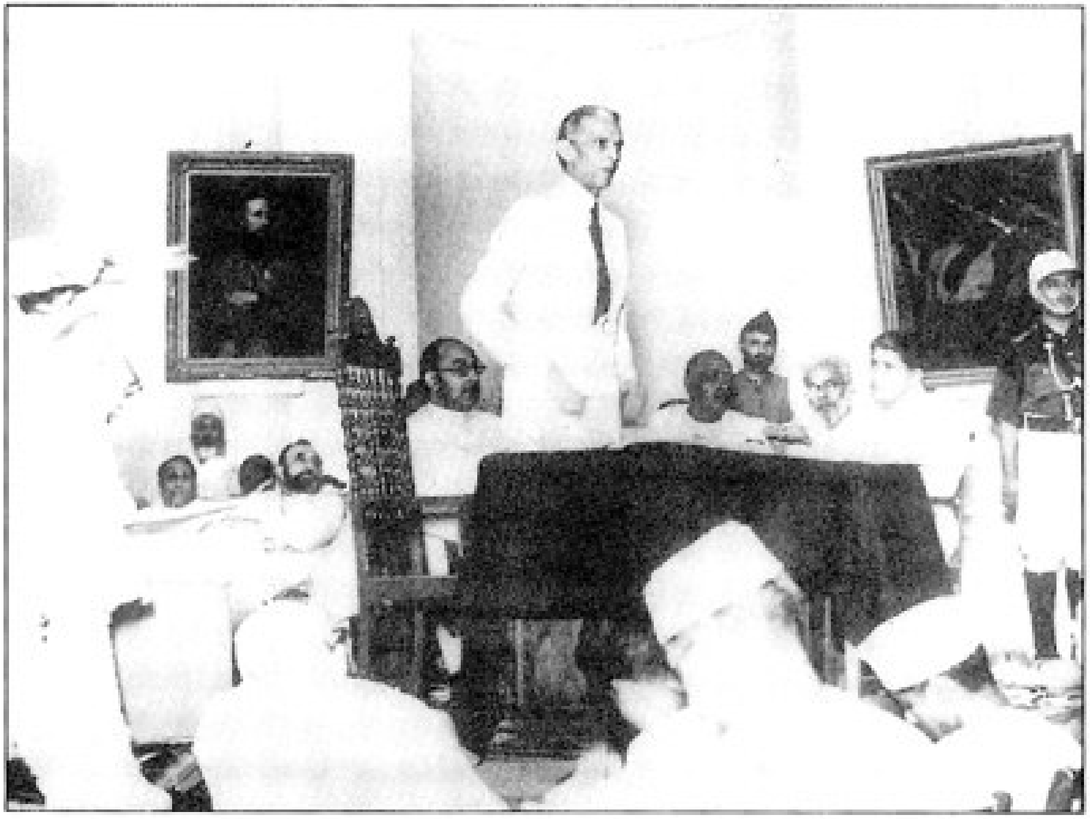

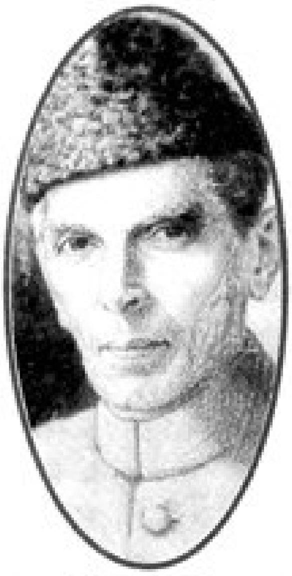

قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب فرمارہے ہیں'
تصویر میں لیاقت علی خان بھی نظر آرہے ہیں۔

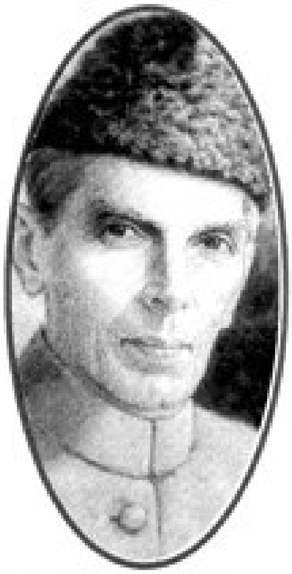

دولت گئی...... کچھ بھی نہ گیا

ہم آپ کی خدمت میں قائداعظم کی زندگی کا سن وار جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

سال ہے 1934ء: آل انڈیا مسلم لیگ کی صفوں میں جو رخنہ پیدا ہوا تھا وہ 4 مارچ کو دونوں دھڑوں کے مشترکہ اجلاس سے دور ہوا اور ایک قرارداد منظور کی گئی کہ اس تفرقے کو دور کیا جائے اور جناب محمد علی جناح کو متحدہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا جائے۔ ایک ہی ماہ کے اندر مسٹر جناح کی آمد پر ان کا بڑا پُرجوش استقبال ہوا اور انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کا کام شروع کیا۔

1936ء: آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں، اپریل میں ہوا اور مسجد شہید گنج لاہور کے سلسلے میں جو خدمات قائد نے انجام دی تھیں ان پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ برصغیر پر برطانوی آئین مسلط کرنے کے خلاف ایک احتجاجی قرارداد منظور کی گئی اور کہا گیا کہ 1935ء کا ایکٹ باشندگان برصغیر کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس اجلاس میں قائد نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کا نام پیش کیا اور لیاقت علی خاں تین سال کیلئے آل انڈیا مسلم لیگ کے اعزازی جنرل

سیکرٹری منتخب ہوئے۔

1937ء: مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں اکتوبر کے مہینے میں منعقد ہوا۔ قائد نے صدارت کی اور اپنے خُطبہ صدارت میں بہ آواز بلند کہا کہ "قوم کی حکومت، قوم پر مشتمل، قوم کی خاطر۔"

پھر کہا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ غور کرو مگر جب فیصلہ کر لو تو متحد ہو کر فردِواحد کی طرح مستعدی سے کھڑے ہو جاؤ اور قدم جمالو، صداقت اور وفاداری سے کام لو، تو میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ کامیابی تمہاری ہوگی۔"

1938ء: مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ قائد نے اپنے خُطبہ صدارت میں کہا: "مسلمانوں نے ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کے اندر کیسی طاقت اور کیسی قوت پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان صحیح طریقے سے منظم اور متحد ہو جائیں تو دنیا بھر کے سامنے ایک چٹان ثابت ہوں گے۔"

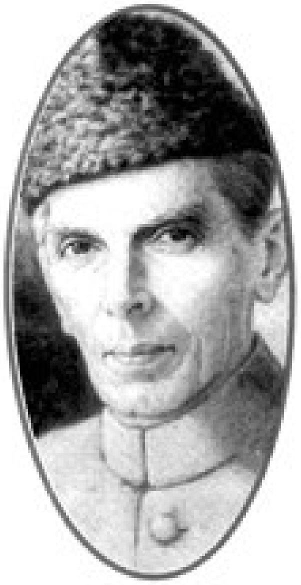

دسمبر کے مہینے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا اور یہیں سے بانی پاکستان قائداعظم کے نام سے مشہور ہوئے۔

اسی سال مسلمانانِ ہند کے دو عظیم رہنما ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا شوکت علی نے وفات پائی اور عالمی شہرت کی حامل شخصیت مصطفیٰ کمال اتاترک بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس اجلاس میں ان سب کی وفات پر تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔

1939ء: یوم عید پر قائد کی تقریر 13 نومبر کو نشر ہوئی، جس میں انہوں نے کہا کہ "یہ واقعہ ہے کہ قرآن پاک میں انسان کو خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے۔ یہ لقب ہم لوگوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ قرآن پاک کا اتباع کریں اور دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو سلوک اللہ تعالیٰ کا ساری انسانیت کے ساتھ ہے۔"

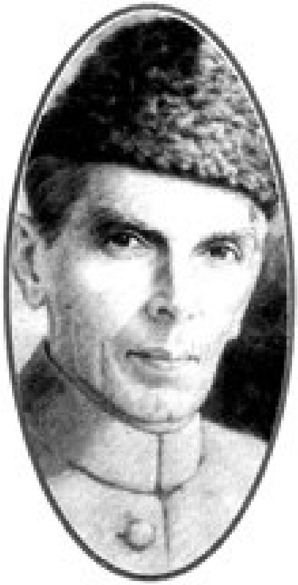

1940ء: مسلم لیگ کے مشہور اجلاس لاہور کی صدارت قائد نے مارچ میں کی اور وہاں قرارداد منظور ہوئی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ قائد نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا: ”ہم لوگ برطانوی حکومت سے اس کی ضمانت چاہتے ہیں کہ ہندوستانی فوجوں کو کسی مسلمان ملک میں یا مسلمان طاقت کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا اور یہ ضمانت حکومت کو دینی پڑے گی۔“

25 دسمبر 1940ء کو قائد کی 64 ویں سالگرہ مسلم لیگ نے سرکاری طور پر کراچی میں منائی اور ایک سووینیئر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ ”اسلام توقع رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اپنا فرض ادا کرے گا۔“

1941ء: 2مارچ کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس خصوصی کی صدارت کی اور وہاں یہ ہدایت کی کہ ہمارا نعرہ اور نشان اور فکری و ذہنی اصول یہ ہونا چاہیے:

دولت گئی.......... کچھ بھی نہ گیا۔

حوصلہ گیا.......... بہت کچھ گیا۔

عزت گئی.......... بیش قیمت چیز گئی۔

روح گئی ایمان گیا.......... ہر چیز چلی گئی، سب کچھ رخصت ہو گیا۔

1942ء: الہ آباد میں اجلاس ہوا اور قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا: ”اب ہمیں بولنا کم ہے اور کرنا زیادہ ہے۔“

انہوں نے برطانوی حکومت کی تجاویز پر تفصیل سے گفتگو کی۔ شرکاء نے ایک قرارداد کے ذریعے مذاکرات کے اختیارات کلی طور پر قائداعظم کو سونپ دیئے۔ اس اجلاس میں بجز ایک شخصیت مولانا حسرت موہانی کے، سب نے بالاتفاق اس قرارداد کی حمایت کی۔ صرف مولانا نے اس سے اختلاف کیا تو اجلاس کے کچھ شرکاء نے ”بیٹھ جایئے، بیٹھ جایئے“ کا شور مچا

دیا۔ قائداعظم نے مجمع کو خاموش کیا اور کہا کہ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ اظہار ہر شخص کا پیدائشی حق ہے' آپ مولانا کو اس حق سے نہیں روک سکتے' ان کو موقع دیجئے کہ اپنا خیال پیش کریں۔"

1942ء: اسی سال اکتوبر میں قائد نے ساری قوم کو پیغام عید دیا' جس میں کہا گیا کہ یہ عالمگیر جنگ مسلمانوں کی سرزمینوں پر' دوسرے میدانوں کے مقابلے میں کچھ کم نہیں۔ مسلم ممالک اور سرزمینیں بھی میدان جنگ بنی ہوئی ہیں بلکہ سیاسی اور فوجی اعتبار سے نہایت اہم مقامات اور مراکز مسلم ممالک ہی میں ہیں۔ ہمیں آزادی چاہئے تاکہ اپنے فیصلے خود کرسکیں اور دوسرے اپنے فیصلے ہم پر ٹھونس نہ سکیں۔"

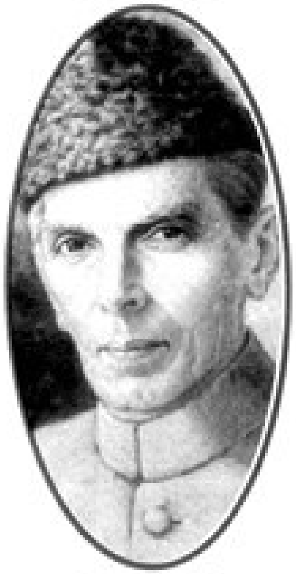

☆......☆......☆

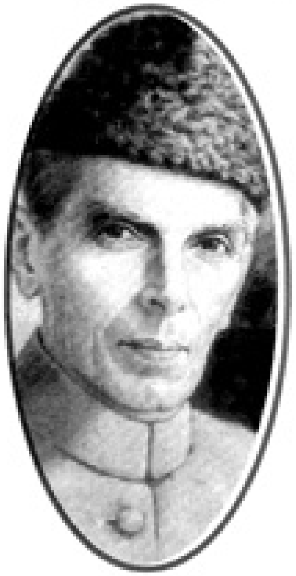

مسلم لیگ کا آخری اجلاس

قائداعظم کی زندگی کے حالات کا سن وار جائزہ جاری ہے۔

سال ہے 1943ء۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ کا آخری اجلاس کراچی میں ہوا مگر اس سے پہلے ایک اجلاس اور سالانہ اجلاس دہلی میں اپریل کے مہینے میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ برطانوی ہند کی حکومت میں آخری اجلاس تھا۔

قائد نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا: "مسلم اقلیت کے صوبوں کو فراموش نہ کرنا۔ یہی لوگ ہیں کہ جب مسلم اکثریت کے صوبوں میں اندھیرا تھا' تو انہوں نے سارے برصغیر میں روشنی بکھیری' اجالا پھیلایا۔ اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں نے بڑی تکلیفیں جھیلی ہیں' مصیبتیں اٹھائی ہیں اور آج بھی تمام نتائج کا سامنا کرنے کیلئے آمادہ و کمربستہ ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے پچھتر ملین (سات کروڑ) بھائیوں کو جو شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں آباد ہیں' آزاد کرانے میں کامیاب ہوگئے تو اس میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا بڑا اہم رول ہوگا۔"

اسی سال 26 جولائی کو قائداعظم نے ایک قاتل کا مقابلہ کیا اور اسے گرفتار کروادیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری سالانہ اجلاس دسمبر کے مہینے میں کراچی میں منعقد ہوا' جس کے بعد پھر کوئی سالانہ اجلاس نہ ہوا۔ اتفاق سے مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس بھی 1907ء میں شہر کراچی میں ہوا تھا۔ قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا: "جس طرح ہم لوگوں نے سات سال کے اندر (1936ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد سے اب تک) تصورات و مقاصد کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات کی وحدت پیدا کی ہے۔ اسی طرح اپنے پروگرام کے ہر مرحلے میں ہمیں مکمل وحدت عمل قائم کرنی ہے۔ اسی اجلاس کے بعد انہوں نے ایک مجلس عمل مقرر کی۔ اجلاس کی اختتامی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ہماری عظیم الشان کتاب "قرآن مجید" ہے' جو مسلم انڈیا کے سفینے کا لنگر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھتے جائیں گے' ویسے ویسے یہ وحدت اور زیادہ بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا' ایک کتاب' ایک رسول مقبول ﷺ' ایک قبلہ اور ایک ملت۔

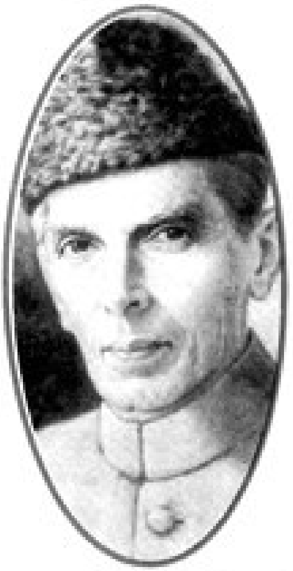

اگر ہم نے ان ستونوں پر آزاد ریاست کی بنیاد رکھی تو کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکے گا اور ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ کانگریس نے برطانوی حکومت کے خلاف "انڈیا چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی تھی۔ قائداعظم نے اس نعرے کا جواب یہ دیا کہ "برطانیہ عظمیٰ کیلئے ایمانداری کا واحد راستہ یہ ہے کہ برصغیر کو تقسیم کرے اور یہاں سے رخصت ہو جائے۔"

1944ء: میں گاندھی' جناح گفت و شنید ہوئی۔ قرارداد پاکستان کی جو مستند تعبیر قائداعظم نے پیش کی' وہ گاندھی' جناح خط و کتابت میں ابھر کر سامنے آئی۔ قائداعظم نے 8 نومبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو ایک انٹرویو دیا اور پاکستان کی جغرافیائی' سیاسی اور معاشی پوزیشن کی تشریح کی۔

1945ء: مرکزی اور صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات ہوئے اور یہ انتخابات پاکستان کے مسئلے پر کرائے گئے۔ مسلم لیگ نے مرکز میں تمام مسلم نشستیں حاصل کر لیں اور صوبوں میں غالب ترین اکثریت حاصل کی۔

اسی سال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کا اعلان ہوا۔ وائسرائے اور کانگریس دونوں میں سے کسی نے بھی مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو نہ مانا کہ تمام مسلمان ممبروں کی نامزدگیوں کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ لیکن قائد ثابت قدم رہے کہ مسلمانوں کے کوٹے کی نامزدگی صرف مسلم لیگ کے ذریعے ہونی چاہئے۔

1946ء: اپریل کے مہینے میں آل انڈیا مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن اینگلو عربک کالج دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے تمام مسلم اراکین کا اجتماعی اجلاس تھا۔ یہ تاریخی کنونشن عملاً مسلم انڈیا کی پارلیمنٹ کا اجلاس سمجھا جاتا ہے، جو آگے چل کر آزادی کی شکل میں پاکستان کی مجلس قانون ساز کی شکل اختیار کر گیا۔

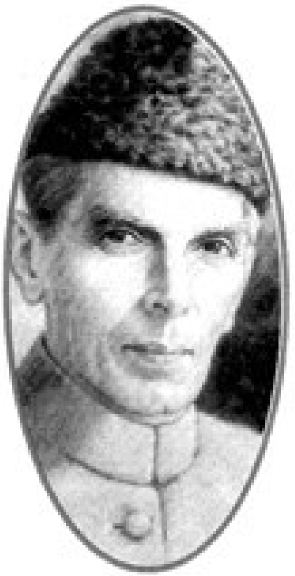

29 جولائی کو مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کی تیاری کا فیصلہ کیا۔ وائسرائے نے 24 اگست کو عارضی حکومت کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور 2 ستمبر کو کانگریس کو تمام عہدوں پر بٹھا دیا۔ مسلم انڈیا نے "یوم سیاہ" منایا۔

ستمبر میں قائداعظم اور وائسرائے ہند لارڈ ویول کی گفت و شنید ہوئی۔ 25 اکتوبر کو مسلم لیگ عارضی حکومت میں شریک ہو گئی۔ قائداعظم نے قانون ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ پھر قائداعظم، لیاقت علی خان کے ساتھ 3 دسمبر کو لندن روانہ ہوئے۔

لندن سے واپسی پر قائداعظم نے مصر میں قیام کیا۔ مفتی اعظم فلسطین سید محمد امین الحسینی سے ملاقات کی اور دوسرے عرب رہنماؤں سے ملے۔

اسی سال پنجاب میں خضر حیات خان کی حکومت نے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈز کو غیر قانونی تنظیم قرار دیا مگر مسلم لیگ کے احتجاجی جوش و خروش نے خضر حیات خان کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر آئے اور قائداعظم اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔

☆......☆......☆

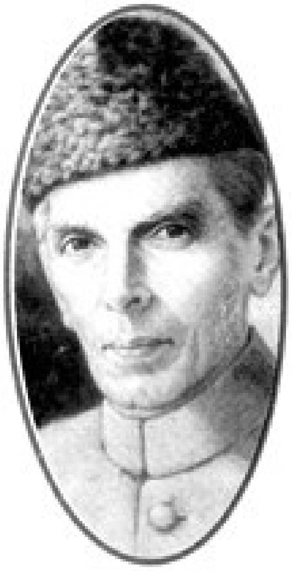

راستے جدا ہو گئے ' قائداعظم آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اعلان کر رہے ہیں کہ
پاکستان 14 اگست 1947ء میں معرض وجود میں آجائے گا۔

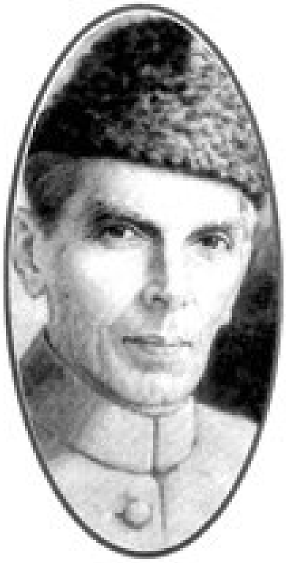

آزادی کے بعد پہلا پیغام

قائد اعظم کی داستان حیات سے سن وار جائزے کی آخری قسط حاضر ہے۔

سن آتا ہے 1947ء 3 جون کو قائد نے تقسیم کے منصوبے پر اپنا پیغام نشر کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ قائد اعظم اس اجلاس میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں نے "شہنشاہ پاکستان" کا نعرہ لگا کر ان کا استقبال کیا۔ قائد نے سختی سے اس نعرے کی مخالفت کی اور مسلم لیگ کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ آئندہ اس لفظ کو پھر زبان پر نہ لانا، پھر بڑے فخر سے کہا:

"میں پاکستان کا سپاہی ہوں، شہنشاہ نہیں۔ یہ جمہوریت ہوگی بادشاہت نہیں۔"

اسی سال 19 جون کو کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت قرار دادینے کا فیصلہ کیا گیا۔

4 جولائی کو برٹش گورنمنٹ نے انڈین انڈی پینڈنٹ ایکٹ پاس کیا۔ قائد اعظم اپنی بہن مس فاطمہ جناح کے ساتھ 7 اگست کو کراچی پہنچے۔ 11 اگست کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ حصول آزادی کے بعد عید کا اولین پیغام 18 اگست کو نشر کیا۔ لاہور گئے

اور ہندوستان کے علاقوں سے ظلم وستم کا نشانہ بن کر جو مہاجرین پاکستان کی سرزمین میں درد ناک صورتحال کے ساتھ داخل ہو رہے تھے' انہیں دیکھا۔ 30 اکتوبر کو لاہور کے جلسۂ عام میں تقریر کی اور سب کا حوصلہ بڑھایا۔

30 دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے آخری اجلاس میں شرکت کی۔

1948ء: گورنر جنرل کی حیثیت سے بحریہ کے جہاز ایچ ایم پی ایس دلاور کے قیام پر 23 جنوری کو خطاب کیا اور کہا کہ "ادارہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں جو اصول درج ہیں' میں ان کی مکمل حمایت کرتا ہوں' لیکن ہم لوگ اپنی دفاعی تنظیم اور حصول قوت کی طرف سے آنکھ بند نہیں کر سکتے۔ ہمارے اپنے ملک پاکستان کے دفاع کی اولین ذمہ داری ہماری اپنی ہے۔

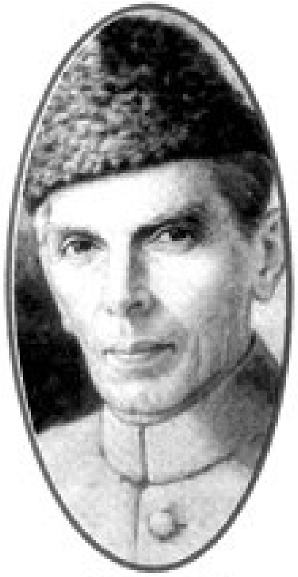

قائداعظم نے 14 فروری 1948ء کو سبی دربار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات ان سنہری اصولوں پر عملدرآمد میں ہے جو عظیم المرتبت مقنن اعظم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائے ہیں۔ آیئے ہم لوگ اپنی جمہوریت کی بنیاد اسلام کے سچے تصورات پر استوار کریں۔ خداوند مطلق نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ امارت وحکومت کے بارے میں اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔"

19 فروری کو ایک نشری تقریر کے ذریعے قائد نے باشندگان آسٹریلیا کو مخاطب کیا۔

"لیکن آپ لوگ ہمارے بارے میں کسی غلطی میں نہ پڑنا۔ پاکستان کوئی تھیوکریسی (پاپائیت) نہیں' نہ اس قسم کی کوئی اور چیز۔"

قائداعظم نے 21 فروری کو ملیر کراچی میں فوجی رجمنٹ کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے تلقین کی: "اب تم لوگوں کو اس امر کی نگرانی کرنی ہے کہ اسلامی جمہوریت (اسلامک ڈیموکریسی) اسلامی عدل اجتماعی (اسلامک سوشل جسٹس) اور ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین برابری اور مساوات کی ترقی' آپ کی اپنی سرزمین کے اندر پھلے

پھولے۔ تبھی قیام پاکستان کا مقصد پورا ہو سکے گا۔"

21 مارچ کو قائداعظم نے ڈھاکہ کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "تمہارے دشمن جب قیام پاکستان کی مہم کو روکنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اس نامرادی سے بدحواس ہو کر اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کر دی ہے کہ خود مملکت پاکستان کو درہم برہم کریں اور مسلمانان پاکستان کے اندر تفرقہ اندازیاں کریں اور ان کو آپس میں لڑائیں۔"

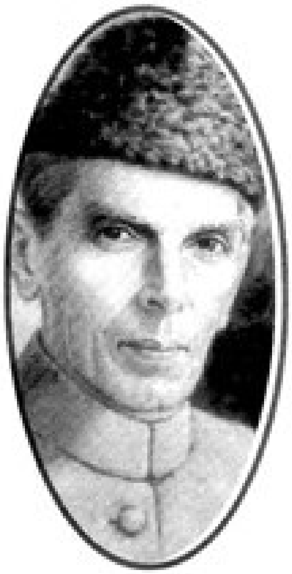

یکم جولائی کو کراچی میں قائداعظم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کیا اور فرمایا: "ہمیں اپنی تقدیر سازی کا کام خود اپنے نظام اور اپنے سسٹم کی بنیاد پر انجام دینا ہے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی و اقتصادی نظام پیش کرنا ہے جو مساوات انسانی اور عدل اجتماعی کے صحیح اور سچے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔"

7:1948 اگست کو عیدالفطر کے موقع پر قائداعظم نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک آخری پیغام دیا اور اس میں فرمایا کہ "میری آخری تمنا یہ ہے کہ عالم اسلام کا ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔"

14:1948 اگست کو پاکستان کے پہلے یوم آزادی کے موقع پر قائداعظم نے قوم کو آخری پیغام دیا۔ اس کے بعد وہ زیارت سے کراچی واپس تشریف لائے جو ان کی سرزمین پیدائش ہے اور یہیں آکر انہوں نے 11 ستمبر کو آخری سانس لی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

تمت بالخیر